جُرم نشان چھوڑتا ہے!

سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس جناب احمد خان چدھڑ کے قلم سے جنہوں نے اپنی
چالیس سالہ ملازمت کے دوران انتہائی پیچیدہ اور اندھے جرائم کی تفتیش اور سُراغ
رسانی میں اہم کردار ادا کیا جس کیلئے انہیں اپنے والد کی جان کی قربانی بھی دینا پڑی۔

احمد خان چدھڑ

(ریٹائرڈ ایس ایس پی)



کچھ احمد خان چدھڑ کے بارے میں

احمد خان چدھڑ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ پنجاب پولیس کی فعالیت اور استعداد کار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے اور اس کے بارے میں عمومی تاثر کو بہتر بنانے میں اُن کی پیشہ ورانہ مہارت اور شب و روز کی محنت کا بہت اہم کردار ہے۔ ایک تفتیشی افسر کی حیثیت سے انہوں نے انتہائی پیچیدہ اور مشکل عقدوں کا حل نکالا اور بے شمار ''اندھے مقدمات''، جن میں بظاہر کوئی شہادت نہ تھی، کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

احمد خان چدھڑ کی یہ کتاب صرف ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ان کی ملازمت کے دوران ہونے والے بہت سے مقدمات اور ان کی سائنسی و منطقی انداز میں تفتیش کی مکمل کہانی بھی ہے۔ ہر قدم پر اور ہر مقام پر ان باریک اور بظاہر غیر اہم عناصر اور امور کی نشاندہی بھی ہے جن پر توجہ مرکوز کر کے ایک پولیس افسر کی حیثیت سے انہوں نے مختلف پیچیدہ اور بظاہر لاینحل مقدمات کی کامیابی سے سراغ رسانی کر کے نہ صرف اصل ملزموں کا پتہ لگایا بلکہ ان کو ان کے منطقی انجام تک بھی پہنچایا۔ ایک ایک تفصیل کو انہوں نے بڑے آسان اور

جرم نشان چھوڑتا ہے!

احمد خان چدھڑ کے قلم سے

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر : مسز ریاض اے۔ شیخ (ایڈووکیٹ)

قیمت : -/500روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

تقسیم کنندہ : سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک ۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار ۔فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ ۔ فون: 0300-3012131

ESTD. 1923
JAHANGIR BOOK DEPOT

جہانگیر بکس

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

فہرست

حصہ دوم

حصّہ سوم

پیش لفظ

جرائم کے محرکات زر، زن، زمین ہی فسادِ آدمیت ٹھہرے۔ حرف ''ز'' جرائم کے تمام محرکات میں استعمال ہوتا ہے۔ دُنیا میں مختلف مفکرین نے قانون وسزا کے مختلف نظریات پیش کئے جن میں تادیبی نظریہ ءسزا اور اصلاحی نظریہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سخت سے سخت سزائیں دینے کا نظریہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور اصلاحی نظریہ نے بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی۔ لیکن اسلام وہ آفاقی مذہب ہے جس نے جرائم کو ختم کرنے کے لیے جرائم کے محرکات ختم کرنے کا حکم دیا۔ انصاف کے حصول کے لیے سچی گواہیوں کی حفاظت، امانت میں خیانت نہ کرنا، وعدہ ایفائی، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنا، دوسروں کے حقوق غصب نہ کرنا اور اپنے مال وزر سے محتاجوں، مساکین، مظلوم مستحقین کی مدد کرنا اور عدل وانصاف سے ہی جرائم کی بیخ کنی ہوتی ہے اور حصولِ انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور انسان ایک کامل نمونہ بن کر خلیفۃ الارض اور اشرف المخلوقات ہونے کا صحیح طور پر مستحق بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اسی وجہ سے تمام مخلوق پر علم کے لحاظ سے انسان کو فوقیت دی ہے۔

قتل اور لڑائی جیسے سنگین جرائم میں قیام پاکستان پر 1958ء کے بعد دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا سب سے بڑا محرک بنیادی جمہوریت کے الیکشن تھے جن کی وجہ سے مختلف خاندانوں کی آپس میں گھر گھر دشمنی پیدا ہوگئی اور نوبت قتل وغارت تک پہنچ گئی جس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔ ہمارے ملک کے دیہی علاقوں کے پنچایتی نظام پر بھی اس کا بہت بُرا اثر پڑا اور یہ نظام بالکل تباہ وبرباد ہوکر رہ گیا۔ ساٹھ فیصد مسائل جو پنچایت کے ذریعہ مقامی طور پر حل ہوجاتے تھے وہ آہستہ آہستہ حکومت پر بوجھ بنتے گئے اور سرکاری اہلکاروں کی ذمہ داریوں میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جن سے لوگوں کے مسائل حل ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتے چلے گئے اور صورت حال گھمبیر ہوگئی۔

میں نے اپنی کتاب ''جرم نشان چھوڑتا ہے'' میں جرائم کی تفتیش، تحقیقات اور سراغ رسانی میں ایک حقیر اور ادنیٰ سی کاوش کی ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں: حصہ اول میں، میں نے اپنی زندگی کے کچھ حالات تحریر کیے ہیں جن میں ابتدائی تعلیم، ملازمت پولیس کے آغاز سے ریٹائرمنٹ تک مختلف مقامات پر اپنی تعیناتی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس افسران اور مختلف طبقہ کے لوگوں کے پیشہ کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے جن کا معاشرہ میں ایک اہم رول ہے۔

حصہ دوم میں جرائم کے حوالہ سے سنسنی خیز اور اہم مقدمات کی تفتیشوں کا ذکر ہے جو ملازمت کے دوران میرے ذاتی مشاہدہ سے گزریں۔ حصہ سوئم میں چند ''یادوں کی جھلکیاں'' بھی پیش کی گئی ہیں۔

میں نے اس کتاب میں اپنے مشاہدات، تفتیش و تجربات کو صفحہ قرطاس پر اس انداز میں لانے کی کوشش کی ہے کہ قاری حضرات کے لیے اس کا مطالعہ نہ صرف دلچسپی کا سبب بنے بلکہ وہ اس سے استفادہ بھی کر سکیں۔ خاص طور پر پولیس افسران کے لیے عملی زندگی میں مددگار ثابت ہو۔ سہواً کسی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ قاری حضرات نشاندہی فرما دیں تو ممنون ہوں گا۔

احمد خان چدھڑ
(ریٹائرڈ) ایس ایس پی

حصّہ اول

- حالات زندگی
- پاکستان، جرائم اور نئی نسل
- پولیس افسران
- علمائے کرام
- سیاستدان
- صحافی اور دانشور
- وکلاء
- عدلیہ
- والدین
- نوجوان طلبا
- اساتذہ

حالات زندگی

ولادت

ولادت کے زمانہ میں تعلیمی فقدان، ناخواندگی اور لاعلمی کی وجہ سے اپنی تولیدگی کی حتمی تاریخ کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ تاہم میری والدہ کے بیان کے مطابق میری ولادت ماہ رمضان المبارک کے اکیسویں روزے عصر کے وقت ہوئی جب کہ وہ روزہ سے تھیں۔ تعلیمی سرٹیفکیٹ کے مطابق 13 اکتوبر 1940ء میرا یوم ولادت ہے۔

میرے خاندان کا تعلق چھوٹے سے زمیندار گھرانے سے ہے جو کاشتکاری پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی سے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ میرے والد صاحب بھی اسی نسبت سے کاشتکار تھے۔ قرآن پاک پڑھے ہوئے تھے۔ تھوڑی بہت اُردو پڑھ سکتے تھے لیکن لکھ نہیں سکتے تھے۔ ھندی ٹاکرے کا کچھ علم انہوں نے سیکھ لیا تھا اور اس کے ذریعہ اپنا حساب کتاب لکھ لیتے تھے۔ وہ انتہائی ذہین، راست گو، متوکل اور دلیر انسان تھے۔ میری والدہ کا تعلق بھی ایک شریف کاشتکار گھرانے سے ہے۔ دونوں خاندان ان پڑھ تھے۔ صرف میرے ایک ماموں محمد زاہد جن کا انتقال ہو چکا ہے، انہوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بھی دوسرے گاؤں میں کیونکہ ہمارے گاؤں میں اس زمانے میں کوئی سکول نہیں تھا۔

آغازِ تعلیم

میری پیدائش کے بعد ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول بنا جس میں میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ مختلف اوقات میں پرائمری تک تعلیم استاد محمد افضل بلوچ ساکن چھتا پختہ، رائے محمد علی بھٹی اور استاد غلام حسین سے حاصل کی۔ رائے محمد علی بھٹی کا تعلق ہمارے گاؤں سے تھا جو انتہائی شریف

انسان تھے اور استاد غلام حسین کا تعلق موضع تیتری لغاری سے تھا۔ لیکن وہ ملازمت کے سلسلہ میں ہمارے گاؤں آ گئے تھے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ استاد غلام حسین نے پرائمری تک تعلیم مکمل کرائی۔ اس وقت پرائمری کلاس 4 جماعت تک ہوتی تھی۔ استاد غلام حسین ایک سخت گیر اور بااصول شخصیت کے مالک تھے۔ وہ انتہائی محنت اور لگن سے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔ تادم تحریر وہ زندہ ہیں۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو آداب شاگردی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے اور ان سے اسی طرح خوف آتا ہے جس طرح زمانہ ابتداء میں ان سے خوف آتا تھا۔

ہمارا گاؤں چک نمبر 152 شمالی تحصیل سرگودھا کے تھانہ سلانوالی کی حدود میں تھا۔ اب علیحدہ تھانہ شاہ نکڈر بن چکا ہے اور سلانوالی علیحدہ تحصیل بن چکی ہے۔ سرگودھا سے جھنگ بذریعہ گاڑی جاتے ہوئے سوبھاگہ ریلوے اسٹیشن سے دو کوس یا تین میل یا ساڑھے چار کلومیٹر کے فاصلہ پر جانب غرب ہے۔ راجباہ نورنگ جو کہ سلانوالی کے قریب لوئر جہلم نہر سے نکلتا ہے ہمارے گاؤں کے ساتھ سے گزرتا ہے اور چک قریشی تک علاقہ کو سیراب کرتا ہے۔

ہمارے گاؤں کا پرانا نام کوٹ قاضی ہے۔ کوٹ قاضی ضلع گوجرانوالہ میں بھی ایک گاؤں ہے۔ وہاں کی قاضی فیملی ہمارے گاؤں میں آباد تھی۔ چک بندی اور بندوبست اراضی ہوا تو کوٹ قاضی کا نام چک نمبر 152 شمالی میں تبدیل ہوا۔ غالباً 1905ء میں نہری نظام چالو ہوا تو ہماری برادری اس گاؤں میں آباد ہوئی۔ اس سے پہلے ہمارے بزرگ دادا موضع لالووالی تھانہ بھاگٹانوالہ اور نانکے موضع بھتھنی تحصیل بھلوال میں آباد تھے۔ ہمارے ایک بزرگ چوہدری لکھو سب سے پہلے اس چک میں آباد ہوئے۔ پھر وہ اپنی برادری کو اس گاؤں میں لائے۔ ہمارے دادا موضع لالووالی سے چک نمبر 54 جنوبی نزد بنگلہ کانڈی والا آ کر آباد ہو گئے۔

میری والدہ کے وٹہ میں میری پھوپھی خاتون بی بی کی شادی چک نمبر 152 شمالی چوہدری فضل چدھڑ سے ہوئی۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چوہدری فضل بقضائے الٰہی انتقال کر گئے۔ میری پھوپھی بیوہ ہو کر اکیلی تھیں جنہوں نے میرے والد صاحب کو کہا کہ وہ ان کے پاس آ جائیں۔ چنانچہ میرے والد صاحب بمعہ فیملی چک نمبر 54 جنوبی سے چک نمبر 152 شمالی منتقل ہو گئے اور اپنی ہمشیرہ کے پاس رہ کر ان کی زمین کی کاشت شروع کر دی۔ بعد میں میرے ماموؤں نے اپنے چچا کی وراثت جو کہ تقریباً 12 ایکڑ تھی سے حصہ مانگنا شروع کر دیا اور عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کر دیا۔ کئی سال تک دعویٰ دیوانی چلتا رہا۔ میری پھوپھی خاتون بی بی بھی انتقال کر گئیں۔

میں محکمہ پولیس میں بھرتی ہو کر سب انسپکٹر کے عہدہ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے برادری کا اکٹھ کر کے باہمی سمجھوتہ کے ساتھ چوہدری فضل مرحوم کی وراثتی اراضی کی تقسیم کرا دی۔ دونوں فریقوں نے عدالت دیوانی میں بیان دے کر راضی نامہ کر لیا۔

جب میرے دادا موضع لالو والی سے چک نمبر 54 جنوبی منتقل ہوئے تو میرے دادا کے بیان کے مطابق جب اراضی کی الاٹمنٹ ہو رہی تھی تو انگریز افسر آبادی رڑکن صاحب (غالباً ان کا اصل نام کرزن تھا، ہمارے بزرگ اسے رڑکن کہتے تھے) نے بنگلہ کانڈی والہ پر اپنا دورہ رکھا۔ دورے پر میرے دادا اور ان کے چچا زاد بھائی چوہدری سجادہ حاضر ہوئے۔ میرے دادا نے افسر آبادی کو کہا کہ اس کے بیٹے زیادہ ہیں لہٰذا زیادہ رقبہ دیا جائے۔ میرے دادا کے بار بار اصرار پر انگریز افسر آبادی ناراض ہو گیا۔ اس نے غصے میں آ کر سامنے میز پر پڑے ہوئے وٹہ (ویٹ پیپر) کو اٹھایا اور دادا کی طرف پھینکا۔ قصہ مختصراً اس نے زمین دینے سے انکار کر دیا اور ان کے چچا زاد بھائی چوہدری سجادہ کو چک نمبر 152 شمالی میں 140 ایکڑ اراضی الاٹ کر دی۔

چک نمبر 152 شمالی آباد ہونے کے بعد آدھے چک کی نمبرداری ملک طوراخان اعوان کے پاس تھی اور آدھے چک کی نمبرداری چوہدری لکھو کے پوتے چوہدری غلام محمد نمبردار کے پاس تھی جو اب چوہدری غلام محمد کے فوت ہونے کے بعد ان کا بڑا بیٹا چوہدری محمد حسین نمبردار ہے۔ ملک طوراخان اعوان نمبردار جس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، انتقال کے بعد اس کی بیوہ اور بیٹیوں نے 1961ء میں اپنی ملکیتی اراضی فروخت کر دی جو میرے والد اور چچگان جو کہ چک نمبر 54 جنوبی میں آباد تھے نے موضع لالو والی کی زمین فروخت کر کے ملک طوراخان اعوان نمبردار والی زمین خرید کر لی۔ اور اسی طرح سے سارا خاندان چک نمبر 54 جنوبی سے منتقل ہو کر چک نمبر 152 شمالی میں آ کر آباد ہو گیا۔

تو میں اپنی ابتدائی تعلیم کی بات کر رہا تھا۔ پرائمری تک اپنے گاؤں میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن میں اپنے گاؤں کے ساتھ ایک گراؤنڈ میں جہاں اب آبادی ہو گئی ہے مختلف قسم کی کھیلیں کھیلتے تھے۔ گھیر گھمنڈ (گیند کو گڑھے میں پھینکنا) لمی لمان (ہاکی طرز کا کھیل) چھوت چھپاتی دھودھہ، کبڈی، کھیڈ، پڑ کوڈی یہ ہماری دیہی علاقہ کی کھیلیں تھیں۔ بنٹے، اخروٹ اور کوڑیوں سے بھی کھیلتے تھے۔

پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا مسئلہ تھا۔ ہمارے گاؤں

سے پندرہ میل دور سلانوالی میں مڈل سکول تھا یا پھر سرگودھا شہر میں سکول تھے۔ میرے والد صاحب کا ایک دوست قاضی غلام فرید سول ہسپتال سرگودھا میں ڈسپنسر تھا۔ اس کا سرکاری کوارٹر ہسپتال کے قریب تھا۔ والد صاحب مجھے ان کے پاس چھوڑ آئے۔ میں نے انبالہ مسلم ہائی سکول میں پانچویں کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ساتویں کلاس تک یہاں پڑھا پھر مڈل سکول سلانوالی داخلہ لے لیا اور شیر محمد چوکھیا ساکن چک نمبر 130 شمالی کے پاس رہائش رکھ لی۔ یہ جگہ سکول سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھی۔ شیر محمد چوکھیا بڑا اچھا انسان تھا۔ اس کی والدہ صاحباں بی بی اور بیوی روشاں بی بی نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح گھر میں رکھا۔

1954ء میں سلانوالی مڈل سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد والد صاحب نے کہا کہ مالیہ کی پرچی دیکھنے کے قابل ہو گئے ہو مزید تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ کاشتکاری میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ جو کام والد صاحب میرے ذمے لگاتے میں بڑے شوق سے اس کام کو سرانجام دیتا ۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے والد صاحب کو کہا کہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے مجھے کہیں سکول میں داخل کرائیں۔ چنانچہ میں والد صاحب کی اجازت سے اپنی پھوپھی کے پاس چک نمبر 54 جنوبی چلا گیا۔ وہاں سے تقریباً 6 میل کے فاصلہ پر چک نمبر 34 جنوبی ہائی سکول تھا۔ وہاں نویں کلاس میں داخلہ لے لیا۔ میرے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کچھ عرصہ ایک گھوڑی پر سوار ہو کر سکول جاتا رہا۔ آمدورفت 12 میل سفر تھا۔ روزانہ گھوڑی پر آتے جاتے تھک جاتا پھر ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل لے لی۔ گرمی کے موسم میں سائیکل پر سفر مجھے پریشان کرتا کیونکہ کچی سڑکیں تھیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے اکثر سائیکل پنکچر ہو جاتی اور بڑی مشکل سے سفر مکمل کرتا۔ بعد میں کافی واقفیت ہو گئی۔ کبڈی کی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ ہائی سکول چک نمبر 34 جنوبی کی کبڈی ٹیم بڑی اچھی تھی۔ چوہدری بشیر احمد چک نمبر 36 جنوبی اور چوہدری نذیر احمد چک نمبر 33 جنوبی بڑے لائق محنتی ٹیچر تھے۔ ہیڈ ماسٹر ملک لال دین تھے جو وہ بھی بڑے تجربہ کار اور اعلیٰ منتظم تھے۔ 1956ء میں وہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے قریبی عزیز چوہدری شھابل خان کے ساتھ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لے لیا۔ چوہدری شھابل خان نے فروکہ سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا، ہم دونوں نے سید محمد حسین شاہ سب انسپکٹر پولیس جو ہمارے پڑوسی چک نمبر 153 شمالی کے رہائشی تھے اور ہمارے ساتھ ان کے خاندانی مراسم اچھے تھے، کے مکان واقع

بلاک نمبر 16 سرگودھا میں رہائش رکھ لی اور وہاں سے بذریعہ سائیکل کالج جانا شروع کر دیا۔ ایک دن کالج سے واپس آئے تو دیکھا کہ کمرہ سے میری نئی اچکن جو میں نے بڑے شوق سے سلوائی تھی، چوہدری شھابل خان کی جرسی، ٹائم پیس اور کچھ چیزیں غائب تھیں جو کوئی نامعلوم شخص کمرے کا گلی والے دروازے کا تالا توڑ کر چوری کر کے لے گیا۔ میں اور چوہدری شھابل خان دونوں تھانہ سٹی میں چوری کا پرچہ درج کروانے گئے۔ وہاں بڑی بڑی مونچھوں والا محرر تھانہ اپنی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس کا نام جلال خان تھا جو آج تک مجھے یاد ہے۔ محرر صاحب کو اپنی چوری کی داستان سنائی۔ محرر کا رویہ ہمارے ساتھ ایسا تھا کہ چوری کا پرچہ کروانا تو دور کی بات اپنی جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔ ہم پریشانی کے عالم میں واپس اپنے مکان پر آ گئے اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ" پڑھ کر معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔ پھر چوری کا پرچہ کراونے کا نام تک نہ لیا۔ اپنی تعلیم جاری رکھی۔ 1958ء میں F.A کا امتحان شروع ہوا۔ دوسرا پرچہ دے کر آیا تو مجھے سخت بخار ہو گیا۔ علاج کروایا لیکن امتحان کے دن بدستور بیمار رہا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور بیماری کی حالت میں تانگہ پر بیٹھ کر کالج جاتا اور پرچہ حل کرتا۔ امتحان ختم ہوگیا اس کے بعد بھی بیس دن بیمار رہا۔ پھر طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ امتحان میں پاس ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن جب نتیجہ آیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امتحان میں کامیاب تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ آئندہ تعلیم جاری رکھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ عرصہ والد صاحب کے ساتھ کاشتکاری میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ پھر نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ گاؤں کے رہائشی نوجوان کیلئے نوکری تلاش کرنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس وقت تو ویسے بھی ذرائع کم تھے۔ گاؤں میں نہ اخبار آتا تھا، نہ ہی ذرائع رسل و رسائل کوئی اچھے تھے۔ صرف دو ریل گاڑیاں سوبھا گہ ریلوے اسٹیشن پر چوبیس گھنٹے میں آتی تھیں۔ ویسے گاؤں کا ماحول کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ پڑھائی سے فارغ ہو کر وقت گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ صبح سے شام تک کئی لوگوں کے سوالات کا جواب دینا پڑتا ہے کہ "اتنا پڑھ کر فارغ پھر رہے ہو۔ کوئی نوکری تلاش کیوں نہیں کرتے؟" ایسے سوالات سن کر بندہ ویسے ہی پریشان ہو جاتا ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سن کر اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ میں ہر قسم کی چھوٹی موٹی نوکری کرنے کو ذہنی طور پر تیار تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی سوچ کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ جو کوئی کچھ پڑھ لے وہ لازمی سرکاری نوکری کرے۔

ایک دن ہمارے حلقہ کا پٹواری گاؤں میں آیا۔ اس نے بتلایا کہ A.V.C (اسسٹنٹ

ورنیکولر کلرک) کی اسامیوں کیلئے درخواستیں طلب کی گئیں ہیں۔ اگر A.V.C منتخب ہو جائیں تو تین چار سال کے بعد بطور ضلع دار ترقی مل جائے گی۔ میں نے اس اطلاع پر درخواست متعلقہ محکمہ کو دے دی۔ ایک ماہ کے بعد ٹیسٹ ہوا اور میں کامیاب ہو کر A.V.C منتخب ہو گیا۔

A.V.C منتخب ہونے کے بعد ایک پٹواری کے ساتھ Attach کر دیا گیا۔ تقریباً 6 ماہ پٹواری کے ساتھ کام کیا۔ زمین کی پیمائش اور فصلات کی گرداوری وغیرہ کا کام سیکھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس ملازمت کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ اور ساتھ ساتھ کسی دیگر ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ایک دن میں پولیس لائن سرگودھا کے پاس سے گزر رہا تھا۔ پولیس لائن میں شام کے وقت بگل بج رہا تھا۔ میں بگل کی آواز سنتے ہی کھڑا ہو گیا۔ بگل کی آواز سے اتنا متاثر ہوا کہ محکمہ پولیس میں بھرتی ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے دفتر پولیس سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ اے ایس آئی عہدہ کیلئے درخواستیں طلب کی جا رہی ہیں۔ میں نے بھی درخواست دے دی۔ ان دنوں ضلع سرگودھا، راولپنڈی رینج میں تھا۔ انٹرویو کیلئے راولپنڈی گیا۔ ملک عطا محمد نون راولپنڈی رینج کے ڈی آئی جی تھے جو پیر دیول شریف کے مرید تھے۔ میں نے کسی وساطت سے پیر دیول شریف سے رابطہ کر کے سفارش کروائی لیکن مجھے پتہ چلا کہ پیر صاحب اس سے پہلے پانچ لڑکوں کی سفارش کر چکے ہیں جب کہ اے ایس آئی کیلئے سیٹیں صرف دو تھیں۔ قصہ مختصر انٹرویو دیا۔ صرف دو لڑکے منتخب ہوئے میں مایوس واپس لوٹ آیا۔

محکمہ پولیس میں بطور کانسٹیبل بھرتی

کچھ دن گھر رہ کر میں سرگودھا گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ دفتر پولیس میں بھرتی ہو رہی ہے۔ لڑکوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ قد اور چھاتی کی پیمائش ہو رہی تھی۔ میں بھی لائن میں کھڑا ہو گیا۔ پیمائش میں قد اور چھاتی معیار کے مطابق پائی گئی۔ جن لڑکوں کے قد چھاتی پورے تھے ان کا انٹرویو ہوا۔ میں نے بھی انٹرویو دیا۔ کل بیس لڑکے بطور کانسٹیبل منتخب ہوئے جن میں ایک میں بھی تھا۔ تین دن کی چھٹی سب کو ملی۔ میں خوشی خوشی گاؤں آیا۔ تین دن چھٹی گزارنے کے بعد واپس آ گیا۔ چند دن پولیس لائن میں رہے۔ 686/C نمبر الاٹ ہوا اور وردی حاصل کی۔ اس کے بعد ہم سب کو ٹریننگ کیلئے والٹن ٹریننگ سکول لاہور بھیج دیا گیا۔ ٹریننگ شروع ہوئی۔ پہلی تنخواہ پینتیس (-/35) روپے حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے پرنسپل آغا رضا علی خان صاحب تھے جو انتہائی نیک اور

دیندار قسم کے انسان تھے۔ ہر جمعہ کو اپنے گھر قرآن خوانی کرواتے اور حلوہ کھلاتے۔ رنگروٹوں کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ ڈرل سٹاف کا رویہ ہمارے ساتھ سخت تھا، لیکن لاء سٹاف کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ پردیس اور ٹریننگ کی سختی کی وجہ سے کبھی کبھار جب پریشان ہو جاتا تو درج ذیل اشعار کا سہارا لیتا۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے
رنگ لاتی ہے حنا پتھر میں پس جانے کے بعد
سرخرو ہوتا ہے انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد

ان دونوں اشعار کا سہارا لے کر ہمت باندھ لیتا اور جذبے کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ ڈرل انسٹرکٹر نے ایک روز ریلوے اسٹیشن والٹن کے نزدیک ریلوے لائن کی پٹڑی کے ساتھ اتنے بے رحم طریقہ سے کرالنگ کروائی جو آج تک نہیں بھول سکا۔ علی الصبح پی ٹی کیلئے تیار ہو کر گراؤنڈ میں جانا، اس کے بعد پریڈ گراؤنڈ میں پریڈ کرنی اور بعد میں لاء پڑھنے کیلئے سکول کی کلاس اٹینڈ کرنا ہمارا معمول تھا۔

وقت کے پہیے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہمارا ٹریننگ کورس مکمل ہوتا گیا۔ اور بالآخر ستمبر 1962ء میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی اور ٹریننگ مکمل ہونے پر ہمیں واپس اپنے ضلع میں بھیج دیا گیا۔ اپنے ضلع واپس آنے پر سٹینڈنگ گارداٹ پر ڈیوٹی لگنی شروع ہوگئی۔ چونکہ میری تعلیم ایف اے تھی اس لئے کچھ عرصہ کے بعد مجھے دفتر پولیس سیکورٹی برانچ میں تعینات کر دیا گیا۔ سیکورٹی برانچ کے انچارج چوہدری شمس الدین سب انسپکٹر تھے جو جھنگ شہر کے آرائیں قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور انتہائی اچھے انسان تھے۔ یہ بعد میں SP میانوالی بھی تعینات رہے ہیں۔ چوہدری رستم علی ہیڈ کلرک تھے اور خان بشارت علی خان SP تھے۔ انتہائی دھیمے اور شریف النفس انسان تھے۔

تعیناتی تھانہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا

مجھے تھانہ میں تعینات ہونے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ملک محمد نواز DSP ہیڈ کوارٹر کانسٹیبلان کے تبادلے کرتے تھے۔ میں اپنے طور پر تھانہ میں D.F.C تعینات ہونے کے لیے

کوشش کرتا رہا۔ بالآخر تھانہ کوٹ مومن میں بطور D.F.C تعینات ہو گیا۔ وہاں مجھے بھابڑا ذیل دے دی گئی۔ D.F.C کے فرائض میں سمنات اور وارنٹ ہائے کی تعمیل کرانا اور علاقہ کے حالات سے ایس ایچ او تھانہ کو باخبر رکھنا تھا۔ میں نے ابتداء سے ہی نیک نیتی، لگن، محنت اور شوق کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے شروع کر دیئے۔ ناکہ بندی کے ذریعہ چور پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ اس علاقہ میں زیادہ مویشی چوری کی وارادات ہوتی تھی۔ میں ہفتہ میں تقریباً پانچ راتیں اہم پلوں اور چوراہوں پر جو چوروں کی گزرگاہیں تھیں گاؤں کے چوکیدار اور لائسنسداران اسلحہ کے ذریعہ ناکہ بندی کراتا۔ اپنی تعیناتی کے دوران اکثر ناکہ بندی کے ذریعہ رنگے ہاتھوں بمعہ مسروقہ مویشیوں کے چوروں کو پکڑ کر اپنے ایس ایچ او کے حوالہ کیا اور کئی مرتبہ چوروں کے ساتھ فائرنگ کا مقابلہ بھی ہوا۔

میرا ایمان ہے کہ نیک نیتی، محنت اور ایمانداری جیسے اصولوں کو اپنا کر اگر انسان کسی کام کا بھی آغاز کرے تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی انسان میں خداداد صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں تو وہ زیادہ کامیابیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کے رویہ سے انسان کسی وقت مایوس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دن دوپہر کے وقت میں اکیلا موضع بھابڑا کے بازار میں جا رہا تھا کہ دور سے ایک شخص کے پاس میں نے رائفل دیکھی جس کے پاس اس کا لائسنس نہیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر دوڑ پڑا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ مکانوں کی چھتیں اور دیواریں پھلانگتا گیا میں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ موندارانجھہ نامی شخص جو کہ ہسٹری شیٹر اور بستہ الف کا بدمعاش تھا کے گھر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ چارپائی کے نیچے رائفل پھینک کر مکان کے اندر کہیں چھپ گیا۔ میں چونکہ اکیلا تھا۔ لہٰذا اس کو تلاش کرنے کی زیادہ کوشش نہ کی۔ چارپائی کے نیچے سے رائفل اٹھالی۔ بھاگنے والے شخص کی شناخت ہو گئی اس کا نام مرزا تھا جو اس علاقہ کا بدنام شخص تھا۔ میں رائفل لے کر چوہدری غلام رسول رانجھہ نمبردار کے ڈیرہ پر چلا گیا۔ چوہدری غلام رسول ایک وضعدار اور مخلص انسان تھے۔ معاون پولیس ہونے کے علاوہ میرے ان کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ بتلایا انہوں نے کہا اکیلے آپ کو اس کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ وہ تو ایک انتہائی خطرناک بدمعاش ہے۔ میں نے تھانہ جا کر رائفل ایس ایچ او تھانہ کے پیش کی اور سارے واقعہ سے انہیں آگاہ کیا۔ ایس ایچ او کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انہوں نے ولائتی رائفل اپنے پاس رکھ لی اور ملزم کے خلاف کوئی

کارروائی نہ کی۔اس پر وقتی طور پر مجھے مایوسی ہوئی۔لیکن میں نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔

بھرتی بعہدہ اے۔ایس۔آئی

ایک سال بعد میرا تبادلہ تھانہ کوٹ مومن سے بطور نائب ریڈر DSP ہیڈ کوارٹر ہو گیا۔اس دوران میری شادی ہوگئی۔اور ضلع سرگودھا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر بن چکا تھا۔1966ء میں جناب ڈی آئی جی صاحب سرگودھا نے براہ راست اے ایس آئی کی بھرتی کیلئے درخواستیں طلب کیں۔ F.A پاس کانسٹیبلان کو بھی درخواست دینے کی اجازت دی گئی۔چنانچہ میں نے بھی درخواست دے دی۔تحریری امتحان ہوا۔اس کے بعد انٹرویو ہوا۔چوہدری محمد فضل حق ڈی آئی جی تھے جو انتہائی سادہ اور نیک مزاج افسر تھے۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں براہ راست اے ایس آئی منتخب ہو گیا۔یہاں ایک بات کا تذکرہ کرتا چلوں کہ جس روز انٹرویو ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے صاف ستھری وردی تیار کی اور بیج نکل کرانے کے لیے دیئے۔شام کو دکان سے نکل شدہ بیج واپس لئے جو کہ ایک لفافہ میں بند تھے۔میں سید ھاہری پورہ جہاں رہائش تھی پہنچ گیا۔وردی پر بیج لگانے کیلئے لفافہ کھولا تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ان میں ایک اے ایس آئی کا پھول (سٹار) بھی تھا۔ وردی پر بیج لگانے سے فارغ ہو کر میں عشاء کی نماز پڑھنے کیلئے مسجد میں گیا۔نماز ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر دعا مانگی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

اس سے کچھ روز پہلے ہمارے گاؤں کے ایک شخص نے جو سیدھا سادہ اور نیک انسان تھا اب فوت ہو چکا ہے اُس نے مجھے کہا تھانیدار جی کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ کیوں مذاق کرتے ہو میں تو سپاہی آدمی ہوں۔تو وہ کہنے لگے میرے حساب میں آپ تھانیدار بن چکے ہیں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ اے ایس آئی منتخب ہو گیا۔ہمارا چالیس لڑکوں کا گروپ تھا۔چند دنوں بعد ہمیں ٹریننگ کیلئے پولیس ٹریننگ کالج سہالہ بھیج دیا گیا۔ٹریننگ کی فضا بڑی اچھی تھی۔علی الصبح پی ٹی پھر پریڈ اس کے بعد سکول شام کو پھر پریڈ اور گنتی۔وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا اور ٹریننگ مکمل ہوتی گئی۔میرے ساتھ کمرہ میں مہر نبی بخش لک سکنہ ماڑی جو اب ڈی ایس پی ہیں اور سید ظفر عباس شاہ صاحب سکنہ دھریمہ تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔میرے دونوں ساتھی بہت اچھے انسان تھے۔ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح بہت اچھا وقت گزرا۔

1967ء میں ٹریننگ کورس ختم ہوا۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی۔ ہمارے پرنسپل جناب شہاب الدین خان صاحب جو کہ انتہائی شفیق افسر تھے نے پاسنگ آؤٹ پریڈ پر خطاب کیا۔ اس کے بعد تمام زیر تربیت افسران کو فارغ کر دیا گیا جو واپس اپنے اپنے اضلاع میں چلے گئے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بذریعہ ٹرین واپس سرگودھا آ گیا۔ دس یوم رخصت گزارنے کے بعد پولیس لائن میں رپورٹ کی۔ پولیس رولز کے مطابق ہمارا A کورس شروع ہوا اور اس کے بعد B کورس اور پھر C کورس مکمل کیا۔

ضلع میانوالی تبادلہ

C کورس مکمل کرنے کے بعد ستمبر 1967ء میں مجھے میانوالی ضلع تبدیل کر دیا گیا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب 3 بجے دن کے قریب میں لاری اڈا سے میانوالی جانے کیلئے بس میں سوار ہوا تو وہاں یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ نواب امیر محمد خان آف کالا باغ سابقہ گورنر کوان کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے۔ شام کو پولیس لائن میانوالی پہنچ کر ریسٹ ہاؤس میں بستر وغیرہ کھولا۔ دوسرے روز ایس پی صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے D کورس کیلئے میرا تبادلہ تھانہ قمر مشانی کر دیا۔ چوہدری گل اصغر سب انسپکٹر بطور انچارج تھانہ تعینات تھے جن کا شمار اچھے پولیس افسران میں ہوتا تھا۔ ان کی زیر نگرانی کام شروع کیا۔ خان منظور احمد خان انسپکٹر ہمارے ایس ڈی پی او تھے جن کا ہیڈ کوارٹر کالا باغ تھا۔ وہ بھی انتہائی ذہین، بردبار اور شفیق پولیس افسر تھے۔ ان سے بھی راہبری حاصل کی۔ حسب عادت شب و روز محنت سے کام کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تھوڑے عرصہ میں پولیس ورکنگ کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ D کورس ختم ہونے پر ادھر ہی بطور تفتیشی کام شروع کیا۔ علاقہ کے بدنام ترین سمگلر اور بدمعاش صالحو ساکن چاپری کو گرفتار کیا تو اس علاقہ کے لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ اس سے میری عوام اور اپنے سینئر افسران میں کافی نیک نامی ہوئی۔ کافی مشکل تھانہ تھا۔ اس کا علاقہ جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہے وہ کچہ کا علاقہ کہلاتا ہے جہاں ہندکو زبان بولی جاتی ہے۔ اس تھانہ کے علاقہ میں موضع سلطان خیل اور مکڑوال پہاڑ کے ساتھ ساتھ ہے۔ وہاں ہندکو اور پشتو دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس تھانہ کے علاقہ میں موضع ترگ، سلطان خیل، ملا خیل، مندہ خیل اور خدوزئی قدرے بڑے قصبے تھے۔ مکڑوال میں کوئلہ کی کانیں ہیں۔ وہاں سے بھاری تعداد میں کوئلہ نکلتا ہے۔ تھانہ قمر مشانی تقریباً ایک سال کے بعد

1969ء میں مجھے بطور انچارج ٹریفک تعینات کر دیا گیا۔ان دنوں ہمارے ایس پی جناب نیک عالم چیمہ تھے۔ایک دن 8 بجے رات جناب چیمہ صاحب اپنی ذاتی مزدا کار نمبر SG/16 برنگ نیلا جوانہوں نے نئی نئی خریدی تھی میں سوار ہوکر کالاباغ سے واپس میانوالی آرہے تھے کہ راستہ میں کسی جگہ ان کی کار کا ایک ویل کپ گر گیا۔میانوالی پہنچ کر جب ویل کپ غائب پایا تو چیمہ صاحب نے تھرتھلی مچادی۔ڈرائیور کی شامت آ گئی۔کالاباغ روڈ پر واقعہ تھانہ داؤدخیل تھانہ موچھ اور تھانہ صدر کی پولیس کو بذریعہ وائرلیس حکم ملا کہ اپنے اپنے علاقہ میں سڑک کے ساتھ ویل کپ تلاش کریں۔سب نے اپنے اپنے علاقہ میں تلاش شروع کر دی۔میں نے بھی اپنے کچھ ملازمان ایس پی صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے روانہ کر دیئے۔تمام رات پولیس حرکت میں رہی اور سڑک کے دائیں، بائیں تمام علاقہ چھان مارا لیکن ویل کپ کا نشان تک نہ ملا۔صبح ہوئی تو روشنی میں تھانہ کے ایک اے ایس آئی کو سرکنڈوں میں سے ویل کپ مل گیا۔میں کچہری چوک میں کھڑا تھا کہ وہ اے ایس آئی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ موٹر سائیکل چلاتا ہوا آیا۔اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا جو ویل کپ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر ہوا میں لہرا رہا تھا۔وہ فاتحانہ انداز میں ایس پی صاحب کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ قارئین یہ اندازہ لگا سکیں کہ اس زمانہ میں ماتحتان کے دلوں میں اپنے سینئر افسران کا خوف اوراحترام کس قدر تھا۔

کچھ عرصہ بعد ٹریفک سے میری تعیناتی بطور انچارج چوکی پولیس کندیاں ہوگئی۔یہ چوکی تھانہ صدر میانوالی کی چوکی تھی جو آج کل تھانہ بن چکا ہے۔

گرفتاری علمو بدمعاش

چوکی پر آئے مجھے ایک ماہ گزرا ہوگا کہ میانوالی شہر میں ایک غنڈہ علم دین عرف علمو نے ایک چھوٹی بچی کے ساتھ ریپ کر کے اسے قتل کر دیا اور روپوش ہوگیا۔اس واقعہ سے میانوالی شہر کے عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ملکی پریس نے اس واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اچھالا۔اس وجہ سے ضلع میانوالی کی پولیس کیلئے یہ واقعہ چیلنج بن گیا۔ان دنوں تھانہ صدر کا انچارج چوہدری کرم الٰہی سب انسپکٹر تھا جو انتہائی دلیر، دیانت دار، وضعدار، منصف مزاج اور بااصول پولیس افسر تھے۔مجھے ان کی ایک بات آج تک یاد ہے۔ایمانداری اور قناعت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے سے

اونچا معیار رکھنے والے کے گھر پر اپنی بیوی کو جانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ وہاں جا کر وہ قیمتی اور اچھی چیزیں دیکھے گی تو اس کے اندر بھی ایسی چیزیں لینے کی خواہش پیدا ہوگی اور پھر وہ انہیں (چوہدری کرم الٰہی) کو ایسی چیزوں کی فرمائش کرے گی۔ چوہدری صاحب نے مجھے تھانہ صدر بلوا کر علمو کی گرفتاری پر مامور کیا۔ "نصر من الله وفتح قریب" پڑھ کر میں نے علمو ملزم کا تعاقب شروع کر دیا۔ چوتھے روز بھیس بدل کر ڈرامائی انداز میں کٹھ روڈ خوشاب پر واقع ایک چھوٹی سی مسجد سے اسے گرفتار کر لیا۔ وہاں سے اسے قابو کر کے علاقہ تھانہ صدر میانوالی کے ایک گاؤں جھامرہ کے سکول میں لے گیا۔ سکول میں چھٹی تھی۔ وہاں اس سے پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد اس کی خوب مالش کی۔ منہ کالا کر کے چھتروں کا ہار پہنایا اور بس کی چھت پر بٹھا کر اسے میانوالی شہر کی مختلف سڑکوں پر گھمایا تاکہ لوگ اس کو عبرتناک حالت میں دیکھیں اور ان کے اندر اعتماد کی فضا بحال ہو۔ چونکہ اس کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی للہٰذا عوام نے گھروں سے نکل کر یہ تماشا دیکھا اور پولیس زندہ باد کے نعرے لگائے۔

تھانہ پپلاں تبادلہ

جنوری 1970ء میں میرا تبادلہ تھانہ پپلاں ہوگیا۔ وہاں سید عاشق حسین شاہ سب انسپکٹر انچارج تھے جو سرگودھا محلہ ہری پورہ کے رہائشی تھے اور انتہائی بھلے مانس انسان تھے۔ تھانہ پپلاں کی تعیناتی کے دوران ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ایس ایچ او صاحب دو یوم کی رخصت پر سرگودھا چلے گئے اور میں شام کو گشت کیلئے موضع ہرنولی کی طرف چلا گیا۔ ان دنوں پپلاں شہر کے رہائشی عطا محمد کلی خیل اور مرید مہدی کی آپس میں سخت مخالفت تھی۔ اسی روز شام کے بعد دونوں پارٹیوں کا بازار میں جھگڑا ہوگیا۔ دونوں پارٹیاں اپنی اپنی رپورٹ درج کرانے تھانہ پہنچ گئیں۔ تھانہ میں صرف محرر، نائب محرر اور ایک کانسٹیبل حاضر تھے۔ دونوں پارٹیوں کی تھانہ میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مضروب ہوئے۔ میں اطلاع پا کر فوری طور پر تھانہ پہنچا۔ دونوں فریقوں کے ایک دوسرے کے خلاف اقدام قتل کے مقدمات درج کیے۔ دوسرے دن ایس ایچ او صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ان دونوں مقدمات کی رپورٹ ابتدائی پڑھ کر مجھے شاباش دی کہ تم نے نوآموز ہو کر تمام صورت حال کو بڑے اچھے طریقہ سے سنبھالا ہے اور فریقین کے ایک دوسرے کے خلاف مقدمات درج کر لیے



گرفتاری علمو بدمعاش

ہیں۔ان کی شاباش دینے پر میری حوصلہ افزائی ہوئی۔

بعہدہ سب انسپکٹر ترقی

اس کے بعد بطور سب انسپکٹر ترقی یاب ہوگیا۔1970ء میں ڈی آئی جی صاحب سرگودھا رینج نے میرا تبادلا ضلع لائل پور موجودہ فیصل آباد کر دیا۔ان دنوں ضلع لائل پور، سرگودھا رینج میں شامل تھا۔تبادلہ ہونے پر ضلع لائل پور پہنچا تو میرا تبادلہ تھانہ باہلک کر دیا گیا۔اس کا علاقہ دریائے راوی کے کنارے تھا اور جرائم پیشہ افراد خاص طور پر مویشی چوروں کا علاقہ تھا۔بلوچ اور وٹو اقوام کے لوگ اس کام میں کافی بدنام تھے۔چوری اور رسہ گیری ان کا شغل تھا۔کروٹواں دریا کے بیلہ کے قریب گاؤں تھا۔وہاں کی رہائشی وٹو قوم اس سلسلہ میں بہت بدنام تھی۔بچپن میں، میں اپنے بزرگوں کی زبانی سنتا جب وہ کسی ڈھورڈنگر (مویشی) پر ناراض ہوتے تو اسے یہ پلوتا دیتے ''شالا کروٹواں دا لنگیں''۔جب میں نے تھانہ باہلک کے علاقہ میں کروٹواں موضع کا نام سنا تو مجھے وہ بچپن کے وقت کی بزرگوں کی بات یاد آئی تو اس کے متعلق، میں نے اس علاقہ کے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اس پلوتا کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے وضاحت کی کہ پرانے زمانہ میں جب جنگل ہی جنگل تھا اور آبادی بہت کم تھی ان دنوں ڈنگر (مویشیوں) کی چوری بہت ہوتی تھی۔سراغرساں (کھوجی) چوروں اور مسروقہ ڈنگروں کا کھوج رواں کر کے دور دراز علاقہ تک لے جاتے۔لیکن جب کھوج موضع کروٹواں علاقہ کی طرف آتا تو دریا کا بیلہ ہونے کی وجہ سے کھوج گم ہو جاتا اور آئندہ رواں نہ ہوسکتا۔کھوجی ٹکریں مار مار کر کوشش کرتے لیکن بے سود۔آخر تھک ہار کر واپس چلے جاتے۔پلوتا دینے والے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تو (ڈنگر) چوری ہو جائے۔چور کروٹواں سے آگے لے جائیں تاکہ تیرا کوئی نشان تک نہ ملے۔

تعیناتی انچارج چوکی نواں لاہور

تقریباً 6 ماہ تھانہ باہلک تعیناتی کے بعد 1970ء ہی میں مجھے انچارج چوکی پولیس نواں لاہور تعینات کر دیا گیا۔آج کل نواں لاہور تھانہ بن چکا ہے۔اُن دنوں نواں لاہور تھانہ گوجرہ کی چوکی تھی۔گوجرہ ان دنوں ضلع فیصل آباد میں تھا اور موجودہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع فیصل آباد کی تحصیل تھی۔نواں لاہور میں زیادہ تر آبادکار اور مہاجرین کی آبادی ہے۔اس کی حدود پر ضلع جھنگ کی

اقوام لک، بلوچ، رجوکے، ملوکے، سپرا اور نانگے گوجرہ کے علاقہ میں سرقہ مویشی کی واردات کرتے تھے۔ جو یہ لوگ ''بھونگا'' دے کر اپنے مسروقہ مویشی واپس لے آتے۔ ملک خالد ٹوانہ ساکن چراغ آباد، چوہدری قادر بخش ریٹائرڈ جج ساکن جھور، محمد سرفراز پھلی سیال ساکن نواں لاہور، چوہدری محمد اسماعیل نمبردار ساکن ننگل اور محمد شفیع نمبردار اس علاقہ کی اچھی شخصیات تھیں۔ چک نمبر 332 کا چوہدری نذیر احمد ذیلدار اور چک چٹھہ کے چٹھے شریف اور متمول زمیندار تھے۔

نواں لاہور کے درمیان سے جھنگ فیصل آباد روڈ گزرتی ہے۔ اس روڈ پر تھانہ ٹھیکری والا، نواں لاہور، (گوجرہ) اور تھانہ موچی والا ضلع جھنگ کا علاقہ آتا ہے۔ اس علاقہ سے سڑک کے ساتھ ساتھ ٹیلیفون کی تاریں چوری کاٹ لی جاتی تھیں جس سے گورنمنٹ کو لاکھوں روپے کا نقصان ہوتا تھا۔ میں نے محکمہ ٹیلی فون کے ملازمین کے ساتھ میٹنگ کی اور ایسا لائحہ عمل تیار کیا کہ مجرمان اگر اب واردات شروع کریں تو بچ کر نہ جائیں۔ چنانچہ اپنی تیار کردہ منصوبہ بندی پر عمل کر کے دو ماہ کے اندر تار چوروں کے بڑے گینگ پکڑ لیے جو لاہور سے بذریعہ کار آ کر اس علاقہ کی تار چوری کی واردات کرتے۔ ان کے پکڑے جانے کے بعد تار چوری کی واردات بالکل ختم ہو گئی۔ ایک مرتبہ محکمہ واپڈا کا ایک لائن سپرنٹنڈنٹ اور دو لائن مینوں کو دو بجے رات رنگے ہاتھوں عین اس وقت پکڑا جب وہ واپڈا کے ٹرک میں لوڈ کر کے جھنگ گودام سے تانبا کی تار لاہور کے ایک ٹھیکیدار کو نواں لاہور کے علاقہ میں سڑک پر اس کی کار کی ڈگی میں رکھ رہے تھے۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ نواں لاہور سے فیصل آباد کی طرف تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ایک راجباہ کے پل کے ساتھ ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ میں اپنے ملازمین کو ساتھ لے کر پل کے قریب درختوں میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی تھی۔ تقریباً دو بجے رات جھنگ کی طرف سے واپڈا کا ٹرک آ کر پل کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ہم خاموشی سے بیٹھ کر اسے واچ کرتے رہے۔ تقریباً 15 منٹ کے بعد فیصل آباد کی طرف سے ایک کار آئی۔ ڈرائیور نے کار بیک کر کے ٹرک کے پیچھے لگائی اور ٹرک سے تاریں اٹھانے کی آواز آئی۔ چھپ کر قریب گئے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ٹرک سے تاروں کے گچھے اتار کر کار کی ڈگی میں رکھ رہے ہیں۔ ہم نے قریب جا کر پوچھا آپ کون ہیں تو چشم زدن میں ٹرک اسٹارٹ ہو گیا اور وہ لوگ پیچھے سے ٹرک کے ساتھ چمٹ کر چلتے ٹرک پر سوار ہو گئے۔ کار کا ڈرائیور کار سٹارٹ کرنے لگا تو اس کو قابو کر لیا گیا۔ جلدی سے اس کو پچھلی سیٹ پر ملازمان نے بٹھا کر اس کے بازو پیچھے کی طرف باندھ دیئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم نے بھی چشم زدن

میں کار ٹرک کے پیچھے لگا دی۔ ٹرک کافی سپیڈ پکڑ چکا تھا۔ کار کو بھی بہت تیز چلایا۔ تقریباً چھ میل سفر کرنے کے بعد جب ٹرک کے نزدیک پہنچے تو ٹرک کے پیچھے سوار ملزمان نے تار کا گچھا ہماری کار کے آگے پھینک دیا۔ وہ کار کے آگے رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کار فوراً سائیڈ پر کر لی۔ دوبارہ پھر جب قریب پہنچے تو انہوں نے پھر ایک تار کا گچھا آگے پھینک دیا۔ میں ان کے اس طریقہ سے چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ تار کے گچھے کار کے آگے پھینکتے گئے۔ میں اپنا بچاؤ کرتا گیا۔ دونوں گاڑیاں تقریباً 60/70 میل کی رفتار پر چل رہی تھیں۔ میں نے اپنی کار کو کنٹرول کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے سٹیرنگ پکڑ لیا اور دائیں ہاتھ سے سرکاری ریوالور خول سے نکال کر ٹرک کے پچھلے دائیں ٹائروں کے قریب کار لا کر دائیں دروازے سے ہاتھ نکال کر چار فائر پچھلے دائیں ٹائروں پر کیے۔ اتفاق سے دو فائر ٹائروں کو لگ گئے جس سے ٹرک کے پچھلے دائیں ویل والے دونوں ٹائر پنکچر ہو گئے بلکہ ایک ٹائر پھٹ گیا۔ ملزمان نے گھبرا کر ٹرک کی رفتار آہستہ کی۔ ایک ریڑھے میں میری کار لگتے لگتے بچ گئی۔ میں نے فوری طور پر ریڑھے اور ٹرک کے درمیان سے تیزی کے ساتھ کار نکال کر ٹرک کے آگے کھڑی کر لی۔ ٹرک کے ڈرائیور نے خوف زدہ ہو کر ٹرک روک لیا۔ ہم نے ٹرک کو گھیر کر ملزمان کو قابو کر لیا۔ ان میں ایک لائن سپرنٹنڈنٹ، دو لائن مین اور ایک واپڈا کے ٹرک کا ڈرائیور تھا۔ ان سب ملزمان کو ٹرک اور راستہ میں گری ہوئی تار اٹھا کر واپس نواں لاہور چوکی پہنچے۔ لائن سپرنٹنڈنٹ نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور دس ہزار روپے رشوت کی پیش کش کی۔ اس زمانے میں دس ہزار روپے بہت بھاری رقم تھی۔ میں نے لائن سپرنٹنڈنٹ کو کہا کہ یہ رقم اپنے پاس محفوظ رکھیں وکیل کو فیس دینے کیلئے کام آئے گی۔ ان ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کر کے گرفتار کر کے چالان عدالت کیا۔

نواں لاہور تعیناتی کے دوران ایک رات چوروں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ سیمے دی جھوک علاقہ تھانہ موچی والا ضلع جھنگ کی بدنام سارق مویشی بلوچ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا بارہ ملزمان پر مسلح گروہ گھوڑیوں پر سوار ہو کر موضع مقبول پور علاقہ چوکی نواں لاہور سے چار بیل چوری کر کے لے جا رہے تھے کہ راستہ میں پل کالیاں پر میں نے معہ 2 ملازمان کے ناکہ بندی کر کے ان کو روکا۔ انہوں نے ہم پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہم نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ دو ملزمان رب نواز اور ریاض بلوچ ہماری فائرنگ سے زخمی ہو گئے۔ ان کی گھوڑی بھی زخمی ہو گئی۔ مسروقہ بیل ان سے چھڑا لئے گئے۔ اس واقعہ کی تفصیل علیحدہ بیان کی گئی ہے۔

جناب آغا رضا علی خان ایس ایس پی صاحب فیصل آباد نے خوش ہو کر مجھے ٹریفک سارجنٹ فیصل آباد تعینات کر دیا۔ چوہدری محمد بخش گاڑا اے ایس آئی اور محمد اکرام اللہ اے ایس آئی میرے ساتھ ٹریفک میں تعینات تھے۔ ٹریفک سروس میرے مزاج کے خلاف تھی۔ میں ایس ایس پی صاحب کے پیش ہو گیا کہ ٹریفک سے تبدیل کر کے مجھے کسی جگہ ایس ایچ او تعینات کیا جاوے۔ آغا صاحب نے فرمایا کہ ''ٹریفک سارجنٹ تعینات ہونے کیلئے لوگ بڑی بڑی سفارشیں کرواتے ہیں۔ میں نے آپ کے کام سے خوش ہو کر لگایا ہے''۔ میں نے کہا کہ جناب مجھے ایس ایچ او تعینات ہونے کا شوق ہے۔ انہوں نے مہربانی فرماتے ہوئے مجھے تھانہ گوجرہ کا ایس ایچ او تعینات کر دیا۔

تعیناتی بطور انچارج تھانہ گوجرہ

تھانہ موچی والا ضلع جھنگ کے دو گاؤں ''سیمے دی جھوک'' اور ''بہادر دی جھوک'' میں بلوچ قوم آباد ہے جو مویشی چوری کرنے میں بہت بدنام ہیں۔ خاص طور پر تھانہ گوجرہ اور تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقہ سے اکثر مویشی چوری کی واردات کرتے اور بعد میں کچھ رقم بطور ''بھونگا'' لے کر مسروقہ مویشی واپس کرا دیتے۔ بھونگا لے کر مویشی واپس کرنے میں فاضل ولد بھاپی اور شیہاں بلوچ کے نام قابل ذکر ہیں جب میں نے تھانہ گوجرہ کا چارج لیا۔ یہ بطور ایس ایچ او میری پہلی تعیناتی تھی اور تھانہ بھی کافی ہیوی چارج تھا۔ علاقہ کے معززین کا وفد میرے پاس آیا اور شکایت کی کہ بلوچ چوروں نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں روزانہ رات کو مویشی چوری کر کے لے جاتے ہیں۔ میں نے علاقہ کے تمام نمبردار اور چوکیدار بلا لئے۔ ہر ایک گاؤں میں گزشتہ چھ ماہ سے ہونے والی وارداتوں کی فہرستیں بنائیں ریکارڈ تھانہ چیک کیا تو ان کا کوئی مقدمہ درج نہیں تھا۔ میں نے 45 مقدمات درج کیے اور ان میں نامزد بلوچ چوروں کو دو ہفتوں کے اندر گرفتار کر کے ان کی باقاعدہ تفتیش کی اور جیل بھیج دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے چوری کی واردات بالکل بند ہو گئی اور علاقہ کے عوام پولیس پر بھرپور اعتماد کرنے لگے۔

اپر کلاس کورس

چار ماہ کے بعد جناب ڈی آئی جی صاحب سرگودھا رینج نے مجھے اپر کورس کیلئے منتخب کیا۔ چھ

ماہ کا کورس پولیس ٹریننگ کالج سہالہ میں کیا۔ ستمبر 1973ء میں وہاں سے فارغ ہو کر جائننگ ٹائم اپنے گاؤں گزار کر واپس فیصل آباد جا رہا تھا کہ بس سٹینڈ سرگودھا پر مجھے سرگودھا کے ایک کانسٹیبل محمد نواز جو کہ اکٹھے بھرتی ہونے کی وجہ سے میرا واقف کار تھا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے حیران ہو کر کہا کس بات کی مبارک باد۔ اس نے بتلایا کہ آپ کا تبادلہ ایس ایچ او تھانہ کوٹ مومن ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے سرگودھا تو میرا رہائشی ضلع ہے۔ میں اس ضلع کے تھانہ میں کیسے ایس ایچ او لگ سکتا ہوں۔ اور یہ کہ میں ابھی اپر کورس سے واپس جائننگ ٹائم پر ہوں۔ فیصل آباد جا رہا ہوں۔ وہ بولا کہ اس نے ایس پی سرگودھا کے دفتر سے یہ بات سنی ہے۔ میں پتہ کرنے کے لیے ایس پی آفس سرگودھا پہنچا تو وہاں دفتر کے باہر سید آغا شاہ اسسٹنٹ ہیڈ کلرک کھڑا تھا۔ اس نے مجھے مبارک باد دی کہ آپ کے تبادے کے آرڈر ضلع فیصل آباد سے ضلع سرگودھا ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مجھے آرڈر دکھائے۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ میں سیدھا بس سٹینڈ پہنچا۔ وہاں سے بس پر سوار ہو کر فیصل آباد پہنچ گیا۔ دوسرے روز ایس پی آفس گیا۔ وہاں بھی آرڈر پہنچ چکا تھا۔ میں نے چارج رپورٹ دی اور بصورت تبادلہ سرگودھا پہنچ گیا۔

تعیناتی بطور انچارج تھانہ کوٹ مومن

پولیس لائن کے ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھا۔ دوسرے روز ایس پی آفس گیا۔ اس وقت سرگودھا کے ایس پی اویس مظہر تھے۔ اردلی کے ذریعہ اطلاع بھیجی۔ انہوں نے مجھے بلا لیا اور فرمانے لگے کہ آپ کی شہرت بہت اچھی سنی ہے۔ ایک دو دن میں پوسٹنگ ہو جائے گی۔ میں سلام کر کے واپس چلا گیا۔ دو گھنٹہ کے بعد اطلاع ملی کہ اویس مظہر صاحب کا کسی بات پر اچانک تبادلہ ہو گیا ہے۔ دو یوم بعد نئے ایس پی ذوالفقار علی قریشی صاحب نے چارج لیا۔ اگلے روز انہوں نے مجھے اپنے دفتر طلب کیا اور کہنے لگے کہ کوٹ مومن تھانہ میں ایک ایڈیشنل ایس ایچ او لگا ہوا ہے جو لوگوں کے باغ بھی بیچ کر کھا گیا ہے اور چک نمبر 20 جنوبی کے ایک قتل کے مقدمہ میں بھی سودے بازی کر رہا ہے۔ سنا ہے کہ آپ اچھے پولیس افسر ہیں۔ آج ہی تھانہ کوٹ مومن کا بطور انچارج چارج سنبھال لیں اور قتل کا مسئلہ حل کرائیں۔ میرے پاس اپنا ویسپا سکوٹر تھا۔ پولیس لائن سے روانگی کی رپورٹ تحریر کر کے تقریباً چار بجے شام تھانہ کوٹ مومن پہنچ گیا۔ چوہدری محمد بشیر سب انسپکٹر تھانہ میں موجود تھے۔ ان سے چک نمبر 20 جنوبی والے قتل کے حالات معلوم کیے۔ انہوں

نے بتلایا کہ قتل کا نامزد ملزم گرفتار ہے جو تھانہ کی حوالات میں بند ہے۔اسی اثنا میں گرفتار ملزم کے ورثاء آ گئے جنہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ ان کا آدمی قتل میں بالکل بے گناہ ہے۔میں نے ان کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ موقع دیکھنے آ رہا ہوں۔سورج غروب ہو چکا تھا کہ میں اپنے ہمراہ چار ملازمین کو لے کر چک نمبر 20 جنوبی جو کہ تھانہ سے تقریباً 3 میل کے فاصلہ پر ہوگا موقع پر پہنچ گیا۔ شب بھر مختلف لوگوں سے مختلف پہلوؤں پر پوچھ گچھ کرتا رہا۔گاؤں کے نمبردار چوہدری اللہ یار سے ملاقات ہوئی جو انتہائی شریف اور راست گو انسان تھا۔اس سے بھی کافی تفصیل کے ساتھ بات چیت ہوئی۔دوسرے روز شام تک اصل قاتل ٹریس کر لیا۔بے گناہ شخص جو حوالات میں بند تھا کو اس مقدمہ سے ڈسچارج کروایا اور اصل ملزم کو چالان عدالت کیا۔اس سے میری آمد کا علاقہ میں بہت اچھا اثر پڑا۔

تھانہ کوٹ مومن کی بطور ایس ایچ او تعیناتی پر دو مشکلات میرے سامنے تھیں۔ایک تو میں سات سال قبل اس تھانہ میں بطور کانسٹیبل تعینات رہ چکا تھا۔دوسرے رہائشی ضلع ہونے کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ تعلقات بہت زیادہ تھے، بلکہ اس تھانہ کے علاقہ کے کافی لوگوں کی ہمارے گاؤں میں رشتہ داریاں تھیں۔ہر مقدمہ میں دونوں طرف سے واقف لوگ سفارش کے لیے پہنچ جاتے۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے سب دوست رشتہ دار ناراض ہو جائیں میں نے سچائی اور میرٹ کی پالیسی پر ہر صورت عمل کرنا ہے۔اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سفارشیوں کی تعداد کم ہوتی گئی، بلکہ ایک ماہ کے بعد یہ لعنت خود بخود ختم ہو گئی اور ہر سچے آدمی کو خود بخود انصاف ملنا شروع ہو گیا۔تھانہ کے علاقہ کی چوری اور رسہ گیری پر مکمل کنٹرول کر لیا، بلکہ ملحقہ تھانہ جات کے علاقہ پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور جرائم میں خاصی کمی واقعہ ہوئی۔

میری تعیناتی کا بدترین واقعہ میاں محمد اسلم رانجھہ سکنہ واں میانہ کا قتل تھا جو اسلم مڈھانہ سکنہ مڈھ رانجھہ اور اس کے ساتھیوں نے ڈرامائی انداز میں مسروقہ بیلوں کی تلاش کے لیے واہر پارٹی کا روپ دھار کر واں میانہ میں اس کے اپنے ڈیرہ پر قتل کیا تھا۔اگرچہ جملہ ملزمان میں نے گرفتار کر کے چالان کر دیئے تھے لیکن اس قتل کا مجھے آج تک افسوس ہے۔میاں محمد اسلم رانجھہ انتہائی خوبصورت جوان تھا۔خوبصورتی کے علاوہ انتہائی نفیس، زیرک اور خوش لباس تھا۔شیریں گفتار سے دوسروں کے دل جیت لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔اس کی زندگی کا سٹائل شہزادوں کی طرح تھا۔افسوس کہ اس کی چند کمزوریاں اس کی موت کا سبب بن گئیں۔اس کے دو بیٹے سیف اور شیری

اس وقت چھوٹے تھے۔ مقدمہ کی سرپرستی میاں محمد اسلم رانجھہ کے بھائی محمد اکرم رانجھہ ایڈووکیٹ نے کی جو انتہائی شریف النفس، مذہبی ذہن، تعمیری اور مثبت سوچ رکھنے والا شخص ہے۔ ان کا ایک بیٹا محمد سلیم رانجھہ محکمہ کسٹم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس خاندان کے دو چراغ میاں سکندر حیات رانجھہ اور میاں اختر حیات رانجھہ جن کے ساتھ میرے سگے بھائیوں جیسے تعلقات تھے اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین) ان کے ماموں زاد بھائی میاں مناظر علی رانجھہ پنجاب اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں اور وہ رانجھہ فیملی میں ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہیں۔ میاں سکندر حیات اور اختر حیات رانجھہ کے والد میاں فضل الٰہی رانجھہ تھے جو وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل سرگودھا رہ چکے ہیں۔ بعد میں دنیاداری سے لاتعلق ہو کر گھر کے ملحقہ قبرستان میں جھونپڑی میں زندگی گزاری۔ ان کے خاندان کے آباواجداد میں نیک، صالح اور حافظ قرآن شخصیتیں ہو گزری ہیں۔ اس وجہ سے اس رانجھہ خاندان کو میانہ خاندان کہتے ہیں اور اسی نسبت سے ان کے گاؤں کا نام واں میانہ ہے۔ واں کنویں کو کہتے ہیں۔ میاں مناظر علی کے والد میاں مظفر علی رانجھہ اور بھائی محمد اکرم رانجھہ کو بھی میاں محمد اسلم رانجھا کے قتل کی رپورٹ ابتدائی میں ملوث کیا گیا تھا۔ میاں مظفر علی رانجھہ دوسرے ملزمان کے ہمراہ حوالات میں بند تھے کہ چوہدری محمد مراد گوندل جن کو میں اپنے بزرگوں کے برابر عزت دیتا تھا میرے پاس تشریف لائے اور مجھے کہنے لگے کہ میں نے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ اگرچہ میں آپ کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں لیکن بات کرنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے قابل احترام ہیں آپ بے شک کھل کر بات کریں۔ کہنے لگے کہ میاں مظفر علی رانجھا بے گناہ ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ بہت بڑا زمیندار ہے۔ آپ اپنے کسی رشتہ دار کے نام ایک مربعہ اراضی لگوا لیں اور انہیں بے گناہ کر دیں۔ میں نے کہا کہ چوہدری صاحب اگر وہ بے گناہ ہیں تو ان کا ایک مرلہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ گو میں ایک چھوٹا سا زمیندار ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے دیئے پر شاکر ہوں۔ بعد میں میاں صاحب تفتیش میں بے گناہ پائے گئے جن کو بے گناہ قرار دے دیا گیا۔

تھانہ کوٹ مومن کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اسے آپ لطیفہ سمجھیں۔ ایک دن میں تھانہ میں موجود تھا کہ میاں محمد افضل ہنجرا ساکن مرولیانوالہ جو ایک شریف اور متمول زمیندار تھا بعد میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہا ہے میرے پاس آیا اور کہا کہ چوہدری صاحب بات کرنے میں مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ اگر نہ کروں تو لوگوں کا نقصان ہوتا رہے گا اور کر دوں تو شاید بہتوں کا

بھلا ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ ضرور بتلائیں۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ ان کی گدھی چوری ہو گئی ہے۔ وہ گدھی چوری کی رپورٹ کرنے کو بہت معیوب سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے مزید بتلایا کہ ان کے علاقہ مرولیا نوالہ للیانی اور مٹیلا کی گدھیاں خچر کی طرح قد آور ہوتی ہیں۔ اس علاقہ سے ہر ہفتہ ایک نہ ایک گدھی چوری ہو جاتی ہے۔ لوگ خود تلاش جاری رکھتے ہیں لیکن پولیس کو رپورٹ نہیں کرتے اور یہ سلسلہ تقریباً دو سال سے شروع ہے۔ میں نے حق نواز جسرہ ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل انتہائی نیک نیت، محنتی، نڈر تھا اور بدرویہ اشخاص کو جانتا تھا۔ اس کو گدھیوں کی چوری کے متعلق کہا۔ اس نے انکشاف کیا کہ موضع ساڑ مراد والا علاقہ تھانہ چنیوٹ ضلع جھنگ کا ایک کمہار غالباً اس کا نام سجادو ہے وہ اس قسم کی واردات کرتا ہے۔ اور دو مرتبہ چالان بھی ہو چکا ہے۔ میں نے تھانہ کا ریکارڈ چیک کرایا تو واقعی اس کا گدھیوں کی چوری میں چالان ہونا پایا گیا۔ میں نے میاں محمد افضل کے ساتھ پروگرام بنایا۔ دوسرے روز وہ اپنی کار لے کر آ گئے۔ میں حق نواز جسرہ ہیڈ کانسٹیبل اور دو دیگر ملازمان کو ہمراہ لے کر تھانہ چنیوٹ پہنچ گیا۔ وہاں مہر نبی بخش لک ایس ایچ او تعینات تھے جو مضبوط پولیس افسر تھے۔ اور میرے ساتھ برادرانہ تعلقات تھے۔ ان کو آمد کا مقصد بتایا۔ وہ ہنس پڑے اور ازراہ مذاق کہنے لگے کہ آپ نے خود گدھیوں کی تفتیش پر آنا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک بہانہ ہے ویسے آپ کو ملنے کیلئے جی چاہ رہا تھا۔ میں اور میاں محمد افضل تھانہ میں بیٹھ گئے۔ حق نواز جسرہ ہیڈ کانسٹیبل معہ اپنے ملازمین اور تھانہ چنیوٹ سے ملازمین ہمراہ لے کر ساڑ مراد والا کی طرف روانہ کیا۔ شام تک جب ملازمین واپس نہ آئے تو ہم پریشان ہو گئے کہ ساڑ مراد والا پختہ سڑک کے قریب ہے اور اتنا زیادہ سفر بھی نہیں ہے۔ پتہ نہیں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ یہی باتیں کر رہے تھے کہ حق نواز جسرہ مسکراتا ہوا آیا اور سلوٹ مارتے ہوئے کہا کہ سر جی مبارک ہو سجادہ کمہار پولیس کو دیکھ کر دوڑ پڑا تھا۔ انہوں نے تعاقب کر کے ایک میل کے فاصلہ پر پکڑ لیا۔ اس نے وہاں سے پندرہ گدھیاں برآمد کرا دی ہیں اور بقایا سات گدھیاں کل تک برآمد ہو جائیں گی۔ اس نے مزید کہا کہ آپ اور میاں صاحب واپس تشریف لے جائیں اور وہ دوسری گدھیاں برآمد کر کے کل شام تک کوٹ مومن پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ہم واپس چلے گئے۔ دوسرے روز شام کو حق نواز ہیڈ کانسٹیبل کل 22 گدھیاں ٹرکوں میں لوڈ کر کے تھانہ پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں مجھے ایس پی کی طرف سے حکم ملا کہ آپ کی ڈیوٹی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور لگ چکی ہے۔ فوراً روانہ ہو جائیں۔ میں نے دو جوڑے وردی ہمراہ لی اور فوری طور پر لاہور روانہ ہو

گیا۔ تقریباً پندرہ روز بعد میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس آیا تو حق نواز ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا کہ گدھیوں کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ اس نے کہا کہ جناب تفتیش مکمل ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا کیسے تو فوراً بولا کہ سرناکہ بندی پر برآمدگی ڈال لی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کتنے مقدمات درج کیے ہیں۔ کہنے لگا کہ سر جی ایک ہی مقدمہ جرم 411 ت پ میں سب کی اکٹھی برآمدگی کر لی ہے۔ میں نے کہا یہ تو تم نے بہت غلط کیا۔ عدالت کیسے تسلیم کرے گی کہ ایک چور بائیس گدھیوں کو اکٹھے ہانک کر لے جارہا ہے۔ اور چوری بھی دو سال کے عرصہ میں مختلف اوقات میں ہوتی رہی ہیں۔ اس نے کہا سر جی چور تو وہی ہے نا۔

ایک مرتبہ موضع للیانی کے ایک ڈیرہ پر ایک مجرم اشتہاری کی گرفتاری کیلئے تانگہ پر سوار ہو کر گئے۔ اس نے دور سے تانگہ آتا دیکھ کر کھیتوں کی طرف دوڑ لگالی۔ ادھر تانگہ جانے کا راستہ نہیں تھا۔ میں نے کوچوان کو کہا کہ فوری طور پر تانگہ میں جوتے ہوئے گھوڑے کو کھول دے۔ اس نے گھوڑا کھولا میں اس پر سوار ہو گیا۔ اور اشتہاری مجرم کے تعاقب میں دوڑ کر تھوڑے ہی فاصلہ پر اس کو قابو کر لیا۔

ایک مرتبہ میں ایک کوچوان دُلا کشمیری کے ہمراہ تانگہ میں سوار اکیلا سفید کپڑوں میں کوٹ مومن سے گھلا پور بنگلہ کی طرف جانے والی سڑک پر گھوڑا پسند کرنے جارہا تھا کہ دیکھا کہ ایک شخص رائفل گلے میں لٹکائے گھوڑی پر سوار گھلا پور بنگلہ کی طرف جارہا تھا۔ اس نے اوپر چادر لے کر رائفل چھپائی ہوئی تھی۔ ہم آرام سے باتیں کرتے ہوئے اس کے پاس سے چور آنکھ دیکھ کر گزر گئے۔ وہ بھی اسی سمت جارہا تھا جس سمت ہم جارہے تھے۔ میں نے سر پر پگڑی باندھ لی اور تقریباً آدھا کلومیٹر آگے جاکر تانگہ روک کر کوچوان کو کہا کہ ایک طرف سے وہ گھوڑا کو پیار کرے اور دوسری طرف سے میں تھپکی دیتا ہوں۔ میں گھوڑے کو تھپکی دیتا رہا اور اس شخص کی طرف چور آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جب وہ پیچھے سے گزرنے لگا تو میں نے جھٹ سے پیچھے مڑ کر اس کی گھوڑی کی لگام پکڑ لی اور ایک ہاتھ اس کی چادر کو ڈال کر گھوڑی سے نیچے گرالیا۔ اس وقت اس کو پتہ چل گیا کہ یہ پولیس افسر ہے۔ اس زمانے میں پولیس کی دہشت بہت ہوتی تھی۔ وہ سہم گیا۔ میں نے اس کے بازو پیچھے کی طرف باندھ لئے اور بمعہ رائفل و گھوڑی تھانہ لے گئے۔ اس کے پاس رائفل کا کوئی لائسنس نہیں تھا۔ مقدمہ درج کر کے چالان کر دیا۔

ایک مرتبہ موضع مٹیلا کے ایریا میں رنگ علی ہرل کے ڈیرہ کے قریب ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔



گدھیاں چوری کرنا

صبح اذان کے وقت دو اشخاص کو گھوڑی پر سوار دیکھا جو ایک بیل کو رسی سے پکڑ کر ساتھ ساتھ ہانک کر لے جا رہے تھے۔ وہ ہم سے کچھ فاصلہ پر تھے۔ ہم نے انہیں مشکوک جان کر آواز دی تو انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہمارے پاس بھی ایک گھوڑی تھی جو درخت کے نیچے چھپا کر کھڑی کی ہوئی تھی۔ میں لوڈ شدہ رائفل لے کر اکیلا اس پر سوار ہو گیا اور ان کے تعاقب میں گھوڑی دوڑا دی۔ جب انہوں نے پیچھے دوڑتی گھوڑی کی آواز سنی تو انہوں نے بیل چھوڑ دیا اور گھوڑی سرپٹ دوڑا لی۔ ان کی گھوڑی قدرے کمزور تھی۔ میں نے پیچھے سے قریب جا کر ہوائی فائر کیا۔ ان کی گھوڑی ایک پانی کا کھال کراس کرنے لگی تو کھال میں گر پڑی۔ ایک ملزم کے پاس بندوق تھی۔ دونوں گھوڑی سے اتر گئے اور مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے بھی ایک درخت کی آڑ میں جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اتنے میں پیچھے سے باقی ملازمین پہنچ گئے۔ ملزمان کماد کے کھیت میں داخل ہو گئے۔ کافی لوگ اردگرد سے جمع ہو گئے۔ ہم نے کماد کو گھیرا دے کر دونوں ملزمان پکڑ لئے۔ جو مڈھ رانجھہ کے نامی گرامی چور تھے۔

تعیناتی تھانہ موچھ ضلع میانوالی

1975ء میں میرا تبادلہ ضلع سرگودھا سے ضلع میانوالی کر دیا گیا۔ حکم پہنچتے ہی ایس پی صاحب میانوالی نے مجھے انچارج تھانہ موچھ تعینات کر دیا۔ میں تھانہ کوٹ مومن سے روانگی کر کے سیدھا تھانہ موچھ پہنچا۔ میاں سکندر حیات اور میاں اختر حیات رانجھہ دونوں بھائی مجھے تھانہ موچھ چھوڑنے میرے ساتھ آئے۔ میاں مظفر علی رانجھہ میاں سکندر حیات رانجھہ اور اختر حیات رانجھہ کے حقیقی ماموں تھے۔ ان کو میاں محمد اسلم کے قتل کی تفتیش میں اس لیے بے گناہ قرار دیا تھا کہ وہ واقعی بے گناہ تھے۔ میں نے اپنا فرض نبھایا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ میرا کوئی احسان نہیں تھا۔ لیکن ان دونوں بھائیوں نے یہ احسان عظیم سمجھا اور تاحیات ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات رہے۔ ان کی اولاد بھی آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

دونوں بھائی مجھے تھانہ موچھ چھوڑ کر الوداع ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں ازحد پریشان ہوا۔ تھانہ کا ماحول عجیب ویران سا لگ رہا تھا۔ تھانہ کے صحن میں کوڑا کرکٹ اور گند پھیلا ہوا تھا۔ صرف محرر اور نائب محرر تھانہ میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تھانہ کیا یتیم خانہ لگ رہا تھا۔ محرر تھانہ سے بقایا سٹاف تھانہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ وہ مختلف

ڈیوٹیوں کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔میں نے روزنامچہ چیک کیا تو ایسے لگا کہ جیسے سب ملازم تھانہ سے روانگی کی فرضی رپورٹیں کر کے غائب ہیں۔میں نے محرر سے تھانہ کی صورت حال پوچھی تو اس نے خوفزدہ چہرے سے جواب دیا کہ سر جی! اس تھانہ کی حالت بہت خراب ہے۔پولیس ملازمین کی کوئی عزت نہیں ہے۔غنڈہ قسم کے لوگ ناجائز اسلحہ لے کر تھانہ کے اندر آ جاتے ہیں۔ اور اسے کہتے ہیں کہ ''او منشی میڈی رائفل وچ پھلتھر و مار ڈے۔ نال اینکوں تیل وی ڈے ڈے''۔یہ خوف کے مارے ان کو ناجائز اسلحہ صاف کر کے دے دیتے ہیں۔میں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو کہنے لگا کہ اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو رات کو ہوائی فائرنگ کر کے گولیاں تھانہ کے اوپر سے گزارتے ہیں۔میں نے اسے حکم دیا کہ تھانہ کا سٹاف جہاں کہیں بھی ڈیوٹی پر گیا ہے انہیں واپس بلائیں۔کل دو بجے دن میں سب کی حاضری لوں گا۔

دوسرے روز دو بجے دن تھانہ کا جملہ سٹاف حاضر ہو گیا جو دو اے ایس آئی ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دس کانسٹیبلان پر مشتمل تھا۔تھانہ کا مین گیٹ بند کرا کر میں نے ان کو تھانہ کے برآمدہ میں فالن کیا اور کہا کہ جو ملازم اس علاقہ کے غنڈہ عناصر سے خوف زدہ ہیں اور اس تھانہ میں نہیں رہنا چاہتے وہ ایک قدم آگے آ جائیں۔تین بار کہنے کے باوجود کوئی ملازم آگے نہ آیا۔اس پر میں نے کہا کہ آپ اگر تھانہ موچھ میں رہنا چاہتے ہیں تو شیروں کی طرح رہنا ہوگا۔جو گیدڑ ہیں وہ تھانہ سے بھاگ جائیں۔ان میں سے ایک اے ایس آئی جس کا نام ظفر اللہ تھا کہنے لگا کہ سر جی! ہم گیدڑ نہیں ہیں ہمیں تو افسران نے گیدڑ بنایا ہوا ہے۔جب اس علاقہ کے غنڈے تھانہ کے سامنے سے اسلحہ ناجائز لہراتے ہوئے گزرتے ہیں تو دیکھ کر ان کا خون کھول جاتا ہے۔دو تین مرتبہ مزاحمت کرنے پر افسران نے ان کی کوئی امداد نہیں کی۔تمام ملازمین نے ظفر اللہ اے ایس آئی کی بات کی تائید کی۔میں نے تمام ملازمین کو کہا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔اگر تھانہ موچھ میں رہنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے باعزت اور باوقار طریقہ سے رہنا ہے۔سب ملازمین نے میری بات پر لبیک کہا۔ملازمین کا جوش و جذبہ دیکھ کر میں نے کہا کہ ہر ریڈ میں میں آپ کے آگے ہوں گا۔ان میں سے چند ملازم بولے نہیں سر جی ہماری چھاتیاں آپ کے آگے ہوں گی۔ملازمین کا جوش اور ولولہ اور آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ انتہائی قابل اعتماد اور بہادر جوان ہیں۔ان کو صرف اچھے کمانڈر کی ضرورت ہے۔

میں نے چند ملازمین کے انٹرویو لیے اور ان سے علاقہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملازمین ہر ایکشن میں مکمل ساتھ دیں گے۔ میں نے دونوں اے ایس آئی علیحدہ اپنے دفتر میں بلا لیے اور ان سے کہا کہ موچھ کے علاقہ میں سب سے بڑا بدمعاشی کا اڈا بتائیں تاکہ سب سے پہلے وہاں ریڈ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ قصبہ موچھ کے بس سٹینڈ پر تین ہوٹل ہیں۔ قصبہ موچھ کے بدمعاش اور غنڈے شام کو ان ہوٹلوں پر اسلحہ ناجائز سے مسلح ہو کر بیٹھتے ہیں اور رات گئے تک وہاں گپیں لگاتے ہیں۔ میں نے کہا سب سے پہلے اس جگہ پر ریڈ کرتے ہیں۔ ظفر اللہ اے ایس آئی بولا کہ سر جی! مزاحمت ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا اس سے پہلے کبھی اس جگہ ریڈ ہوا ہے۔ اس نے بتلایا کہ آٹھ سال قبل راجہ قربان حسین سب انسپکٹر انچارج تھانہ نے اس مقام پر ریڈ کیا تھا۔ آگے سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور ریڈ ناکام ہو گیا تھا۔ کامیابی کیلئے رسک لینا پڑتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلا ریڈ اسی جگہ پر کیا جائے گا ''آر یا پار''۔ دوسرے روز میں سید ھا میانوالی گیا۔ خواجہ محمد طفیل ہمارے ایس پی تھے جو انتہائی دیانتدار، دلیر اور وضعدار شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ایس پی صاحب کے پیش ہو کر موچھ بس اسٹینڈ پر رسکی ریڈ کرنے کی تفصیل سے آگاہ کیا جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور حوصلہ بڑھایا اور پنجابی میں کہا ''او پتر جاتے ایناں دی بدمعاشی ختم کر دے''۔ سیدھا تھانے پہنچا۔ شام کو تمام عملہ اکٹھا کیا۔ ان کو اچھی طرح سے بریف کیا اور ثابت قدمی کا عہد لیا۔ آدھے عملہ کو اسلحہ تقسیم کیا اور بقایا کو لاٹھیاں تقسیم کر کے ہدایت کی کہ اگر کوئی بدمعاش پولیس پر فائرنگ کرے تو جوابی موثر کارروائی کرنی ہے۔ بریفنگ کے بعد تمام ملازمین میں، میں نے ایک نیا جذبہ، جوش اور ولولہ دیکھا اور ان کے حوصلے بہت بلند پائے۔ ''نصر من الله وفتح قریب'' پڑھ کر ٹھیک آٹھ بجے رات تمام ملازمین ایک بس میں سوار ہو کے بس اسٹینڈ پر پہنچے اور یک لخت تینوں ہوٹلوں پر کمانڈو ایکشن کیا اور وہاں سے ایک درجن بلا لائسنس اسلحہ سے مسلح بدقماش اشخاص کو پکڑا۔ ان کو فوراً بس میں سوار کیا اور تھانے پہنچ گئے۔ تمام کے خلاف مقدمات درج کر کے تھانہ کی حوالات میں بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ کچھ بدمعاش تھانہ پر حملہ کر کے گرفتار شدہ اشخاص کو پولیس حراست سے چھڑانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے چار مسلح کانسٹیبلان کو تھانہ کی چھت پر کھڑا کر دیا۔ ایک اے ایس آئی اور چار مسلح کانسٹیبلان کو تھانہ کے مین گیٹ کے باہر کھڑا کر دیا اور ہدایت کی کہ اگر کوئی بدمعاش تھانہ پر حملہ کر کے گرفتار شدہ ملزمان کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو حالات کے مطابق ہر انتہائی قدم اٹھا کر موثر کارروائی کرنی ہے۔ جان بدمعاش کو بھی پیاری

ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کسی کو تھانہ کی طرف آنے کی جرات نہ ہوئی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے روز تمام ملزمان کو ہتھکڑیاں لگا کر بس میں سوار کیا۔ میں نے مناسب مسلح گارڈ ہمراہ لی۔ میانوالی پہنچ کر مجسٹریٹ کے پیش کر کے ریمانڈ جوڈیشل حاصل کر کے ملزمان کو جیل بھیج دیا۔

اس کامیاب ریڈ کی خبر قصبہ موچھ اور علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دوسرے روز قصبہ موچھ کے چند معززین کا ایک وفد میرے پاس آیا، جنہوں نے پولیس کی اس کارروائی کو سراہا اور اس سلسلہ میں مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ اس سے ہمارے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں علاقہ کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ خواجہ محمد طفیل ایس پی نے میٹنگ میں کہا کہ اب مجھے تھانہ موچھ کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ تقریباً ایک سال کی تعیناتی باعزت اور باوقار طریقہ سے گزر گئی اور پھر میرا تبادلہ تھانہ پیلاں کر دیا گیا۔ تین ماہ کے بعد ضلع فیصل آباد تبادلہ ہو گیا۔ فیصل آباد کے ایس ایس پی غلام اصغر ملک تھے۔ میں ان کے پیش ہوا۔ انہوں نے تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقہ کا ایک اندھا قتل بطور ٹیسٹ ٹریس کرنے کا ٹارگٹ دیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے اندھا قتل ٹریس کر لیا۔ اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ علیحدہ کیا گیا ہے۔ ایس ایس پی نے مجھے انچارج تھانہ گوجرہ تعینات کر دیا۔

ترقی بعہدہ انسپکٹر

1976ء میں بطور انسپکٹر ترقی یاب ہوا۔ میرا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔ چھوڑنے کیلئے میاں اختر حیات رانجھہ میرے ساتھ آئے۔ راولپنڈی میں میری کوئی واقفیت نہ تھی۔ صدر بازار کے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کرایا۔ سامان کمرہ میں رکھا۔ میاں صاحب واپس سرگودھا آ گئے۔ میں نے رات ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے روز وردی پہن کر ڈی آئی جی صاحب کے دفتر پہنچا تو آفس سپرنٹنڈنٹ نے بتلایا کہ ابھی ابھی ٹی پی میسج آیا ہے کہ آپ کا تبادلہ واپس فیصل آباد ہو گیا ہے۔ مجھے یہ خبر سن کر انتہائی خوشی ہوئی۔ میں واپس فیصل آباد پہنچ گیا۔

تعیناتی تھانہ گلبرگ فیصل آباد

چند روز بعد میری تعیناتی بطور انچارج تھانہ گلبرک ہو گئی۔ میں نے تھانہ گلبرگ کا چارج لیا۔ اس وقت تھانہ گلشن کالونی میں تھا جہاں ملک اللہ دتہ نے عمارت تھانہ کیلئے کرایہ پر دی ہوئی تھی۔

اس تھانہ والی عمارت کے ملحقہ دوسری عمارت بھی ملک اللہ دتہ کی تھی جس میں انہوں نے دفتر بنایا ہوا تھا۔ وہ سیمنٹ بجری کا کاروبار کرتے تھے۔ میں نے عارضی طور پر اس دفتر کے ایک کمرہ میں رہائش رکھ لی۔ ملک اللہ دتہ سے واقفیت ہوگئی جو مجھے انتہائی معقول اور مخلص شخص نظر آیا۔ اس کے ساتھ دن بدن تعلقات بہتر سے بہتر بنتے گئے۔ اس دوران میں نے غلام محمد آباد کے علاقہ چوہڑ ماجرا میں رانا محمد عبداللہ سے گھر کرایہ پر لے لیا اور وہاں بال بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر ہوا۔ بعد ازاں غلام محمد آباد موڑ قبرستان کے سامنے ایک مکان کرایہ پر لے کر تھانہ گلبرگ اسی میں شفٹ کر لیا۔ یہ بھی گلشن کالونی کا علاقہ ہے لیکن مین روڈ پر تھا۔ تھانہ گلبرگ کی تعیناتی کے دوران قومی اتحاد (9 ستارے) اور پیپلز پارٹی کے درمیان الیکشن ہوئے۔ یہ الیکشن اگرچہ پیپلز پارٹی نے جیت لیا لیکن دھاندلی ثابت ہونے پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف قومی اتحاد نے تحریک شروع کر دی۔ یہ تحریک دن بدن زور پکڑتی گئی۔ بالآخر جب ملکی حالات انتہائی مخدوش ہو گئے تو اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء لگاتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ محمود علی قصوری کے قتل کے الزام میں ذوالفقار بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا۔ عدالتی کارروائی ہوتی رہی بالآخر بھٹو کو سزائے موت سنا دی گئی۔ بعد میں اپیلیں بھی نامنظور ہوئیں۔ اور مورخہ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

تبادلہ سرکل آفیسر کمالیہ

1977ء میں میرا تبادلہ بطور سب ڈویژنل پولیس آفیسر کمالیہ ہو گیا۔ ان دنوں کمالیہ ضلع فیصل آباد کی سب تحصیل تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ علیحدہ ضلع بننے پر اب ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کا تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ کمالیہ دریائے راوی کے قریب کافی پرانا قصبہ ہے۔ اس دور میں نواب برکت علی خان کھرل، امداد حسین خان کھرل، نوازش علی خان کھرل، سردار الطاف حسین گوجر اور پیر برکت علی شاہ کمالیہ کے علاقہ کی مشہور شخصیتیں تھیں۔ سب ڈویژن میں تھانہ کمالیہ کے علاوہ تھانہ ماموں کانجن اور تھانہ رجانہ بھی شامل تھے۔ تھانہ رجانہ کے علاقہ کی اچھی شخصیت محمد مراد خان گادھی اور تھانہ ماموں کانجن کے علاقہ میں حاجی دین محمد اور چوہدری محمد سلیم کا شمار بھی اچھے شریف لوگوں میں ہوتا تھا۔

تبادلہ تھانہ پیپلز کالونی فیصل آباد

1979ء میں پیپلز کالونی فیصل آباد کے علاقہ میں ڈاکہ زنی اور چوری کی وارداتیں بڑھ جانے پر مجھے انچارج تھانہ پیپلز کالونی تعینات کر دیا گیا۔اس علاقہ میں ڈاکہ زنی، چوری کے علاوہ منشیات کی فروخت عروج پر تھی۔ چند بدنام اڈوں پر ریڈ کر کے منشیات فروشوں کو گرفتار کرنے پر ایک ہفتہ کے اندر اس لعنت پر تو کنٹرول پا لیا، لیکن رات دن گشت کرنے کے باوجود ڈاکہ زنی اور چوری کی وارداتوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ رات بھر خود اور تمام عملہ کی گشت کے باوجود بھی دو تین وارداتیں ہو جاتیں۔ مقامی اور گردونواح کے بدرویہ گان اور مشکوک اشخاص کی بھی مکمل طور پر پڑتال کی لیکن بجائے اس کے کہ وارداتوں میں کمی آ جائے دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر میری اور عملہ کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔تقریباً تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ بالآخر ہماری محنت رنگ لائی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ایک روز میں سوزوکی پک اپ پر جھال خانوانہ سے پل خالصہ کالج کی طرف نہر کی پٹڑی پر جا رہا تھا۔گرمی کا موسم تھا۔ پل خالصہ کالج کے قریب دو اشخاص نہر میں نہا کر پٹڑی پر کھڑے کپڑے پہن رہے تھے۔ مشکوک جان کر ان کو چیک کیا تو ایک کے پاس سے کاربین اور دوسرے کے پاس سے پسٹل برآمد ہوا۔دونوں نے ابتداء میں اپنے نام و پتے غلط بتلائے لیکن علیحدہ علیحدہ انٹیروگیشن پر معلوم ہوا کہ ایک مغل پورہ لاہور کا رہائشی ہے جس کا نام محمد شریف ہے اور دوسرا بورے والا کا رہائشی ہے۔ دونوں کے مکمل کوائف معلوم کر کے ان کے سکونتی تھانہ جات سے پڑتال کرایا تو معلوم ہوا کہ دونوں متعدد بار چوریوں اور ڈکیتی کی وارداتوں میں چالان ہو چکے ہیں اور ان کے خلاف مقدمات زیر سماعت عدالت ہیں لیکن عدالتوں سے غیر حاضر ہیں۔ جب ان کے سابقہ ریکارڈ کا پتہ چلا تو ان سے مکمل انٹیروگیشن کی گئی۔انہوں نے انکشاف کیا کہ شمس آباد میں ایک گھر کرایہ پر لیا ہوا ہے اور کچھ عرصہ چھ ماہ سے فیصل آباد کے علاقہ پیپلز کالونی میں وارداتیں کر رہے ہیں۔انہوں نے اپنے چار دیگر ساتھیوں کے نام و پتے بھی بتلائے جن کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ قصہ مختصر علاقہ تھانہ پیپلز کالونی کی تقریباً تمام وارداتیں ٹریس ہو گئیں۔اس گینگ سے مسروقہ سامان برآمد کر کے چالان کر دیا۔اس کے بعد اس علاقہ میں چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں مکمل طور پر بند ہو گئیں اور دن رات کی محنت رنگ لائی۔ ایک سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

تو محنت کرتے محنت دا صلہ جانے خدا جانے
تو ڈیوا بال کے رکھ چا ہوا جانے خدا جانے

یعقوب مسیح کے ساتھ پولیس مقابلہ

1980ء میں جوڈیشل حوالات توڑ کر فرار ہونے والے یعقوب مسیح نے شہر فیصل آباد میں خوف وہراس پھیلا دیا۔ روزانہ ڈاکہ کی وارداتیں کرنے لگا۔ اس کا حوصلہ اس حد تک بڑھ گیا۔ کہ ایک دن ایک کپڑے کی دکان سے پانچ ہزار روپے کا کپڑا خرید کیا۔ جب دکان کے مالک نے بل کی رقم مانگی تو اس پر پستول سے فائر کر کے قتل کر دیا۔ اس واردات کے بعد یعقوب مسیح پولیس کیلئے چیلنج بن گیا۔ میں نے اپنے تھانہ سے اچھے ملازمین کا ایک سکواڈ تیار کیا۔ اور یعقوب مسیح کی گرفتاری کیلئے اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ عبداللہ پور محلّہ میں پل طارق آباد کے نیچے اس کو مخبر کی اطلاع پر گھیرے میں لے لیا گیا۔ یعقوب مسیح اور اس کے دو ساتھیوں نے پولیس پارٹی پر فائرنگ شروع کر دی۔ ہم نے بھی جوابی فائرنگ کی جس سے یعقوب مسیح فائر لگنے سے زخمی ہو کر گر پڑا اور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ یعقوب مسیح کے پولیس مقابلہ میں مارے جانے پر فیصل آباد کے شہریوں نے جشن منائے اور سکھ کا سانس لیا۔ اسی کارروائی میں میرے ایک گن مین محمد نذیر گوندل نے مرکزی کردار ادا کیا۔

تبادلہ ضلع گوجرانوالہ

1980ء میں مجھے ضلع فیصل آباد سے گوجرانوالہ بطور انسپکٹر سی آئی اے تبدیل کر دیا گیا۔ سی آئی اے میں تعیناتی کے دوران میرے نیک سیرت اور ضعیف والد محترم ایک ناہنجار ظالم اور سفاک اشتہاری مجرم کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کو راقم الحروف نے تفصیل کے ساتھ علیحدہ بیان کیا ہے جو اس کتاب کے انڈکس میں دیکھ کر اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ قصہ ایک بدنام زمانہ ڈاکو اور اجرتی قاتل کا ہے جو اپنے علاقہ کے ایس ایچ او سے مل کر علاقہ میں دندناتا پھرتا تھا جب کہ وہ اشتہاری مجرم تھا اور اس نے علاقہ کے لوگوں کا سکھ چین چھین رکھا تھا۔ اگر ہمارے محکمہ کے اندر سے کالی بھیڑیں جرائم پیشہ اشخاص سے ملی بھگت کر کے ان کا ساتھ نہ دیں تو وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔



یعقوب مسیح کا پولیس کے ساتھ مقابلہ

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغبان ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

ایڈیشنل چارج

سی آئی اے میں تعیناتی کے دوران غلام حسین قریشی ڈی ایس پی سٹی دو ماہ کی رخصت پر چلے گئے۔ مجھے ان کی جگہ ایڈیشنل چارج دیا گیا۔ ایک روز میں تھانہ سٹی میں ایس ایچ او کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا رخ تھانہ کے صدر دروازہ کی طرف تھا۔ دو کانسٹیبلان ایک شخص کو ہتھکڑی لگائے ہوئے لائے اور محرر کو کہا کہ اس کو حوالات میں بند کرنا ہے۔ محرر تھانہ چابی سے حوالات کے گیٹ کا تالا کھولنے لگا تو میں نے آواز دے کر بلایا اور دریافت کیا کہ یہ ملزم کون ہے اور کہاں سے لائے ہیں؟ اس نے بتلایا کہ تھانہ سبزی منڈی کے ملازمین نے بتلایا ہے کہ اس ملزم سے پستول برآمد ہوا ہے۔ تھانہ سبزی منڈی میں حوالات نہ ہونے کی وجہ سے اس کو یہاں بند کرنے کے لیے لائے ہیں۔ مزید بتلایا کہ اس کے خلاف مقدمہ درج ہو چکا ہے۔ اس کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیجنا ہے۔ میں نے ملزم کو اپنے پاس بلوایا۔ ملازمین کو کمرہ سے باہر نکال کر ملزم سے پوچھا تم کون ہو اور یہ پستول جو تم سے برآمد ہوا ہے کہاں سے حاصل کیا ہے اور کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس کے لڑکھڑاتے ہوئے جواب سے میں مطمئن نہ ہو سکا، بلکہ وہ اپنی غلط بیانی کی وجہ سے انتہائی مشکوک لگا۔ میں نے باریک بینی اور صحیح طریقہ سے انٹیروگیشن کی تو اس نے انکشاف کیا کہ دو پسٹل اور دو سٹین گنیں ایک ہفتہ قبل باڑہ سے خرید کر لائے تھے۔ تین دیگر ہمراہی ملزمان کا نام لیتے ہوئے بتلایا کہ انہوں نے گوجرانوالہ جیل سے کچہری لے جاتے ہوئے پولیس کی حراست سے حامدی بٹ ملزم کو فرار کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور فیصلہ کیا تھا کہ اس کو حراست سے چھڑانے کیلئے جو پولیس ملازمین ان کے راستہ میں حائل ہوں گے ان کو فائرنگ کر کے اڑا دیا جائے گا۔ حامدی بٹ گوجرانوالہ کا ایک انتہائی خطرناک اور جان پر کھیل جانے والا بدکردار شخص تھا جو ایک قتل کے مقدمہ میں جیل میں تھا۔ اس شخص نے مزید انٹیروگیشن پر بتلایا کہ وہ بارہ عدد ہینڈ گرینیڈ بھی لائے تھے جو ایک شخص للو کے گھر پڑے ہوئے ہیں۔ حامدی بٹ کو دوڑا کر آئندہ انہوں نے جمعہ کے روز ربوہ ضلع جھنگ میں مرزائیوں کی مرکزی مسجد میں جمعہ کی نماز کے وقت فائرنگ اور ہینڈ گرینیڈ پھینک کر مسجد کو تباہ اور مرزائی نمازیوں کو ہلاک کرنا تھا۔ یہ آج للو ملزم کے پاس پروگرام کو حتمی شکل

دینے جا رہا تھا کہ پکڑا گیا۔

قارئین اب آپ اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ پولیس افسر جس نے اسے بمعہ پستول پکڑا تھا اس نے کس قدر لاپرواہی سے تفتیش کی کہ ملزم کو معمولی جرم میں جیل بھیجا جا رہا تھا جہاں سے دو روز کے بعد ضمانت پر آ کر وہ اپنے اس طے شدہ منصوبہ پر عمل کرتا۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتا تو نہ جانے کتنے پولیس ملازمین کی قیمتی جانیں ضائع ہوتیں اور ربوہ کے واقعہ سے کس قدر تباہی پھیل سکتی تھی۔ یہ صرف ایک واقعہ میں نے بیان کیا ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ پولیس نے گشت کے دوران کئی خطرناک گروہ کے ممبران پکڑے لیکن صحیح طریقہ سے انٹیروگیشن نہ ہونے کی وجہ سے وہ بغیر انکشاف کیے پولیس کے ہاتھوں سے بچ نکلے۔

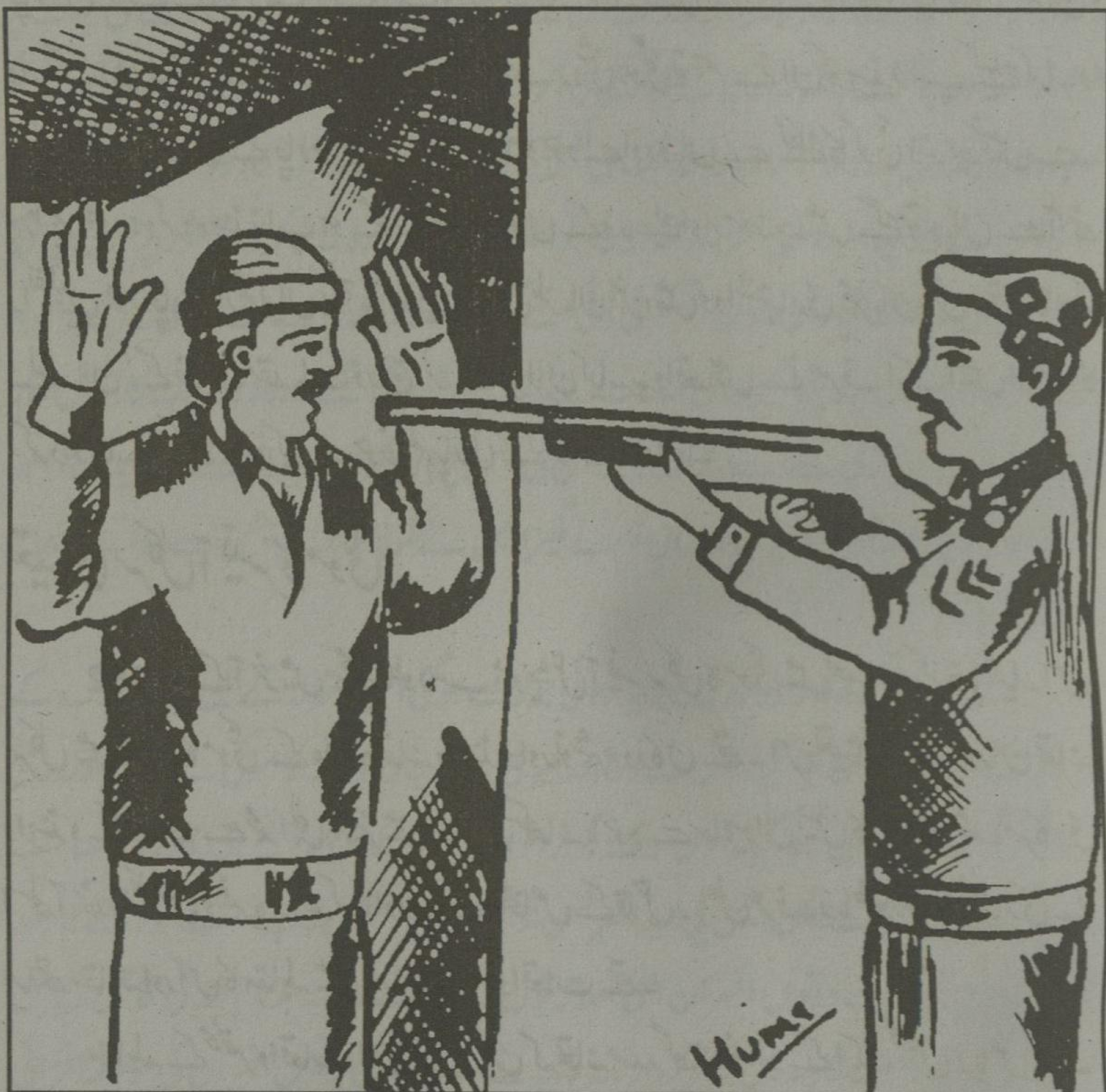
موضع دورٹی میں ریڈ

قارئین کی اطلاع کیلئے ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتا چلوں۔ تھانہ سکھیکی ضلع گوجرانوالہ میں موضع دورٹی میں ایک ہی خاندان کے چھ اشخاص قتل کر دیئے گئے۔ مقامی پولیس نے ملزمان کو گرفتار کر کے چالان عدالت میں دے دیا۔ دوران سماعت جب عدالت نے گواہان کو طلب کیا تو ملزم پارٹی کے اشخاص نے مدعی پارٹی پر آئے دن ہوائی فائرنگ شروع کر دی اور گواہان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ میجر مشتاق احمد ان دنوں ضلع گوجرانوالہ کے ایس ایس پی تھے جو انتہائی دلیر اور سٹرانگ پولیس افسر تھے۔ مظلوم مدعی پارٹی کے لوگوں نے ان کے پاس پیش ہو کر حالات بتلائے۔ صاحب موصوف نے ایس ایچ او کو حکم دیا کہ واقعات کا پتہ کر کے بتلائے۔ ایس ایچ او نے ایس ایس پی صاحب کو بتلایا کہ مدعی فریق خواہ مخواہ شور کر رہا ہے ان کو کوئی تنگ نہیں کرتا۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر وہ لوگ پیش ہوئے تو ایس ایچ او نے پھر بھی وہی حالات ایس ایس پی کو بتلائے۔ جب تیسری مرتبہ وہ لوگ معہ اپنی عورتوں کے گوجرانوالہ آ کر ایس ایس پی صاحب کے پیش ہوئے اور چیخ پکار شروع کی تو ان کو شک ہوا کہ غالباً ایس ایچ او تھانہ سکھیکی ان سے صحیح حالات چھپا رہا ہے۔ جناب میجر صاحب نے مجھے ٹیلی فون پر بلا کر حکم دیا کہ "ان لوگوں کی بات سنیں اور پھر میرے ساتھ ڈسکس کریں"۔ میں نے ان لوگوں کی بات سنی۔ مجھے وہ لوگ سچے اور مظلوم معلوم ہوئے۔ میں نے ایس ایس پی صاحب کو بتلایا کہ مجھے یہ لوگ سچے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ آپ سی آئی اے کی نفری لے کر ان کے مخالف فریق پر ریڈ کریں۔ میں نے ان میں سے

ایک سمجھدار آدمی کو اپنے ہمراہ لیا اور باقی مرد اور عورتوں کو کہا کہ واپس اپنے گاؤں چلے جائیں اور وہاں جا کر یہ تاثر دیں کہ ایس ایس پی صاحب کو ملنے گئے تھے لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔ اور ان کی کوئی شنوائی نہیں ہو رہی ہے تاکہ دوسرا فریق چوکنا نہ ہو جائے۔

ان کے آدمی کو ہمراہ لے کر میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر راہوالی گیا۔ دس بجے رات دو گاڑیوں میں ملازمین کو بٹھا کر حافظ آباد کیلئے روانہ ہوا۔ حافظ آباد سے سی آئی اے کی چوکی سے بھی ملازمین کو تیار کیا جس جگہ ریڈ کرنا تھا۔ وہ حافظ آباد سے ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ ایک بجے رات میں نے ایس ایچ او تھانہ سکھیکی سرفراز احمد کو ٹیلی فون کیا کہ آپ حافظ آباد سی آئی اے ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں۔ اس نے مجھ سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دانستہ ان سے چھپائے رکھا اور باقی ملازمین بھی بے خبر تھے کہ کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ دو بجے رات ایس ایچ او تھانہ سکھیکی پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے پر ہم فوری طور پر روانہ ہوئے۔ میں نے جس آدمی کو ہمراہ لیا تھا اس سے مکمل آگاہی حاصل کر لی تھی۔

اس نے مجھے بتلایا تھا کہ جن لوگوں پر ریڈ کرنا ہے وہ باہر ڈیرہ پر رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے مکان کی چھت پر مورچہ بنایا ہوا ہے۔ رات کو تمام لوگ اس مورچہ میں ہوتے ہیں اور ان کے پاس بھاری مقدار میں اسلحہ ہوتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اس ڈیرہ کی نشاندہی کر کے خود وہاں سے چلا جائے۔ جس جگہ ریڈ کرنا تھا وہاں سے دو میل دور میں نے گاڑیاں رکوا دیں کیونکہ اندیشہ تھا کہ گاڑیوں کی لائٹ دور سے دیکھ کر وہ لوگ چوکنا ہو سکتے ہیں۔ دو میل کے فاصلہ سے پیدل چل پڑے۔ جب ایک میل کا سفر باقی رہ گیا تو میں نے تمام ملازمین کو اکٹھا کیا اور ان کو بریف کیا اور ڈیوٹیاں لگائیں کہ کس سمت پر کون کھڑا ہوگا۔ رائفلیں لوڈ کروا کر مناسب ہدایات دیں۔ آٹھ ملازمین کا ایک دستہ میں نے اپنے ہمراہ لے لیا۔ اس مقام پر جس جگہ ریڈ کرنا تھا اس کی تفصیل بتلا دی۔ ایس ایچ او سکھیکی مجھے کہنے لگا کہ سر جی یہ بات مجھے حافظ آباد بتا دیتے تو خواہ مخواہ ہم لوگ اتنا سفر نہ کرتے۔ جن لوگوں کی شکایت پر آپ ریڈ کر رہے ہیں وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ محض دشمنی کی بنا پر اپنے مخالف فریق کو پولیس کے ہاتھ ذلیل کروانا چاہتے ہیں۔ مزید بتلایا کہ اس نے دو مرتبہ ایس ایس پی صاحب کے کہنے پر اس جگہ کی تلاشی لی ہے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں اب پہنچ گئے ہیں ریڈ کر ہی لیتے ہیں۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی کہ ہم نے مذکورہ شخص کی نشاندہی پر ڈیرہ کو گھیرا میں لے لیا اور آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مورچہ میں جو لوگ



موضع دورٹی میں ریڈ

بیٹھے تھے وہ کتا بھونکنے کی آواز پر ہوشیار ہو گئے اور زور سے آواز دی کہ کون ہو؟ ساتھ ہی ان کی رائفلوں کے لوڈ ہونے کی اور بلٹ کھڑکنے کی آوازیں آئیں۔ ہمارے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل حاجی محمد اسلم تھا۔ وہ ان کا اچھی طرح واقف کار تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ ان کو آواز دے کر کہو کہ پولیس نے آپ کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ اگر پولیس پارٹی پر فائر کرنے کی کوشش کرو گے تو چاروں طرف سے فائرنگ کر کے آپ کو اڑا دیا جائے گا۔ حاجی محمد اسلم نے زوردار آواز سے ان کو وارننگ دی کہ ہم نے گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔ جب روشنی ہو گئی تو ہم نے ان کو ہینڈز اپ کیلئے کہا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کے چاروں طرف پولیس موجود ہے اور وہاں سے نکلنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہ ہینڈز اپ ہو گئے۔ ہم سیڑھیوں کے ذریعے اوپر مورچہ میں گئے تو وہاں سے آٹھ رائفلیں اور چار ہزار گولیاں برآمد ہوئیں۔ دس ملزمان جن میں دو اشتہاری مجرمان بھی تھے، قابو کر لیے۔ ان کے خلاف مقدمات درج کر کے چالان کیا۔ یہ واقعہ میں نے صرف ایک ایس ایچ او کا کردار بتانے کیلئے بیان کیا ہے جو ظالم پارٹی کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

تعیناتی سرکل آفیسر کامونکی

1982ء کے آخر میں مجھے بطور سب ڈویژنل آفیسر سرکل کامونکی میں تعینات کر دیا گیا۔ اس سرکل میں تھانہ کامونکی کے علاوہ تھانہ واہنڈو اور نوشہرہ ورکاں تھے۔ اس تعیناتی کے دوران تھانہ واہنڈو کے علاقہ سے محمد الٰہی چیئرمین ساکن سکھانہ باجوہ سے ساہیوال جیل کا چوری شدہ سرکاری اسلحہ آٹھ رائفلیں وغیرہ برآمد کرنا اور سات اشخاص کے قاتل ریاض عرف ریاضو مجرم اشتہاری کے ساتھ مقابلہ اور اس کا مقابلہ میں مارا جانا اہم واقعات تھے۔

مقابلہ کے مختصر واقعات اس طرح ہیں کہ تھانہ صدر گوجرانوالہ کے ایک شخص ریاض عرف ریاضو نے دشمنی کی بنا پر اپنے مخالف فریق کے سات آدمیوں کو قتل کیا۔ اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا جس میں وہ دانستہ طور پر روپوش رہا اور اشتہاری مجرم قرار دیا گیا۔ پولیس کی تگ و دو کے باوجود وہ گرفتار نہ ہو سکا اور علاقہ کے لوگوں کے لیے وہ دہشت اور خوف کی علامت بن گیا۔ سید اظہر حسن ندیم ان دنوں ضلع گوجرانوالہ کے ایس ایس پی تعینات ہوئے جنہوں نے اس مجرم اشتہاری کی گرفتاری کے لیے ہر ممکن اقدامات کئے۔ شاہ صاحب کے ایک Source نے انہیں بتلایا کہ ریاض عرف ریاضو نے گوجرانوالہ جیل میں مقید اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ شاہ

صاحب نے جیل کے افسران کے ذریعہ وہ خط ٹریس کرایا اور مجھے بلا کر خط میرے حوالہ کیا۔ خط کو میں نے بغور پڑھا اس میں کوئی واضح ایڈریس تو نہیں تھا لیکن کچھ اشارے ایسے ملے جن پر میں نے بھیس بدل کر کام کیا۔ آخر کار وہ جگہ ٹریس کر لی جہاں ان دنوں وہ رہائش پذیر تھا۔ اس جگہ کے آس پاس دور تک چاول کی فصل تھی جس میں پانی کھڑا تھا اس لئے وہاں پہنچنا انتہائی دشوار تھا۔ اس دشوار گزار راستہ سے گزر کر تین بجے رات اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک کوٹھے کی چھت پر لیٹا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز پر اس نے کوٹھے کی چھت سے چھلانگ لگائی اور دونالی بندوق سے فائر کرتا ہوا نزدیک ہی فصل کماد میں گھس گیا۔ فصل کماد کو گھیرے میں لے کر وائرلیس کے ذریعہ سید اظہر حسن ندیم SSP کو اطلاع دی جو گارڈ لے کر فوری طور پر موقع پر پہنچ گئے۔ میاں غلام محمد کلیاران دنوں انسپکٹر سی آئی اے گوجرانوالہ لگے ہوئے تھے وہ بھی میرے ہمراہ تھے۔ اسی اثنا میں پرویز اکبر لودھی صاحب اے ایس پی بھی پہنچ گئے۔ ہمارے ایک کانسٹیبل نثار احمد نے ذرا جلد بازی سے اسے پکڑنے کی کوشش کی جس پر اس مجرم اشتہاری نے فائر کیا۔ نثار احمد زخمی ہو کر گر پڑا اور شہید ہو گیا۔ بعد ازاں ہم نے گھیرا میں لے کر فائرنگ کی جس سے وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

اس تعیناتی کے دوران میری بچی پیدا ہوئی جو فوت ہو گئی اس کو تھانہ کے عقبی ایک بزرگ کے دربار کے ایریا میں دفن کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد میری بیوی بیمار ہو گئی۔ کامونکی سے میرا تبادلہ رینج کرائمز گوجرانوالہ میں ہو گیا۔ اس وقت گوجرانوالہ رینج کے ڈی آئی جی قادر حئی صاحب تھے۔ گوجرانوالہ ضلع کے ایس ایس پی سید اظہر حسن ندیم اور ڈپٹی کمشنر جناب شفقت محمود تھے جو بعد سینٹر اور وزیر بھی رہے دونوں افسران اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بدنام اجرتی قاتل ریاض عرف ریاضو کو پولیس مقابلہ میں کیفر کردار تک پہنچانے والے مستحق پولیس افسران کی حوصلہ افزائی میں انہوں نے بہت اعلیٰ کردار ادا کیا۔ شاہ صاحب حسن اخلاق، شرافت اور ایمانداری کی وجہ سے محکمہ پولیس میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ترقی بعہدہ ڈی ایس پی

1984ء میں، میں ڈی ایس پی کے عہدہ پر ترقی یاب ہو گیا اور میری تعیناتی بطور ڈی ایس پی چکوال ضلع جہلم ہو گئی۔ چکوال پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگ بڑے اچھے اور امن پسند ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ میں آرمی کے سروِنگ آفیسرز اور ریٹائرڈ افسروں کی بہتات ہے۔ دھن اریا کا کلچر مجھے بہت اچھا لگا۔

محمد طارق باجوہ وہاں اسسٹنٹ کمشنر تعینات تھے۔ وہ چوہدری محمد اسلم باجوہ ڈی آئی جی صاحب کے فرزند تھے۔ اسی نسبت سے وہ میری بہت عزت کرتے تھے۔ ہمارے باہمی تعاون سے بڑا خوشگوار ماحول بنا رہا۔ محرم الحرام کے مہینہ میں شیعہ سنی چپقلش زوروں پر ہو جاتی لیکن ہماری دونوں کی حکمت عملی سے ماہ محرم الحرام پر امن طریقہ سے گزر گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ سنی مسلک کے قاضی مظہر اور شیعہ مسلک کے کرنل محمد خان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ چکوال کے علاقہ میں تھانہ کلر کہار، تھانہ چوہا سیدن شاہ اور تھانہ نیلہ کا علاقہ انتہائی خوبصورت اور دلکش مناظر پیش کرتا ہے۔

1985ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں چکوال تحصیل کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ شمس الحسن مرزا ایس پی اور شیخ ظہور الحق ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے۔ چکوال کی پوسٹنگ بڑی اچھی تھی۔ لیکن میں بیوی کی مسلسل بیماری کی وجہ سے اکثر پریشان رہتا تھا۔ علاج کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ C.M.H راولپنڈی بریگیڈیئر مظفر صاحب سے علاج کراتا رہا۔ لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔

تعیناتی سرکل آفیسر نواں کوٹ لاہور

ستمبر 1985ء میں میرا تبادلہ بطور سب ڈویژنل پولیس آفیسر نواں کوٹ ضلع لاہور ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر چارج لے لیا۔ چوہدری احمد نسیم بطور ایس ایس پی لاہور تعینات تھے جن کا شمار پولیس فورس میں انتہائی اچھے افسران میں ہوتا ہے۔ رہائش کیلئے فلیٹ 6 سول لائن الاٹ کرا لیا۔ لاہور کے سینئر ڈاکٹروں سے بیوی کا علاج کروایا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر 2 دسمبر 1985ء کو بوقت عصر سر گنگا رام ہسپتال میں وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْن"۔ وہ ایک نیک خاتون تھیں۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے بعد میں پھر میں نے شادی کر لی۔

تعیناتی سی آئی اے چونا منڈی

اکرام اللہ خان نیازی ڈی ایس پی جو اس وقت سی آئی اے چونا منڈی تعینات تھے

دسمبر 1985ء میں ایک خطرناک اشتہاری مجرم کے ساتھ پولیس مقابلہ میں چھاتی پر فائر لگنے کی وجہ سے شہید ہو گئے۔

چنانچہ جنوری 1986ء کو مجھے ان کی جگہ ڈی ایس پی/سی آئی اے چونا منڈی تعینات کر دیا گیا۔ 1988ء میں رانا مقبول احمد ایس ایس پی نے مجھے حکم دیا کہ چونا منڈی کی عمارت جو حویلی دھیان سنگھ کی پرانی عمارت تھی کو خالی کر دیا جائے اور دہلی گیٹ کے سامنے تھانہ کوتوالی والی عمارت میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا جائے۔ میں نے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر نئی جگہ پر تبدیل کر لیا۔ چونا منڈی والی جگہ کو بعد ازاں نواز شریف گرلز کالج بنا دیا گیا۔

جولائی 1990ء میں مجھے سی آئی اے سے ڈی ایس پی سٹی تعینات کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد جولائی 1991ء میں مجھے پھر سی آئی اے کا انچارج لگا دیا گیا۔

سٹی ایریا میں تھانہ لوہاری، تھانہ موچی گیٹ، تھانہ اکبری، تھانہ یکی گیٹ، تھانہ مستی گیٹ، تھانہ ٹبی اور تھانہ بھاٹی گیٹ شامل تھے جن کا بطور سب ڈویژنل پولیس آفیسر سپروائزری رول میرے پاس تھا۔ یہ علاقہ اندرون شہر یعنی پرانی وال کے اندر کا علاقہ ہے۔ یہاں ایک مخصوص کلچر کے لوگ رہتے ہیں جن کا طرز زندگی انتہائی سادہ اور روایتی ہے۔ تنگ گلیاں اور پرانی طرز تعمیر کے دومنزلہ، سہ منزلہ مکانات جن کے دروازے اور بالکونیاں لکڑی کی ہیں جن میں اکثر پر خاص قسم کی چتر کاری کی گئی ہے پرانی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ دروازوں کے سامنے تھڑے بنے ہوئے ہیں جہاں صبح شام اہل خانہ بیٹھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پرانے مکانات چھوٹی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، مسجد وزیر خان اور حویلی دھیان سنگھ اہم تاریخی مقامات اسی علاقہ میں واقع ہیں۔ اس علاقے میں اب تک دھوتی کرتے کا عام رواج ہے۔ لوگ خاص لاہوری زبان بولتے ہیں۔ اس علاقہ کے لوگ خوش خوراک ہیں۔ دہی لسی، سری پائے، حلوہ پوڑی، گردے کپورے، نان چنے، اور کلچے یہاں کی مرغوب غذائیں ہیں۔ اندرون شہر کے باسی فراخدل اور مہمان نواز ہیں۔ اشیائے خوردونوش کے لیے اکبری منڈی بہت مشہور ہے۔ اعظم مارکیٹ کپڑے کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ شاہ عالمی، سوہا بازار اور رنگ محل کو بھی خاص مقام حاصل ہے۔ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے نزدیک تھانہ ٹبی کے علاقہ میں شاہی محلہ کی اپنی ایک تاریخی داستان ہے۔ یہاں گانے بجانے، فحاشی اور عصمت فروشی کا دھندا ہوتا ہے۔ رات گئے تک طبلے کی تھاپ اور گھنگروں کی آواز گونجتی رہتی ہے۔

میری تعیناتی کے وقت اندروں شہر تھانہ ٹبی کے علاقہ میں شاہیا پہلوان اور تھانہ مستی کے علاقہ میں تھیلی پہلوان کے قمار بازی کے اڈے بہت بدنام تھے جو میں نے متعلقہ ایس ایچ اوز کو ہمراہ لے کر ذاتی طور پر ریڈ کئے۔ ان قمار بازوں کے خلاف کارروائی کر کے یہ اڈے بند کرائے۔ پولیس کے کچھ ملازمین جو محکمہ میں کالی بھیڑیں ہیں ان قمار بازوں سے ملے ہوتے تھے تو جو ریڈ کرنے کی تیاری کے وقت ان کو اطلاع کر دیتے تھے۔ اِس وجہ سے اکثر پولیس کا ریڈ ناکام ہو جاتا۔ لیکن میں اپنے افسران اور ملازمین کو کسی اور مقام پر ریڈ کرنے کے بہانے دور کسی مقام پر بلا لیتا تھا اور وہاں سے قابل اعتماد افسران کو صورت حال سے آگاہ کر کے فوراً ریڈ کرتا۔ تھا اس واسطے ریڈ کامیاب ہو جاتے۔

میری تعیناتی کے دوران جنرل الیکشن ہوئے۔ میاں شہباز شریف اندرونی شہر کے حلقہ سے بطور ممبر قومی اسمبلی امیدوار تھے۔ الیکشن مہم کے دوران تین بجے رات تک اپنے علاقہ میں پھر کر لوگوں کے مسائل حل کرتے اور صبح سات بجے پھر علاقہ میں آجاتے تھے۔ انتہائی ان تھک اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اندرون شہر کے انہوں نے کئی مسائل حل کئے۔ اندرون شہر تنگ گلیوں سے گھر گھر سوئی گیس پہنچانا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تھانہ موچی گیٹ کے علاقہ میں آتش بازی کی دکانیں کافی ہیں اور گوداموں میں آتش بازی کا کافی سامان رکھا جاتا ہے جو کسی وقت بھی ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے میں نے اپنی تعیناتی کے وقت اس کے متعلق ایک رپورٹ بھی بھجوائی تھی۔

ترقی بعہدہ ایس پی

1994ء میں بطور ایس پی میری ترقی ہو گئی اور مجھے ایس پی سی آئی اے تعینات کر دیا گیا۔ مجھ سے پہلے چوہدری حامد مختار گوندل ایس پی سی آئی تھے جو انتہائی محنتی اور فرض شناس پولیس افسر ہیں۔ جولائی 1997ء میں مجھے ایڈیشنل ایس پی ضلع رحیم یار خان تبدیل کر دیا گیا۔ لاہور سی آئی اے میں تعیناتی کے دوران عجیب عجیب واقعات پیش آئے۔ گورنر پنجاب، گورنر ہاؤس بلا کر ایک حکم دیتے تو وزیر اعلیٰ پنجاب، وزیر اعلیٰ ہاؤس بلا کر دوسرا حکم دیتے۔ اسی طرح سینئر منسٹر علیحدہ اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے۔ ان گنہگار آنکھوں نے عجیب عجیب تماشے دیکھے لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ناچیز بندہ ثابت قدم رہا جائز حکم کی تعمیل کرتا رہا اور ناجائز حکم پر معذرت خواہ رہا۔

خدا خوفی اور عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھا ناجائز حکم پر کانوں میں روئی ڈال لیتا اور جائز حکم پر لبیک کہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فتح ونصرت اور کامرانی سے ہمکنار کیا۔ بینک ڈکیتیاں اور سنگین مقدمات کے ٹریس کرنے پر مجھے وزیر اعلیٰ پنجاب اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کی طرف سے مختلف اوقات میں لاہور کی تعیناتی کے دوران پانچ لاکھ کے قریب نقد انعام دیا گیا۔ سرکاری خرچہ پر محکمہ پولیس کی طرف سے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے اور دوسری مرتبہ محکمہ کی طرف سے میاں بیوی کو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس میں جناب طارق مسعود کھوسہ جن کا شمار ایماندار اور قابل پولیس افسران میں ہوتا ہے کا تعاون شامل ہے۔

ہر مشکل چیلنج کو نیک نیتی اور محنت کے ساتھ احسن طریقہ سے نبھایا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ صحیح سمت پر چلایا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر مشکل کام میں کوئی غیبی طاقت میری راہنمائی کر رہی ہے اور مجھے صحیح سمت دکھا رہی ہے۔

ایس پی C.I.A کی تعیناتی کے دوران کئی کٹھن اور نازک مرحلے پیش آئے۔ کئی سنگین اور سنسنی خیز واقعات لاہور شہر میں رونما ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ہر قدم پر کامیابی نصیب ہوئی۔ اہم واقعات کا تذکرہ کتاب کے حصہ دوئم میں کیا گیا ہے۔

مورخہ 20 ستمبر 1996ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کا کراچی میں قتل ہوا جس کی تفتیش کے لیے ملک کی سطح پر ایک تفتیشی ٹیم تشکیل دی گئی جس کے لیے پنجاب پولیس کی طرف سے مجھے منتخب کیا گیا۔ اِس کی تفصیل حصہ سوئم میں بیان کی گئی ہے۔

فروری 1997ء میں، میں اور میاں غلام محمد کلیار جو اس وقت ایس پی حافظ آباد تعینات تھے اور جن کا شمار انصاف پسند، محنتی اور ایماندار پولیس افسران میں ہوتا ہے احتساب سیل جو سیف الرحمان خان کی سرکردگی میں بنایا گیا تھا کے ممبر منتخب ہوئے اور وزیر اعظم ہاؤس راولپنڈی میں سیف الرحمان کی سربراہی میں میٹنگ میں شامل ہوئے۔ کلیار صاحب اور میرے دونوں کے مزاج کے خلاف ٹاسک دیا گیا۔ لیکن جلد ہی ہماری اس ڈیوٹی سے خلاصی ہوگئی جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

تبادلہ ضلع رحیم یار خان

6 جولائی 1997ء کو میں اپنے دفتر C.I.A واقعہ قلعہ گوجر سنگھ میں حسب معمول اپنے دفتری کام میں مصروف تھا کہ دو بجے دن میرے ٹیلی فون آپریٹر نے کہا کہ ایس۔ پی ساہی صاحب کا

ٹیلی فون آیا ہے وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔میں نے ریسیور اٹھا کر السلام علیکم کہا تو فرمانے لگے ''بھائی جی میں ساہی بول رہیاں''۔ میں نے خیریت دریافت کی تو فرمانے لگے، ''خیریت کوئی نہیں میرا تبادلہ ہوگیا اے تے نال ہی تہاڈا وی تبادلہ ہوگیا اے''تبادلہ کی خبر سنتے ہی بے ساختہ میں نے ''الحمدللہ'' کہا''۔الحمدللہ تاں کہہ رہے ہو پر تبادلہ ضلع رحیم یار خان ہوگیا اے تے اوہ وی ایڈیشنل ''ایس پی'' ساہی صاحب نے کہا۔میرے منہ سے پھر نکلا''الحمدللہ'' ساہی صاحب تہاڈا تبادلہ کتھے ہویا اے؟میں نے دریافت کیا۔بولے''بیڑا غرق ہوگیا اے۔وزیر اعظم ہاؤس راولپنڈی ایس پی سیکورٹی''۔اس کے بعد تھوڑی دیر ہماری آپس میں رسمی گفتگو ہوئی۔تبادلے کی خبر سن کر نہ جانے میں اتنا خوش کیوں ہو رہا تھا حالانکہ تبادلہ اتنا دور دراز وہ بھی ایڈیشنل ایس پی۔ میری خوشی کی شاید وجہ یہ تھی کہ مسلسل گیارہ سال C.I.A لاہور میں تعینات رہ کر اکتا گیا تھا اور کام کی زیادتی اور دباؤ کے پیش نظر تھک چکا تھا۔میں نے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے دفتر ٹیلی فون کر کے رجسٹرار سے تبادلہ کی خبر کنفرم کی۔تبادلہ کی خبر پھیلنے پر دوستوں اور ساتھیوں کے ٹیلی فون آنے شروع ہوگئے۔ہر ایک کا یہ سوال تھا کہ آپ نے C.I.A میں اتنا کام کیا ہے تو اچانک آپ کا تبادلہ اتنی دور کیوں ہوا ہے اور پھر وہ بھی بطور ایڈیشنل ایس پی ہوا ہے۔میرے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ دانہ پانی کی بات ہے۔اور افسران بالا کی مرضی میں اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر شکر گزار تھا۔فوری طور پر فائلیں سمیٹیں اور اٹھ کر اپنے گھر سول لائن چلا گیا۔گھر پہنچ کر میں نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے تبادلہ کی خبر سنائی۔بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا کہ رحیم یار خان کتنا دور ہے۔میں نے بتلایا کہ صوبہ پنجاب کا آخری ضلع ہے۔وہاں سے آگے صوبہ سندھ شروع ہو جاتا ہے۔''تو پھر اتنی دور تبادلہ پر آپ مسکرا کیوں رہے ہیں''؟ میری بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔میں نے کہا کہ لاہور شہر میں 12 سال کا عرصہ ہوگیا ہے ملک کے دوسرے حصے بھی دیکھنے چاہئیں۔

دراصل میں کچھ دنوں سے اپنے تبادلہ کیلئے ذہنی طور پر تیار تھا،اور خواہش تھی کہ لاہور سے باہر جہاں چاہیں مجھے بھیج دیں۔اس کے کچھ محرکات تھے جن کا تذکرہ کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ان محرکات میں میرا ضمیر مطمئن تھا اور میں بالکل سچائی پر تھا۔اس وجہ سے روحانی قوت میرا ساتھ دے رہی تھی اور یہ تبادلہ مجھے محسوس تک نہیں ہو رہا تھا۔

دوسرے روز میرے تبادلہ کی خبر اخبارات میں چھپی تو جناب ذوالفقار احمد چیمہ

ایس۔ایس۔پی صاحب لاہور جو سخت ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر ہیں جن کی میں دلی طور پر قدر کرتا ہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ کیا اخبارات کی خبر درست ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہاں بالکل درست ہے۔ ''تبادلہ کیوں ہوا ہے''؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''جناب آپ ایس ایس پی ہیں آپ کو بہتر پتہ ہوگا'' میں نے جواب دیا۔ جناب چیمہ صاحب فرمانے لگے کہ میں پولیس لائن قلعہ گوجر سنگھ جا رہا ہوں آپ بھی وہاں پہنچ جائیں۔ وہاں سے اکٹھے آئی جی صاحب کے پاس جا کر ان سے بات کرتے ہیں''۔ میں نے چیمہ صاحب سے معذرت کی کہ میں جناب آئی جی صاحب کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ میرے تبادلے میں آئی جی جناب جہاں زیب برکی صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ چیمہ صاحب نے فرمایا جیسے آپ کی مرضی۔ برکی صاحب انتہائی محنتی، ان تھک اور پروفیشنل پولیس افسر تھے لیکن بدقسمتی سے کسی مہربان نے میرے خلاف ان کے کان بھر دیئے تھے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ بالآخر میں نے چارج چھوڑ دیا۔

؎ انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

میں 14 جولائی کو بصورت تبادلہ رحیم یار خان پہنچ گیا۔ اثنا راہ ایئر پورٹ پر جناب مشتاق احمد سکھیر ایس ایس پی رحیم یار خان سے ملاقات ہوگئی۔ ائیر پورٹ سے سیدھے ان کی رہائش گاہ پر گئے وہاں شام کا کھانا اکٹھے کھایا۔ ان سے ضروری ہدایات و معلومات لے کر پولیس ریسٹ ہاؤس آ گیا۔ رحیم یار خان کا پولیس ریسٹ ہاؤس اچھا خوبصورت بنا ہوا ہے۔ وہاں کرنل فرمان علی صاحب ٹھہرے ہوئے تھے جو آرمی سے پولیس میں بطور ایس ایس پی آئے تھے اور ابھی زیر تربیت تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ انتہائی خوش مزاج اور اچھے انسان تھے۔ ان کے ساتھ گپ شپ میں بہت اچھا وقت گزرنے لگا۔ بہاولپور رینج کے ڈی آئی جی ملک محمد اشرف صاحب تھے جو ہڈالی ضلع خوشاب کے رہنے والے تھے۔ انتہائی زیرک اور باریک بین افسر تھے۔ میں ان سے ملاقات کیلئے ان کے دفتر گیا تو فرمانے لگے کہ چوہدری صاحب آپ نے لاہور میں بہت کام کیا ہے آپ کا تبادلہ رحیم یار خان کیسے ہوگیا ہے؟ میں نے ان کے پاس بھی بات ''دانہ پانی'' میں ٹال دی۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے آفیسرز کالونی میں کوٹھی الاٹ کرالی۔ بیوی اور چھوٹی بیٹی مریم کو اپنے پاس بلا لیا۔ رحیم یار خان کا علاقہ انتہائی زرخیز اور

خوبصورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وقت بڑا اچھا گزرنے لگا۔ جب مہربانوں کو پتہ چلا کہ اس نے تبادلہ رکوانے کے لئے نہ تو کوئی ہاتھ پاؤں مارے ہیں نہ ہی منت سماجت اور سفارش کروائی ہے اور وہاں جا کر بھی یہ خوشی کے ساتھ سروس کر رہا ہے تو انہوں نے مجھے ذہنی اذیت دینے کیلئے دو ماہ کے بعد میرا تبادلہ ایڈیشنل ایس پی ڈیرہ غازیخان کر دیا۔

ڈیرہ غازیخان کو کالا پانی سمجھتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ اب یہ ضرور سفارشیں کروائے گا۔ میں نے 12 سال لاہور میں سروس کی تھی میرے پاس سفارشیں تو کافی تھیں لیکن میں اپنے تبادلے کے سلسلہ میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی تبادلوں کیلئے میں سفارش کا قائل نہیں ہوں۔ جہاں تعیناتی ہو جائے وہاں محنت اور لگن کے ساتھ ڈیوٹی سرانجام دینی چاہیے۔ میں نے اپنی تمام سروس میں تبادلہ کیلئے کبھی بھی سفارش نہیں کروائی تھی۔

کرنل فرمان علی صاحب کو میرے تبادلہ کی خبر پہنچی تو وہ میرے پاس آئے اور اظہار افسوس کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ افسوس والی کوئی بات نہیں ہے۔ جب نوکری کرنی ہے تو جہاں مرضی بھیج دیں۔ میں نے تیاری شروع کر دی اور ایڈیشنل ایس پی ڈیرہ غازیخان ڈاکٹر محمد جمیل صاحب جن کی جگہ میرا تبادلہ ہوا تھا کو ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ وہ کب چارج چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ تبادلہ منسوخ کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک ہفتہ تک اگر تبادلہ منسوخ نہ ہوا تو آپ آ جائیں۔ اسی دوران چوہدری جعفر اقبال صاحب ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی اپنے گاؤں تشریف لائے۔ ان کا گاؤں رحیم یار خان شہر سے 5/6 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی صاحب ان کو ملنے کیلئے گئے۔ ڈپٹی سپیکر کے والد چوہدری محمد اقبال ساکن چیلیانوالہ ضلع گجرات کے ساتھ میرے پرانے تعلقات تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر میں بھی ان کو ملنے کیلئے چلا گیا۔ ان سے پہلے میری روشناسی نہ تھی۔

غائبانہ طور پر ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جب میں ان کے ڈیرہ پر 9 بجے رات پہنچا تو ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی ان کے پاس موجود تھے۔ باہر سے ان کے آدمی نے مجھے دیکھ کر اندر جا کر بتایا۔ چوہدری صاحب بڑے پرتپاک طریقہ سے مجھے ملے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی صاحب نے چوہدری صاحب سے اجازت مانگی۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے بھی اجازت چاہی لیکن چوہدری صاحب نے فرمایا کہ آپ کو ابھی اجازت نہیں ہے۔ ابھی آپ بیٹھیں اب ہم اپنی ذاتی گل بات کریں گے۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی کے جانے کے بعد میں

چوہدری صاحب اوران کے ماموں اکٹھے حالات حاضرہ پر باتیں کرتے رہے۔ چوہدری صاحب نے پوچھا کہ سنا ہے کہ آپ کا تبادلہ ڈی جی خان ہو گیا ہے۔ میں نے کہا جناب نے درست سنا ہے۔ فرمانے لگے کہ کیا خیال ہے آئی جی صاحب سے بات کروں۔ میں نے کہا کہ آپ کی مہربانی میں سفارش کرانے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ آئی جی صاحب سے بات بالکل نہ کریں۔ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیں اور جس رو میں بہہ رہا ہوں بہنے دیں۔ چوہدری صاحب نے مسکرا کر کہا کہ رو میں بہتے بہتے کہیں زیادہ آگے نہ بہہ جائیں۔ میں نے کہا میرا اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ ہے۔ وہ بہتر کرے گا۔ میں نے چوہدری صاحب سے پھر اجازت چاہی لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جانا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیبل پر ملازم نے کھانا لگایا۔ چوہدری صاحب میں اوران کے ماموں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے پہلی ملاقات میں ہی چوہدری صاحب کو ایک اچھا انسان پایا۔ ان کے خلوص اور حسن اخلاق سے ان کے خاندانی پس منظر کی صاف جھلک نظر آ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں اجازت لے کر واپس گیا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد میں نے اپنے عہدہ کا چارج چھوڑ دیا۔ پولیس ریسٹ ہاؤس میں الوداعی پارٹی ہوئی۔ اس میں جناب ملک محمد اشرف ڈی آئی جی صاحب بہاولپور شریک تھے۔ اس کے بعد ڈیرہ غازیخان کیلئے روانہ ہو گیا۔

گر کھو گیا اک اور نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

مورخہ 2 نومبر کو بصورت تبادلہ بطور ایڈیشنل ایس پی ڈیرہ غازیخان پہنچا۔ راؤ امین ہاشم ایس ایس پی اور چوہدری محمد شفیع ڈی آئی جی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دونوں افسر انتہائی اچھے اور مہربان پائے۔ وقت بہتر انداز میں گزرنے لگا۔

اللہ تعالی کا کرنا ایسا ہوا کہ وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف، چیف جسٹس آف پاکستان سید سجاد علی شاہ صاحب اور صدر پاکستان جناب فاروق احمد خان لغاری کے مابین سپریم کورٹ آف پاکستان میں ججوں کی تعیناتی کے سلسلہ میں چپقلش شروع ہو گئی۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو صدر پاکستان کی آشیرباد حاصل تھی۔ دن بدن معاملہ بگڑتا گیا۔ میاں نواز شریف کی چند تقریروں کا نوٹس لیتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان نے توہین عدالت کا نوٹس جاری کر دیا۔ میاں محمد نواز شریف نے دانشمندی کا ثبوت دیا اور حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی مثال پیش کرتے

ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان کو قاضی وقت تسلیم کرتے ہوئے مورخہ 17 نومبر 1997ء کو ان کی عدالت میں پیش ہو گئے اور اپنے آپ کو عدالت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ عدالت نے آئندہ مورخہ 19 نومبر 1997ء کو دوبارہ پیش ہونے کا حکم دیا۔ اسی دوران مورخہ 18 نومبر کو قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس نے توہین عدالت ترمیمی بل پاس کر دیا اور مورخہ 19 نومبر کو وزیراعظم پاکستان پھر عدالت میں پیش ہوئے۔ ایک مشہور کالم نویس خوشنود علی خان نے خبریں اخبار کے کالم ''ناقابل اشاعت'' میں روزمرہ کے کالموں میں چیف جسٹس آف پاکستان کو بام فلک تک پہنچایا اور عوام میں بھی عدلیہ کا وقار اوج ثریا تک جا پہنچا۔ لیکن جب انسان گردش وقت میں آتا ہے اور اس کا ستارہ گھومتا ہے تو بڑے بڑے تجربہ کار قانون دان عالم فاضل اور سکالرز کی عقل پر پردہ آ جاتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے بلکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب میاں محمد نواز شریف وزیراعظم پاکستان نے اپنے آپ کو عدالت کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہوئے اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا تو شاہ صاحب درگزر کرتے ہوئے فراخدلی کا مظاہر کر جاتے تو وہ اتنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ کہ ملک کے ہیرو کہلاتے۔

وہ وقت بھی کبھی دیکھا ہے تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی ہے

قصہ مختصر جناب جسٹس سجاد علی شاہ صاحب کو عہدہ چھوڑنا پڑا اور فاروق احمد خان لغاری کو بھی 2 دسمبر 1997ء کو صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ سیاست بھی عجیب چیز ہے سکندر مرزا نے کیا کیا اور اس کے ساتھ کیا ہوا۔ انسان جو کرتا جائے گا وہ بھرتا جائے گا۔ (جیسی کرنی ویسی بھرنی) یہ سب خدائی فیصلے ہوتے ہیں۔ سپریم پاور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہمیشہ بادشاہی اسی کی ہے اور قانون قدرت اپنا راستہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی حکومت کے دروان تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ محمد ضیاء الحق صاحب جہاز کے حادثہ میں ختم ہو گئے۔ پاکستان کے سابق صدر جناب غلام اسحاق خان نے میاں نواز شریف کی حکومت ختم کی جو کہ بے نظیر بھٹو نے انہیں صدارت کا چھمہ دے کر اسمبلی تڑوائی۔ بعد میں وہی غلام اسحاق خان تنہا رہ گئے۔ بے نظیر بھٹو نے الیکشن جیتا، خود وزیراعظم بن گئیں اور فاروق احمد خان لغاری کو ملک کا صدر منتخب کر دیا۔ پھر اسی فاروق احمد خان لغاری نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا۔

فروری 1997ء میں دوبارہ الیکشن ہوئے۔ الیکشن جیت کر محمد نواز شریف ملک کے وزیر

اعظم بنے اوران کی مخالفت پر دو دسمبر 1997ء کو صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری کو مستعفی ہونا پڑا۔

دورن خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

میں اصل مضمون سے ہٹ گیا ہوں۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ ڈیرہ غازیخان آ کر زیادہ سکھی ہوگیا۔ صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری کے مستعفی ہونے کے بعد لغاری دور کے پولیس اور انتظامیہ کے افسران کے اقتدار کی کشتی بھی ڈگمگانے لگی۔ بدقسمتی سے مورخہ 26 دسمبر 1997ء کو سنٹرل جیل ڈیرہ غازیخان سے سپاہ صحابہ سے تعلق رکھنے والے پانچ خطرناک قیدی شاہ نواز، عزیز کٹانہ، طارق، اعجاز فوجی اور ذکی اللہ دن دہاڑے باہر سے آئے ملاقاتیوں کی امداد سے جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ فراری کیسے ہوئی میں اس کا تذکرہ بھی کرتا چلوں۔

ہوا اس طرح کہ ایک شخص اللہ وسایا نامی جو ضلع وہاڑی کا رہائشی تھا اور اس کا تعلق سپاہ صحابہ کی تنظیم سے تھا جو مختلف قسم کے مذہبی دہشت گردی کے مقدمات میں مجرم اشتہاری تھا نے شاہ نواز وغیرہ کو سنٹرل جیل ڈیرہ غازیخان سے فرار کرانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے جیل میں دو تین مرتبہ جعلی نام پر جعلی شناختی کارڈ استعمال کر کے شاہ نواز وغیرہ سے ملاقات کی اور فراری کے پروگرام کو حتمی شکل دی۔ پروگرام کے مطابق وہ چار ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ رنگ کی ایک ہنڈا کار پر جو کہ اس نے ایک ماہ قبل وہاڑی کے علاقہ سے چھینی تھی پر آیا اور کار جیل کے بیرونی گیٹ کے اندر کھڑی کر دی۔ فروٹ والے شاپر بیگ میں پسٹل رکھ کر جیل کی ڈیوڑھی میں شاہ نواز وغیرہ کو پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ کاظمی سید تھا جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ نہ صرف کمزور بلکہ بزدل بھی ہے۔ اس وجہ سے جیل کا نظام بہت خراب تھا۔ سرکش اور سینہ زور قسم کے حوالاتی ہر وقت ڈیوڑھی میں گھومتے رہتے تھے اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرہ میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

اللہ وسایا جیل کی ڈیوڑھی میں آیا۔ شاہ نواز وغیرہ سے ملاقات کی۔ پسٹل پہلے سے فروٹ والے شاپر بیگ میں اندر پہنچ چکا تھا۔ شاہ نواز کے باقی چار ساتھی بھی ڈیوڑھی میں آ گئے۔ شاہ نواز نے ڈیوڑھی کے گیٹ کے دربان کو کہا کہ گیٹ کے باہر ان کا ایک عزیز ملاقات کیلئے آیا ہوا ہے اس کو بھی اندر بلا لیا جائے۔ دربان نے جونہی ڈیوڑھی کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو شاہ نواز وغیرہ نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور چھوٹے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر پسٹل سے ہوائی

فائرنگ کی۔ان کے باہر والے ساتھی جو کار میں تھے نے بھی کلاشنکوف سے فائرنگ کی اور آناً فاناً کار میں بیٹھ کر جملہ ملزمان فرار ہو گئے۔ وائرلیس کنٹرول کے ذریعہ اطلاع ملنے پر شہر بھر کی ناکہ بندی کی گئی۔ملزمان نے یہ چالاکی کی کہ جیل سے باہر جاتے ہی گلی جو کہ دستی پل کی طرف جاتی ہے اس میں ایک ایک کر کے کار سے اترتے گئے اور پیدل گلیوں میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کار میں اللہ وسایا اور اس کے دو ساتھی رہ گئے جو پولیس کے گھیرے میں آ گئے۔ملزمان اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور ملزمان کی کار کو گولیاں لگیں۔ اللہ وسایا شدید زخمی ہو گیا جو بعد میں نشتر ہسپتال ملتان میں جان بحق ہو گیا۔اللہ وسایا کے ساتھی محمد لطیف اور بلال پکڑے گئے۔

اس واقعہ نے ڈیرہ غازیخان کی انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔اس وقت کے وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف کے حکم پر جیل سپرنٹنڈنٹ کاظمی اور اس کے سٹاف کو گرفتار کر لیا گیا۔کمشنر ڈیرہ غازیخان جناب عبدالسلام خان، ڈپٹی کمشنر اور راؤ محمد امین ہاشم ایس ایس پی کو فوری طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ راؤ محمد امین ہاشم کے تبادلہ کے بعد مجھے ایس ایس پی ڈیرہ غازیخان کا عارضی چارج دے دیا گیا۔ میں نے چارج سنبھال کر کام شروع کر دیا۔خداوند کریم کے فضل و کرم سے مورخہ 29 جنوری کو میری باقاعدہ تعیناتی بطور ایس ایس پی ڈیرہ غازیخان ہو گئی اور میں نے اپنے عہدہ کا چارج سنبھال لیا۔اللہ تعالیٰ نے صبر کا پھل دیا۔اللہ تعالیٰ بہت بڑا کارساز ہے۔

میں نے ایس ایس پی کا چارج سنبھالا تو اس وقت ڈیرہ غازی خان رینج کے ڈی آئی جی چوہدری محمد شفیع تھے۔ان کا جھنگ کے آرائیں خاندان سے تعلق ہے۔دلیر اور نڈر پولیس آفیسر تھے۔انگریزی زبان روانی سے بولتے تھے۔ماہ مارچ 1998ء کو چند سیاسی وجوہ کی بناء پر ان کا تبادلہ بطور OSD کر دیا گیا۔وہ 10 جنوری 2000ء تک OSD رہے اور وہاں سے ہی وہ ریٹائرڈ ہو گئے۔آج کل فیصل آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ان کی جگہ ملک محمد اقبال صاحب ڈی آئی جی ڈیرہ غازیخان تعینات ہوئے۔ان کا تعلق ضلع بھکر سے ہے وہ صوبہ سندھ سے تبدیل ہو کر آئے۔ وہاں ڈی آئی جی کراچی جیسے اہم عہدہ پر فائض رہے۔انتہائی محنتی، فرض شناس اور قابل پولیس آفیسر ہیں۔محکمہ اور سینئر افسر کے ساتھ وفا رکھتے ہیں۔1998ء میں جب ملک محمد اشرف ڈی آئی جی بہاولپور قتل ہوئے تو میں ملک صاحب کے ہمراہ ان کے مقدمہ کی تفتیش کیلئے بہاولپور گیا۔رات گئے تک وہ ہمارے ساتھ ملزمان سے انٹیروگیشن میں شامل رہتے۔

ملک محمد اقبال مورخہ 3 جولائی 1998ء کو تبدیل ہو کر بطور ڈی آئی جی ملتان چلے گئے۔ان

کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد سعید بطور ڈی آئی جی تعینات ہوئے۔ تقریباً چھ ماہ کی تعیناتی کے بعد 8 جنوری 1999ء بطور OSD ان کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ صاف گو سیدھے سادے فوجی افسر تھے۔ ان کے بعد ڈیرہ غازی خان رینج کا Duel چارج ملک محمد اقبال صاحب کو دے دیا گیا جو ملتان رینج اور ڈیرہ غازیخان رینج کی بیک وقت نگرانی کرتے رہے۔ بعد ازاں 20 فروری 1999ء کو انتہائی محنتی، ذہین اور پروفیشنل آفیسر جناب پرویز رحیم راجپوت بطور ڈی آئی جی تعینات ہوئے۔ ان کی تعیناتی کے دوران ہی میں انتالیس سال چار ماہ اور تیس دن مدت ملازمت مکمل کر کے الحمد اللہ مورخہ 12 اکتوبر 2000ء کو ایس ایس پی ڈیرہ غازی خان کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر بجالایا۔ ان دنوں ملک آصف حیات پنجاب کے آئی جی پولیس تعینات ہو چکے تھے جو انتہائی خوش اخلاق اور وضعدار شخصیت کے مالک ہیں۔

جب میں نے بطور ایس ایس پی ضلع کا چارج سنبھالا تو چند دنوں بعد محمود احمد بٹ صاحب ڈپٹی کمشنر تعینات ہو کر آ گئے جو انتہائی ہنس مکھ اور مزاحیہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا۔ لیکن ان کی اچانک موت نے ان کو ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا۔ ماہ رمضان 30 دسمبر 1998ء کو نماز فجر کے بعد اچانک حرکت قلب بند ہونے سے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' ان کی وفات کے بعد سید شوکت علی شاہ بطور ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے۔ شاہ صاحب کا تعلق تلہ گنگ سے ہے۔ انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر بلکہ انتہائی اچھے شاعر، ادیب اور چند کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے ساتھ انتہائی اچھا اور خوشگوار وقت گزرا۔ ان کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے پایا۔

شاہ صاحب کے تبادلہ کے بعد طارق ایوب صاحب بطور ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد ان کا تبادلہ ضلع راولپنڈی ہو گیا۔ طارق ایوب صاحب کے جانے کے بعد خان بشیر احمد خان ایڈیشنل کمشنر کو ڈپٹی کمشنر کا اضافی چارج دیا گیا جو بعد میں مستقل ڈپٹی کمشنر تعینات ہو گئے۔ خان صاحب عاجزی اور انکساری کے پیکر تھے۔ وہ بڑے بھائیوں کی طرح میرا احترام کرتے رہے۔

12 اکتوبر کو میاں نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے بطور چیف ایگزیکٹو حکومت کی کمان سنبھال لی شریف خاندان جس کا ستارہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا اور کمال اور عروج کی انتہا دیکھ لی تھی۔ فطری تقاضوں کے تحت زوال پذیر ہوا۔

ہر کمالے راز والے

میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم، میاں شہباز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب، رانا مقبول احمد انسپکٹر جنرل آف پولیس سندھ اور ان کے دیگر ساتھی جناب پرویز مشرف کے طیارہ کے اغوا کیس میں گرفتار ہو گئے۔ رانا مقبول احمد کی گرفتاری کی خبر سن کر انتہائی دلی صدمہ ہوا کیونکہ میں نے کافی عرصہ ان کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ انتہائی دلیر اور اعلیٰ ایڈمنسٹریٹر تھے۔ پولیس فورس میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

محمد نواز شریف کے اقتدار کا دور ختم ہوا اللہ اکبر، سپریم پاور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے ایک دن وہ اپنی اصلیت پا لیتا ہے۔

کس گلشن میں آصف خزاں آ نہیں جاتا
وہ گل کونسا کھلتا ہے جو مرجھا نہیں جاتا
یہ دنیا ہے تغیر کی عجب وادی ہے
حکم دیتا تھا جو کل آج وہ فریادی ہے
تھے دنیا میں کل جو صاحب تخت و تاج
نوبت یہ ہوئی ہے کہ آج ہیں وہ دوسروں کے محتاج

12 اکتوبر 2000ء کو چونکہ میں ضلع ڈیرہ غازیخان سے ریٹائر ہوا ہوں اس لئے ڈیرہ غازیخان کا تذکرہ ذرا تفصیل سے بیان کرنا مناسب سمجھوں گا۔

ڈیرہ غازیخان کی بنیاد ایک بلوچ سردار حاجی خان میرانی اول (دودائی) نے 1476ء میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اپنے بیٹے غازی خان کے نام پر رکھی۔ حاجی خان دراصل سندھ کے دودا خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو بعد میں ایک عورت کے طفیل بلوچوں میں شامل ہو گیا اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے ڈیرہ غازی خان شہر کی بنیاد رکھ کر کوہ سلیمان کے دامن میں رہنے والے اور میدانی علاقوں میں بسنے والے تمام بلوچوں کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس وقت ڈیرہ غازیخان ایک چھوٹے سے قصبہ کی شکل میں تھا جو ڈیرہ (پھلاں دا سہرہ) کے نام سے مشہور تھا۔ حاجی خان نے دریائے سندھ سے بائیس کلومیٹر دور موجودہ ڈیرہ غازیخان میں بستی چورہٹہ کے ساتھ اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس مقبرہ کیلئے اینٹیں پرانا ڈیرہ غازیخان سے موجودہ ڈیرہ تک انسانوں کی ایک لمبی قطار کے ذریعہ ہاتھوں ہاتھ لائی گئی تھیں۔ یہ

مقبرہ مغل طرز تعمیر کی عمارات کی طرح بنایا گیا تھا۔

چار سو سال تک بسنے والا پرانا ڈیرہ غازیخان آخر کار 1910ء میں دریائے سندھ کی طوفانی موجوں سے دریا برد ہو گیا۔ 1910ء میں ہی ایک انگریز انجینئر نے موجودہ ڈیرہ غازیخان شہر کا نقشہ بنایا اور اس کی بنیاد رکھی۔ اس شہر کا نقشہ سرگودھا شہر سے ملتا جلتا ہے۔ غالباً یہ دونوں شہر ایک ہی دور میں آباد ہوئے۔ شہری اور دیہی آبادی کو سیراب کرنے کے لئے دیوان مانک سنگھ نے اپنے نام پر مانکہ نہر کھدوائی جو موجودہ دور میں گندگی کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ڈیرہ غازیخان کا اس وقت تاریخی ورثہ مقبرہ غازی خان اور بستی چور ہٹہ کے نزدیک بنگلہ لاشاری کے کچھ بچے کھچے کھنڈرات پر مشتمل ہیں۔ ضلع ڈیرہ غازی خان پہلے ملتان ڈویژن میں شامل تھا۔ اور راجن پور اس کی تحصیل تھی۔ لیکن 1982ء میں راجن پور کو علیحدہ ضلع کا درجہ دے گیا۔ اس طرح لیہ جو ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل تھی اس کو بھی ضلع کا درجہ دے کر علیحدہ ڈیرہ غازیخان ڈویژن بنا دیا گیا جس میں آج کل ڈیرہ غازیخان ضلع کے علاوہ مظفر گڑھ، راجن پور اور لیہ کے اضلاع شامل ہیں۔

ڈیرہ غازیخان میں انگریز نے اپنے نظام کو چلانے کیلئے بلوچ قوم کے تمن دار مقرر کئے جن میں مزاری، لغاری، کھوسہ، دریشک، قیصرانی، لنڈ، گورچانی، لاشاری اور بزدار ہیں۔ مزاری قبیلہ ضلع راجن پور کی تحصیل روجھان میں آباد ہیں۔ دریشک اور گورچانی راجن پور اور لال گڑھ، لغاری چوٹی زیریں، کھوسے موضع بہادر گڑھ، لنڈ موضع شادن لنڈ اور قیصرانی تحصیل تونسہ کے علاقہ وہوا اور کوٹ قیصرانی آخری حد تریمن تک آباد ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازیخان میں کل چودہ پولیس اسٹیشن ہیں۔ اس ضلع کا تقریباً تہائی حصہ پہاڑ ہے جو ٹرائیبل ایریا ہے جہاں جرائم اور لاء اینڈ آرڈر کو بارڈر ملٹری پولیس کنٹرول کرتی ہے جن کے علیحدہ تھانے ہیں۔ ٹرائیبل ایریا میں پولیس داخل نہیں ہوسکتی۔ ٹرائیبل ایریا کے بلوچ سر پر سفید پگڑی باندھتے ہیں اور کوئی شخص ننگے سر نہیں دیکھا جاتا۔ یہ پہاڑی علاقہ میں رہتے ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش زیادہ تر بھیڑ بکریاں پالنا ہے۔

ضلع ڈیرہ غازیخان کے ٹرائیبل ایریا میں فورٹ منرو مشہور مقام ہے۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک انگریز منرو نامی نے قلعہ تعمیر کیا جس کے نشانات اب ختم ہو چکے ہیں۔ اس کی اونچائی سطح زمین سے تقریباً چھ ہزار فٹ ہے اور موسم گرما میں یہاں کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں اکثر

لوگ سیر وتفریح کیلئے یہاں آتے ہیں۔اس علاقہ میں موسم گرما کیلئے صرف یہی جگہ ایک تفریح گاہ ہے اگرچہ پہلے یہاں کوئی زیادہ آبادی نہیں تھی لیکن اب آہستہ آہستہ آبادی زیادہ ہو رہی ہے۔اور لوگ یہاں اپنے مکان بنا رہے ہیں۔

پرانی عمارت میں کمشنر ہاؤس، ڈپٹی کمشنر ہاؤس، پی اے ہاؤس اور جرگہ ہال ہے۔لغاری اور کھوسہ سرداروں نے بھی وہاں اپنی رہائش گاہیں بنائی ہوئی ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازیخان میں چند قبائلی سرداروں کے علاوہ اکثریت غریب لوگوں کی ہے۔ دیہاتی ایریا میں قبائلی سرداروں کا زیادہ اثر ہے۔لوگ کام کاج کیلئے اپنے سرداروں کے دروازہ پر جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ حکومتی اہلکاروں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

ڈیرہ غازیخان شہر میں مہاجرین کی آبادی بھی کافی ہے۔شہر کے لوگوں میں دن بدن شعور پیدا ہو رہا ہے اور بیدار ہو رہے ہیں۔سرداری نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔

ڈیرہ غازیخان کے چوٹی زیریں کے رہائشی سردار فاروق احمد خان لغاری صدر پاکستان کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔اور سردار ذوالفقار علی خان کھوسہ گورنر پنجاب رہ چکے ہیں۔یہاں کے سردار اور دوسرے اکثر لوگ بڑے وضعدار اور ملنسار ہیں۔سرکاری افسران و ملازمین اور قانون کا حتیٰ الوسع احترام کرتے ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازیخان میں تونسہ شریف اور سخی سرور دو مشہور قصبے ہیں۔تونسہ میں حضرت خواجہ سلیمان تونسوی المعروف پیر پٹھان کا مزار ہے جو 1183ھ مطابق 1764ء میں موضع گڑھ گوجی تحصیل بازار موسیٰ خیل ضلع لورالائی میں پیدا ہوئے اور بعد ازاں تونسہ شریف آئے۔

سخی سرور میں سید احمد سلطان المعروف سخی سرور کا مزار ہے جو 23 رجب المرجب 577ھ کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ان کا شجرہ نسب یہ ہے کہ سید احمد سلطان ولد سید زین العابدین ولد سید عمر ولد سید عبد الطیف ولد سید شیخا ولد سید اسماعیل ولد امام موسیٰ کاظم اور امام جعفر ولد امام محمد باقر ولد امام زین العابدین ولد امام حسین علیہ السلام ولد حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ولد ابو طالب ولد عبد المطلب ولد ہاشم ولد عبد المناف ولد قصی بن کلاب ولد مرہ ولد کعب ولد لوی ولد غالب ولد فہر ولد مالک ولد نصر ولد کنانہ ولد حزیمہ ولد مدرکہ ولد الیاس ولد نصر ولد نزار ولد معد ولد عدنان ولد ادولد ادو ولد ہمسیع ولد سلامان ودنابت ولد حمل ولد قند ولد حضرت اسماعیل ولد حضرت ابراہیم ولد آزر ولد ناحور ولد شاہروح ولد ارغو ولد فانح ولد عامر ولد شانج ولد حضرت ادریس ولد

بیار ولد مہلا ئیل ولد قنان ولد الوش ولد شیت علیہ السلام ولد حضرت آدم علیہ السلام۔

قصبہ سخی سرور ایک قدیم تہذیب کا مرکز ہے۔ جب بابل اور نینوا پر بخت نصر حکمران تھا اس زمانہ کے سکے سخی سرور کی ندی میں ملتے معلوم ہوئے ہیں۔ قدیم قبرستان اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ اس راستہ سے حملہ آور داخل ہوتے اور اس جگہ پڑاؤ ڈالتے۔ اس علاقہ میں قتل عام اور جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں پڑاؤ والا کھوہ اب بھی مشہور ہے۔ پسماندہ علاقہ ہونے کی وجہ سے ڈیرہ غازی خان کا خاص طور پر غریب طبقہ انتہائی سادہ ہے۔ ایک دن ایک مائی درخواست لے کر میرے پاس آئی۔ درخواست سامنے میز پر رکھی اور اپنے میلے کچیلے پھٹے ہوئے دوپٹہ کے ایک کونے میں بندھے پچیس روپے کھول کر درخواست کے ساتھ میز پر رکھ دیئے۔ میں نے کہا مائی یہ کیا ہے ''پتر چا گھن'' مائی بولی۔ میں نے پھر کہا کہ مائی یہ پیسے میز پر کیوں رکھے ہیں۔ وہ دوبارہ کہنے لگی ''ہاں پتر کالا لکٹر وچ کے تیڈے کان گھن آئی آں تو چا گھن'' دکھی مائی جس کے چہرے پر دکھ اور غربت کے آثار نمایاں تھے کی بات سن کر میرا سر شرم سے جھک گیا کہ محکمہ پولیس کے متعلق لوگ کس قسم کی سوچ رکھتے ہیں۔ ایک دن تھانہ کالا کا ایک شخص درخواست لے کر میرے دفتر آیا۔ درخواست پیش کی تو اس پر میں نے ایس ایچ او تھانہ کالا کو ضابطہ کے تحت کارروائی کرنے کا حکم تحریر کیا اور درخواست سائل کے حوالہ کی تو وہ پوچھنے لگا کہ صاحب جی ایہہ درخواست تھانے کالے گھن ونجاں؟ میں نے کہا ہاں۔ ''صاحب جی ایہہ ڈساؤ میں تھانیدار کوں کتے پیسے ڈیواں''۔ وہ انتہائی معصومانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ مجھے یہ الفاظ سن کر انتہائی دکھ ہوا۔ میں نے تمام ایس ایچ او کی میٹنگ بلائی اور ان کو احساس دلایا کہ کتنے شرم کی بات ہے لوگ ہمارے متعلق کیا سوچ رکھتے ہیں۔

میری ریٹائرمنٹ پر ڈیرہ غازیخان کے لوگوں نے دو ہفتہ تک دن رات الوداعی پارٹیوں سے نوازا انہوں نے جس خلوص پیار محبت اور اعزاز کے ساتھ مجھے الوداع کیا میں تازیست ان کو نہیں بھول سکتا۔ یہ پیارے لوگوں کی پیاری دھرتی ہے۔ میری ملازمت کا بہترین دور ڈیرہ غازی خان کی تعیناتی ہے۔

الوداعی پارٹیوں میں کئی قصیدے اور نظمیں پڑھی گئیں لیکن ایک کانسٹیبل کی سرائیکی نظم کے چند اشعار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کافی ضبط کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اشعار درج ذیل ہیں

نہ بھلسی تیڈی یاد ساکوں
ساڈا ڈیرہ چھوڑ کے ویندا پئیں
ہا قرب نصیب قریب ہاویں
ساڈی تو مونجھ مزید ودایندا پئیں
کوئی جھڑک ڈیسی ہنٹر ساہے ویسوں
ہاویں ساڈے مان مکیندا پئیں
ساڈا کون ہے قاصر باجھ تیڈے
ساڈا ہتھ نپ کیکوں ڈیندا پئیں
ساڈی جیویں نبھسی نبھ ویسی جے
ویندا پئیں ہووی رب راکھا
ساکھوں تیں جی ہاں بیا ملتراں نئیں
مکلینڈا پئیں ہووی رب راکھا
جتھ پیر ہووی اُتھ خیر ہووی
دل چنیدا پئیں ہووی رب راکھا
تیڈا قاصر اے احسان وڈے
الویندا پئیں ہووی رب راکھا

ایک اور نظم کے اشعار

ہم ملازم یہ مل کے دُعا مانگتے ہیں
نہ کچھ اور اس کے سوا مانگتے ہیں
نہ دولت نہ دنیا نہ کوئی چیز قاصر
خیر زندگی کی تیری سدامانگتے ہیں

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنے آبائی گاؤں چک نمبر 152 شمالی گیا تو ہر طرف نمایاں تبدیلی نظر آئی ۔ اگر چہ ملازمت کے دوران کبھی کبھار چند گھنٹوں کے لیے میرا چکر گاؤں لگتا رہتا تھا لیکن تبدیلی کا اتنا مجھے احساس نہ ہوتا جتنا اب ہوا ہے ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بنظر غور

مشاہدہ کرنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اور اب چالیس سال کے طویل عرصہ کے بعد جب ریٹائرمنٹ کے بعد واپس گاؤں گیا تو مجھے نمایاں تبدیلی کا احساس ہوا۔

گاؤں کی زیادہ آبادی جس کو میں نے کچے مکانوں کی شکل میں چھوڑا تھا اب تمام گاؤں کے مکانات پختہ ہیں بلکہ گلیاں بھی سولنگ لگنے کی وجہ سے پختہ شکل میں ہیں۔ گاؤں تک کوئی پختہ سڑک نہیں تھی۔ کچے راستوں پر خاک چھان کر گاؤں پہنچتے تھے اب گاؤں تک پختہ سڑک بن چکی ہے۔

جب گاؤں چھوڑا لوگ گھروں میں مٹی کا دیوا جلا کر روشنی کرتے تھے۔ اب بجلی آ جانے کی وجہ سے لوگوں نے بجلی کے بلبوں اور ٹیوبوں سے اپنے گھر روشن کیے ہوئے ہیں۔ شادی بیاہ پر لوگ دیسی گھی استعمال کرتے تھے، ڈالڈا یا کوکنگ آئل کا کوئی تصور نہ تھا۔ اب دیسی گھی کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ لوگ گھروں میں ڈالڈا یا کوکنگ آئل استعمال کرتے ہیں۔ مہمان کی آمد پر لوگ میٹھے دودھ سے تواضع کرتے تھے۔ علی الصبح فجر کی اذان سے پہلے عورتیں چاٹیوں میں مدھانی ڈال کر دودھ بلوتی تھیں جس سے دل کو لبھانے والے آوازیں آتی تھیں۔ اب سورج نکلنے کے بعد جاگ کر بجلی کی مدھانی سے چند منٹوں میں دودھ بلو لیتی ہیں۔ دودھ بیچنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب گھروں میں لسی تک نہیں ملتی۔ جس دن نماز فجر کے وقت ڈھول کی آواز سنائی دیتی وہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ آج پھر کوڈی یا کبڈی کا کوئی میچ ہے۔ اس دن لوگ نماز ظہر کے وقت گاؤں کے قریب چٹیل میدان میں جمع ہو جاتے۔ ڈھول بجائے جاتے اور لوگ کھیلوں کے مقابلے دیکھ کر محظوظ ہوتے۔ یہ چیزیں گاؤں کے لوگوں کے لئے تفریح کا سبب بنتیں۔ اب دیسی کھیلوں کے نام ونشان ہی ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے گاؤں کے ایک بزرگ سے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو کسی کھیل پر اگر چند لوگ اکٹھے ہو جائیں تو لڑائی ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص دوسرے کی بات برداشت ہی نہیں کرتا۔

مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب رات کو عورتیں اکٹھی بیٹھ کر مقابلہ سے چرخہ کاتتی تھیں اور اس سوت سے گاؤں کے جولاہے سے کپڑا بنوایا جاتا تھا۔ عورتیں اپنے ہاتھ سے چادر اور کرتے سی لیتی تھیں۔ باہر کھیتوں سے لانی کاٹ کر اسے سکھا کر گڑھے کھود کر جلایا جاتا تھا۔ اس سے کھار تیار کر کے عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔ پیپوں میں پانی ڈال کر کھار کوٹ کر ڈالی جاتی اور گھنٹوں تک نیچے آگ جلا کر کپڑوں کو دھویا جاتا تھا۔ اب صابن اور سرف استعمال کر کے واشنگ مشین کے ذریعے منٹوں میں کپڑے دھو لئے جاتے ہیں۔ گندم کی فصل کو بیلوں کے ذریعے گہائی کر کے ڈھیر لگائے جاتے اور گندم کے دانے بھوسہ سے علیحدہ کرنے کے لیے ہفتوں تک ہوا چلنے کی انتظار کی جاتی

اب تھریشر مشین کے ذریعہ گھنٹوں میں گندم صاف کر لی جاتی ہے۔

نماز فجر کے وقت کسان اپنے بیلوں کو جوت کر کھیتوں میں لے جاتے تو بیلوں کے گلے میں ڈالے گھنگھروؤں سے دلکش آوازیں پیدا ہوتیں۔ ایسا لگتا جیسے کوئی ساز بج رہا ہے۔ اب ٹریکٹر نے اس کلچر کو بھی ختم کر دیا ہے۔ لوگ لسی سر میں ڈال کر نہاتے تھے اور بالوں میں مکھن لگاتے تھے۔ اب صابن، شیمپو اور خوشبودار تیل استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے گاؤں سے تین میل پر سوبھاگا ریلوے اسٹیشن ہے۔ لوگ وہاں تک پیدل جاتے اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہو کر آگے دوسرے شہروں کو جاتے۔ اب گاؤں سے ہی بسوں ویگنوں اور کاروں کے ذریعہ سفر کیا جاتا ہے۔ کسی دوسرے شہر میں اور دور دراز علاقوں میں رشتہ داروں کو حادثاتی اطلاع دینے کے لیے سپیشل آدمی بھیجا جاتا تھا۔ اب ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔ چند منٹوں میں تمام ملک سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

جب میں نے گاؤں چھوڑا تھا لوگوں کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔ ننگے سر پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب سر تو موجود ہیں لیکن پگڑیاں سر سے غائب ہیں۔ گاؤں کے لوگ رات گئے تک اکٹھے حقہ پیتے اور گپیں لگاتے رہتے۔ گاؤں میں صرف ایک ریڈیو تھا جو بیٹری کے ذریعے چلتا تھا۔ رات کو گاؤں کے لوگ اکٹھے بیٹھ کر کافی دیر تک ریڈیو سنتے رہتے تھے۔ کوئی ڈر خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت انس اور اخلاص تھا۔

اب ٹی وی اور ڈش آچکا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے پاس جانا تو کجا ایک دوسرے کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ گلے شکوے، غیبت اور حسد نے پیار محبت اور اخلاص کو ختم کر دیا ہے۔ اور تو اور حقیقی بھائی ایک دوسرے کے بیری بنے ہوئے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے کوئی پیار نہیں۔ بہن اور ویر جیسے گہرے اور پیارے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ خون سفید ہو چکے ہیں اور سب قدریں ختم ہو چکی ہیں۔ صرف ماں اور باپ کا مخلص اور سچا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ میں بدقسمتی سے اس رشتہ سے بھی محروم ہو چکا ہوں۔ کاش میرے گاؤں واپس لوٹنے تک میری ماں زندہ رہتی اور مجھے ان کی خدمت کا موقع ملتا!

اب گاؤں تک پختہ سڑک ہے، بجلی ہے، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن کی سہولت موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ چاہت، الفت، پیار، محبت اور خلوص نہیں ہے جو چالیس سال قبل میں نے اپنے گاؤں کے لوگوں میں دیکھا تھا۔

پاکستان، جرائم اور نئی نسل

ہزاروں عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے۔ معصوم بچے اپنی ماؤں کے سامنے برچھیوں پر لٹکائے گئے۔ مسلمان عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ دھرتی مسلمانوں کے خون سے تر ہوگئی۔ ہزاروں ضعیف و ناتواں لوگوں نے سینکڑوں میل پیدل سفر کیے۔ خون کی ہولی کھیلی گئی۔ نعشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ کئی لختِ جگر اپنی ماؤں سے بچھڑ گئے۔ کئی مائیں اپنے جگر گوشوں کے غم میں پاگل ہوگئیں۔ قربانیاں ہی قربانیاں۔ عزت اور عصمت کی قربانی۔ خون کی قربانی۔ جان کی قربانی۔ مال کی قربانی، سب کچھ لٹا پٹا کر ہم نے علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر دیکھی اور ہمارا پیارا ملک پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ قائداعظم نے یہ پیارا ملک بنا کر نئی نسل کے سپرد کیا اور خود اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔

اس ملک کی بدولت ہمیں اعلیٰ عہدے ملے۔ عزت اور شہرت ملی۔ سب کچھ ملا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لوگوں نے اپنے کاروبار آزاد ہو کر کیے۔ کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے۔ دولت کی ریل پیل، حتیٰ کہ دنیا کی ہر نعمت ملی۔ لیکن نئی نسل نے قائداعظم کے پیارے پاکستان کو کیا دیا؟

- ہیروئین کا نشہ پھیلایا۔ اس نشہ میں کئی جوانیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔ کئی گھر اجڑ گئے۔ کئی پھول جیسے چہرے مرجھا گئے۔
- کلاشنکوف کی گولی دی۔ جس نے سینکڑوں بے گناہوں کی جان لی۔ خون سستا ہوگیا۔ دہشت پھیلی۔
- دھوکا فراڈ اور دغا۔ طاقتور کمزور کا مال کھا گئے۔ اور بااثر وڈیرے غریبوں کی جائیدادیں ہڑپ کر گئے۔
- ملاوٹ۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہر چیز کی نقل۔ حتیٰ کہ خوراک میں ملاوٹ بلکہ ادویات جن سے

انسان کی جان بچائی جاتی ہے اس میں بھی ملاوٹ۔

- قتل۔ چوری اور ڈاکے بڑھے۔ انصاف مہنگا ہو گیا۔
- حرص اور لالچ چھا گیا۔
- تعلیمی اداروں میں قلم کی جگہ آتشیں اسلحہ نے لے لی۔ اور تعلیمی ادارے جرائم پیشہ افراد کی پناہ گاہ بن گئے۔ اساتذہ کا احترام ناپید ا ہو گیا اور طلباء اپنے حقوق سے محروم ہو گئے۔
- اقربا پروری نے غیر کے حقوق چھین لیے۔
- نئی نسل جرائم میں ملوث ہو گئی۔
- مذہبی فرقہ واریت، تعصب اور دہشت گردی نے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

ہم نے ان سب باتوں کے اسباب اور محرکات تلاش کرنے ہیں اور ان کا تجزیہ کرنا ہے کہ کن کن عوامل کی بناء پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ جو کہ ایک عظیم مفکر، مبلغ، ہادی و رہبر تھے ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب قرآن پاک کو چھوڑ چکے ہیں۔ دین اسلام سے دور چلے گئے ہیں۔ نیکی اور بدی کی تمیز ختم ہو گئی ہے، بلکہ بدی نیکی پر غالب آ گئی ہے۔

اساتذہ اپنا کردار صحیح طور پر ادا نہیں کر رہے۔ ٹیوشن اور نقل کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں تعلیم کا فقدان ہے۔ اساتذہ اور طلباء سیاست میں ملوث ہو گئے ہیں۔ طلباء کی تنظیموں کی آپس میں کشیدگی اور لڑائی جھگڑوں نے ان کو تعلیم سے دور کر دیا ہے۔ اساتذہ جو عزت و تکریم کی علامت سمجھے جاتے تھے اب اپنے شاگردوں سے خوفزدہ ہیں۔ عزت و احترام نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

والدین کی لاپرواہی اور کم توجہی اولاد پر منفی اثرات چھوڑ رہی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ اپنی اولاد کی صحیح پرورش کریں اور اچھی تربیت دیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ والدین ان دونوں چیزوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ بیٹا اگر پوری رات گھر سے باہر رہے تو والدین اس سے یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا تک نہیں کرتے کہ بیٹے تم ساری رات کہاں رہے ہو۔

اولاد اپنے والدین کا احترام بھول چکی ہے اور والد زیادہ دولت بنانے کے چکر میں اولاد کی طرف توجہ دینے سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اس طرح سے اکثر بچے احساس کمتری اور احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے جرائم کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک


Huma

دفعہ سی۔آئی۔اے لاہور میں ایک لڑکا اعجاز پکڑا گیا۔اس نے تین کاریں چوری کرنے کا انکشاف کیا۔ جب اس کے والد کو پتہ چلا تو وہ اس کے پیچھے سی۔آئی۔اے کوتوالی میں میرے پاس آیا اور مجھے کہا کہ اس کا لڑکا بے گناہ ہے وہ کار چوری نہیں کرسکتا کیونکہ ان کی اپنی کار ہے جس وقت چاہے وہ اپنی کار استعمال کرسکتا ہے کسی کی کار چوری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔میں نے اس کے لڑکے اعجاز کو بلوایا اور اس کے باپ کے سامنے پوچھا کہ اس نے کاریں کیوں چوری کی ہیں۔اس نے کہا کہ وہ علیحدگی میں بتلائے گا۔میں نے اس کے باپ کو دوسرے کمرے میں بھیج کر پوچھا تو اس نے بتلایا کہ اس کا باپ اسے کار چلانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور کئی دفعہ اصرار کے باوجود اسے کار استعمال کرنے کیلئے نہیں دی۔ چونکہ کار چلانے کا شوق تھا اس لئے اس نے کاریں چوری کرنا شروع کردیں۔3/4 روز چوری کی کار استعمال کرتا رہتا پھر اسے لاوارث چھوڑ کر دوسری کار چوری کرلیتا۔

میں نے اس کے باپ کو یہ بات بتلائی تو وہ کہنے لگا کہ اس کا بیٹا تو اسے کہتا تھا کہ وہ دوست کی کار مانگ کر لایا ہے۔اب آپ اس باپ کی بے حسی کا خود اندازہ لگائیں۔

مادہ پرستی نے لوگوں کو اندھا کردیا ہے۔روپے پیسے کی دوڑ اور راتوں رات امیر بننے کی خواہشات نے تمام انسانی اقدار کو پامال کردیا ہے۔معاشی ناہمواری سے غریب امیر کا دشمن بن گیا ہے۔اور امیر امیر تر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہر نوجوان کی خواہش ہے کہ بغیر محنت اس کے پاس خوبصورت گاڑی اور خوبصورت بنگلہ ہو۔ان خواہشات کی تکمیل نہ پاکر نوجوان نسل جرائم میں ملوث ہوگئی ہے۔

جہاں والدین اور اساتذہ پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہاں پولیس افسران کو بھی اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے۔ جب کوئی نوجوان کسی جرم میں ملوث ہوکر پولیس کے پاس آتا ہے تو پولیس افسر کا اخلاقی فرض ہے کہ اس کو پیار سے سمجھائے کہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں پال کر جوان کیا ہے۔ان کو آس تھی کہ تم جوان ہوکر ان کا سہارا بنو گے اور ان کے بازو مضبوط کرو گے۔لیکن تم نے جوان ہوکر اپنے والدین کو ماسوائے ذلت اور رسوائی کے کیا دیا ہے؟ اس سے اچھا ہوتا کہ تم ان کے گھر پیدا ہی نہ ہوتے تا کہ یہ ذلت کے دن انہیں دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔تمہاری جوان بہنیں، تم پر کیا مان کریں گی اور تمہاری اولاد کو لوگ چور، ڈاکو کی اولاد کہیں گے۔بچیوں کے رشتے کوئی قبول نہیں کرے گا، بلکہ سارا معاشرہ

تمہیں حقارت اور نفرت کی نظروں سے دیکھے گا۔ ایسی باتیں اس نوجوان پر گہرے اثرات چھوڑیں گی۔ نہ صرف وہ اس پولیس افسر کے اعتماد میں آ کر اس سے پیار کرے گا بلکہ اپنے کئے پر بھی پشیمان ہوگا۔ اس طرح سے کافی حد تک اس کی اصلاح کے پہلو روشن ہو سکتے ہیں اور پولیس کا امیج بھی بہتر ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف اگر نوجوان کو آتے ہی غلیظ گالیاں دے کر تھانہ میں تشدد کا نشانہ بنایا جائے اور کسی گینگ کا ممبر بنا کر اس کو نامی گرامی چور اور ڈاکو بنا کر پیش کیا جائے تو اس کا ردعمل اتنا ہی شدید ہوگا۔ وہ واقعی نامی گرامی چور اور ڈاکو بن جائے گا اور اس کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی۔

اس طرح جب نوجوان گرفتار ہو کر جیل میں جاتا ہے تو وہاں اس کا استقبال عادی جرائم پیشہ لوگ کرتے ہیں اور اس کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس ماحول میں رہ کر کچھ عرصہ کے بعد وہ مکمل چور اور ڈاکو بن جاتا ہے۔ جیل سے باہر آ کر وہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر جرائم میں حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ جیل کے نظام کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ جیلیں بجائے جرائم کی تربیت گاہ بننے کے اصلاح احوال کا ادارہ ہونی چاہئیں۔ وہاں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا اہتمام ہونے سے صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔

نوجوان نسل کو جرائم سے روکنے اور جرائم کے انسداد میں عوام کا کردار بہت اہم ہو سکتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی دنیا علیحدہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے درمیان رہ کر اپنی مذموم سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہیں۔ اگر عوام صرف اپنے دائیں یا بائیں پر نظر رکھیں اور دیکھیں کہ ان کے دائیں یا بائیں کون لوگ رہ رہے ہیں وہ کیسے لوگ ہیں۔ اگر وہ مشکوک ہوں تو پولیس کو بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے کر ان کی پڑتال کرائی جا سکتی ہے۔ اس طرح معاشرہ سے جرائم پیشہ لوگوں کا وجود ختم ہو سکتا ہے۔

نئی نسل کے اندر خوف خدا اور بدی اور نیکی کی تمیز پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا بہت مختصر ہے۔ اس میں خدائی نظام بھی جاری و ساری ہے۔ نئی نسل کو یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ دنیاوی قانون کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا قانون بھی چل رہا ہے اور مکافات عمل اپنی جگہ قائم ہے۔ اگر کوئی شخص دنیاوی قانون کی نظروں سے بچ سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کی نظروں سے وہ ہرگز ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی کے اصول کو ہرگز نہیں جھٹلایا جا سکتا۔

جہاں نئی نسل خوبصورت گاڑی اور خوبصورت بنگلہ حاصل کرنے کی خواہشات کی تکمیل کیلئے

چوری، ڈاکے اور ناجائز اسلحہ اور منشیات فروشی میں ملوث ہو رہی ہے اور امیر سے امیر تر بننے کے خواب دیکھ رہی ہے وہاں انہیں چاہیے کہ کچی آبادیوں اور غریبوں کی جھونپڑیوں پر بھی نگاہ ڈالیں جن کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی وہ صبر وقناعت سے کام لے کر شریفانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ملک کے سیاستدان جو کرسی اور اقتدار کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں ان کو بھی یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی کرسی اور اقتدار صرف ملک کی بقا میں ہے۔ وہ میرٹ پالیسی کو اپنائیں۔ سچائی کا دامن تھامیں اور جھوٹ سے نفرت کریں۔ صرف ووٹ کی خاطر اپنے اثر ورسوخ کا غلط استعمال نہ کریں بلکہ اس پیارے ملک کیلئے بھی کچھ سوچیں۔ جس کو قائم ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن روز بروز یہ گھمبیر مسائل سے دوچار ہوتا جا رہا ہے۔ دانشور، صحافی اور اہل قلم حضرات بھی نئی نسل کے متعلق کچھ سوچیں۔ ان کو ایک باکردار اور مثالی قوم بنانے میں ان حضرات کا کردار بہت ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

علمائے دین پر بھی بھاری فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر ہو کر لوگوں کو اخوت، محبت اور یک جہتی کا درس دیں۔ مذہبی فرقہ وارانہ منافرت کو وعظ اور پرچار کے ذریعہ ختم کرائیں اور مسلمانوں کے اندر اتحاد، یگانگی اور یک جہتی کی فضا قائم کر کے دہشت گردی کے خلاف جہاد کر کے وطن عزیز کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنائیں۔

ہمیں چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں جو صبر اور قناعت کا سبق دیا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر نئی نسل کیلئے مشعل راہ بنیں۔ ہم اپنے اسلاف پر نظر ڈالیں اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں کی مکمل پیروی کریں۔ ہمارے سامنے کئی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جن بزرگان دین اور اللہ کے نیک بندوں نے دولت اور زر سے نفرت کی ہے ان کے نام اب تک زندہ وتابندہ ہیں۔ اور دولت کے پجاریوں اور ظالموں کے نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ ہم نے اپنے پیارے ملک پاکستان کو اندرونی اور بیرونی خلفشار سے پاک کرنا ہے۔ ہم نے اس گلشن کو شاد اور آباد رکھنا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم سب انفرادی طور پر اپنے اپنے گریبان میں جھانکیں اور اپنی اصلاح خود کریں۔ اگر ملک کا ہر فرد اپنے آپ کو درست کر لے تو یہ ملک امن اور خوشحالی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ ایمانداری، محنت اور لگن کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کی خاطر برائی کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ برائی سے نفرت اور نیکی کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ مظلوم اور دکھی انسانیت کا ساتھ اور ظالم کو ظلم سے سختی کے ساتھ روکنا ہوگا۔ بس ہماری فلاح اسی میں ہے اور ان

اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم اپنے ملک کو خوشحال اور سلامت رکھ سکتے ہیں۔

نوجوان نسل جو مستقبل میں اس گلشن کی محافظ اور پاسبان ہے اپنے اچھے اعمال اور اعلیٰ کردار سے ثابت کر دے کہ وہ اس پاک سرزمین کو ہر نظر بد سے محفوظ رکھیں گے۔ اور اس کی بقا اور سلامتی کی خاطر کسی قسم کی قربانی دینے سے ہرگز گریز نہیں کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکی کی توفیق دے۔ (آمین)

پولیس افسران

اگرچہ معاشرہ میں پولیس اور عوام کا کردار الگ الگ ہے لیکن درحقیقت ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پولیس کی اچھائی یا برائی کا انحصار بھی معاشرہ پر ہے۔ جس ملک کا معاشرہ اچھا ہوگا وہاں کی پولیس بھی اچھی ہوگی کیونکہ پولیس اس ملک کے معاشرہ کا حصہ ہوتی ہے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل محکمہ پولیس میں چند نچلے درجے کے ملازم بھرتی ہوکر ڈیوٹی دیتے تھے لیکن اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کا فائز ہونا ایک خواب تھا۔ اعلیٰ عہدے انگریز صرف اپنا حق سمجھتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کانسٹیبل جیسے کم تر عہدہ سے لے کر انسپکٹر جنرل پولیس کے اعلیٰ ترین عہدہ تک مسلمان فائز ہوتے چلے آرہے ہیں یعنی پیارے وطن پاکستان کی بدولت ہی ہمیں یہ اعلیٰ عہدے اور منصب ملے ہیں اور سب عزت شہرت وطن عزیز کی وجہ سے ہی ہے۔

محکمہ پولیس میں ایک پولیس افسر کا کردار ہمارے معاشرہ میں انتہائی اہم رول ادا کرتا ہے۔ ہر دکھی، مظلوم اور فریادی شخص انصاف اور دادرسی کی توقع لے کر تھانے میں آکر پولیس کے دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ ان حالات میں تھانہ میں موجود پولیس افسر اگر سائل اور فریادی کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے پیار، محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے تو اس پولیس افسر کے محبت بھرے چند بول فریادی کے زخم پر مرہم کا کام کر جاتے ہیں اور صرف میٹھی باتوں سے اس کا دکھ درد کم ہو جاتا ہے۔ پولیس افسر کے اس رویہ سے نہ صرف اس کی اپنی نیکنامی ہوگی بلکہ سارے محکمہ کے وقار اور عزت میں اضافہ ہوگا۔ بصورت دیگر اگر وہ پولیس افسر سائل اور فریادی کے ساتھ بدزبانی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آئے گا تو نہ صرف اس کی ذات پر کمینہ اور گھٹیا انسان ہونے کا داغ بنے گا بلکہ وہ سارے محکمہ پولیس کی بدنامی کا سبب بنے گا۔ گویا کسی پولیس افسر کے رویہ سے ہی اچھا یا برا تاثر پیدا ہو کر سارے محکمہ پولیس کا Image بنے گا۔

پولیس افسران جورات دن لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے علاوہ امن و امان قائم کرتے ہیں اپنی نیند، سکون اور سکھ چین کھو کر لوگوں کی عزت اور ناموس کے تحفظ کی خاطر اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے بھی پیش کرتے ہیں تو پھر بھی انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور عوام کو ان کے ساتھ کوئی پیار محبت اور دلی ہمدردی نہیں ہوتی اور نہ ہی معاشرہ کے اندر ان کی کوئی عزت یا احترام ہوتا ہے۔

ہر طبقہ فکر کے لوگ پولیس کے رویہ سے شاکی ہیں۔ پریس اور T.V میڈیا کے ذریعہ پولیس کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ پولیس کے کردار پر اداریے لکھے جاتے ہیں اور ٹی وی ڈراموں میں سب سے گھٹیا رول پولیس افسر کی وردی پہن کر کیا جاتا ہے جسے پڑھ کر اور دیکھ کر عوام کے دلوں میں پولیس کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ ہوتا ہے پولیس کے سینئر افسران نے اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا ہوگا۔ اگر غور کیا ہے تو عوام اور پولیس کے درمیان نفرت اور بداعتمادی کی خلیج کو دور کرنے کی کس حد تک کوشش کی گئی ہے؟

محکمہ پولیس کا کام ملک کے اندر امن و امان قائم رکھنا، ملک کے شہریوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کرنا، مظلوم کے خلاف ظالم کے ہاتھ روکنا اور لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنا ہے۔ اگر کوئی پولیس افسر محنت، ایمانداری اور خلوص نیت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض نبھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتا ہے تو لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ ایک محترم اور باعزت شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ بلاتمیز عدل و انصاف کرنا ہی تو انسانیت کی معراج ہے۔ بڑے لوگوں کے اشارے پر غریب اور کمزور کی تزلیل کرنا تو سراسر ظلم ہے۔

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

محکمہ پولیس کی ساکھ اور شہرت کو اس قدر نقصان پہنچ چکا ہے کہ باوردی پولیس افسر کو دیکھتے ہی لوگ اسے بے ایمانی، ناانصافی اور دھونس دھاندلی کی علامت سمجھنے لگتے ہیں۔ سینئر پولیس افسران کی کاوشوں کے باوجود بھی پولیس افسران عوام کے اندر مقبول ہوتے نظر نہیں آتے۔ بد سے بدنام برا والی بات ہے۔ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کیلئے نمایاں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ سینئر لیول پر اچھی پالیسیاں اختیار کرنے سے فورس کے اندر مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

ابتدائی ٹریننگ کے دوران ایک اچھا پولیس افسر بنانے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بنانے پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ دینی تعلیم اور دل میں خوف خدا کا احساس اجاگر کرنے سے جب وہ ایک صحیح اور کامل انسان بن کر نکلے گا تو اس کی سوچ بھی صحیح ہوگی۔ وہ کسی سینئر افسر یا بااثر وڈیرے کے کہنے پر غلط کام نہیں کرے گا۔ جب بحیثیت مسلمان ہمارا پختہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ سپریم پاور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے عزت اور ذلت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے تو پھر کسی بڑے آدمی کے کہنے پر یا لالچ میں آ کر غلط کام کیوں کریں۔ اللہ تعالیٰ غلط کام کرنے سے منع کرتا ہے اگر ہم کسی بڑے آدمی کے کہنے یا کسی دیگر وجہ سے غلط کام کریں گے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہم بڑے آدمی کے حکم کو مان کر اس کی خوشنودی حاصل کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے صاف انکار کر کے اس کو ناراض کر رہے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ہم پر کرم ہے کہ وہ اپنی حکم عدولی کے باوجود ہماری رسی دراز کرتا جاتا ہے اور توبہ کا موقع فراہم کرتا رہتا ہے۔ وگرنہ شیطان مردود جو بہت بڑا عبادت گزار تھا صرف اللہ کا ایک حکم نہ ماننے سے دھتکار دیا گیا اور آج تک اس پر لعنت بھیجی جا رہی ہے۔

پولیس افسران کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مقدم سمجھ کر اس کی خوشنودی حاصل کریں۔ اگر کوئی سینئر افسر، بااثر وڈیرہ، جاگیردار یا سیاستدان غلط کام نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہوتا ہے تو اس کی ناراضگی مول لے لیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ہرگز ناراض نہ کریں جہاں وہ رحیم اور کریم ہے وہاں جبار اور قہار بھی ہے ہمارے ہر فعل پر اس کی نظر ہے۔

ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ مکافات کا عمل جاری ہے جو کچھ کوئی بوئے گا وہی کاٹے گا نیکی کا بدلہ نیکی اور برائی کا بدلہ برائی میں مل کر ہی رہنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے۔ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے اور پیچھے انسان کی صرف اچھی یا بُری یادیں رہ جاتی ہیں۔

چوہدری سردار محمد صاحب انسپکٹر جنرل پولیس نے اپنے دور میں فورس کے جوانوں کو علم اور قلم کی طرف راغب کرنے اور اخلاق کا درس دینے کی کافی کوشش کی اور ان کو ناجوازی اور تشدد کی پالیسی اختیار کرنے سے روکا جس کے کافی حد تک مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ تشدد کی پالیسی اپنانے سے ممکن ہے کہ وقتی طور پر کچھ فائدہ ہوتا ہو لیکن بعد ازاں اس کا اس قدر شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے جو انتہائی خطرناک اور بھیانک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ بات تجربہ اور ریکارڈ سے ثابت ہے کہ جس دور میں پولیس فورس نے تشدد کی پالیسی اپنائی اس دور میں پولیس افسران کو زیادہ مزاحمت کا

سامنا کرنا پڑا اور پولیس کے زیادہ جوانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں پولس افسر معاملات کی چھان بین کر کے جھوٹ اور سچ کو علیحدہ کر کے اصل حقائق سے عدالت کو آگاہ کرے اور آئندہ کی کارروائی عدالت پر چھوڑ دینی چاہیے۔ عدالتی کارروائی صرف عدالت ہی کی ذمہ داری ہے۔

کامیاب، باوقار اور باعزت پولیس افسر بننے کیلئے پولیس افسر کو نیک اور باکردار ہونا چاہیے۔ سروس کے آغاز سے ہی اپنی عزت اور شہرت کا خیال رکھے کیونکہ ملازمت کے آغاز سے ہی جو پولیس افسر شہرت حاصل کر لیتا ہے وہ شہرت افسر کے ساتھ ساتھ تمام سروس چلتی رہتی ہے۔

ظالم سے نفرت اور مظلوم کا پیار ومحبت سے ساتھ دے اور مظلوم کے خلاف اٹھنے والے ظالم کے ہاتھ کو سختی سے روکے۔ پولیس افسر کو خوش اخلاق اور منصف مزاج ہونا چاہیے۔ لوگوں کے درمیان ہر قیمت پر بلاتفریق عدل وانصاف کی پالیسی پر سختی کے ساتھ عمل کرے۔

جائز کام کے لئے لوگوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ناجائز اور غلط کام خواہ کوئی کتنا بااثر شخص کہے ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ابتداء سے ہی افسر کی یہ شہرت بن جائے گی کہ وہ غلط اور ناجائز کام نہیں کرتا تو اسے ایسا کام کہنے کی کوئی شخص جسارت ہی نہیں کرے گا۔ اپنے فرض کو محنت، ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ نبھایا جائے۔ ہر رپورٹ پر جو پولیس افسر کے قانونی دائرہ اختیار میں ہو فوری اور موثر کارروائی ہونی چاہیے اور سائل کی دادرسی کو یقینی بنایا جائے۔

تھانوں میں لوگ جو چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور مسائل لے کر آتے ہیں باہمی افہام و تفہیم کی پالیسی اپنا کر ان کی آپس میں صلح کرا دینی چاہیے۔ مخلوق خدا کو مزید مسائل میں الجھانے کی بجائے ان کو Relief دیا جائے۔ اس کیلئے عدل بالاحسان کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔

پولیس افسر کو لوگوں کے ساتھ جھوٹے وعدے ہرگز نہیں کرنے چاہئیں اور وقت کی پابندی کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ تھانہ میں جو سائل شکایت لے کر آئے اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے اور پیار ومحبت کے ساتھ اس کی شکایت سن کر اس کی دادرسی کرنی چاہیے۔ حاکم کی بجائے خادم بن کر عوام کی خدمت کرے۔

پولیس افسر کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، خاص طور پر اپنے سینئر افسر اور عدالت کے سامنے جھوٹ ہرگز نہ بولا جائے۔ اپنے سینئر افسر کو ہر قسم کی صورت حال اور مسئلہ سے باخبر رکھنا ضروری ہے۔ کسی مقدمہ کی تفتیش کے دوران پولیس افسر تفتیش کنندہ کی حیثیت منصف اور ثالث کی ہوتی ہے۔ انصاف کے ترازو کے پلڑے کسی فریق کی طرف نہیں جھکنے چاہئیں۔ پولیس افسر خواہ وہ افسر

مہتمم تھانہ ہو، سب ڈویژنل پولیس افسر ہو یا ضلع کا ایس پی ہو ہر طبقہ فکر کے لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھے اور ہر معاملے میں زیادہ سے زیادہ پبلک کو فیس کرے۔

پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا ہو ان کے ساتھ تعلقات خوش گوار ہونے چاہئیں۔ ہر سنگین واقعہ کے متعلق ان کو بروقت بریف کر دینا چاہیے۔ واقعہ چھپانے سے چھپ نہیں سکے گا۔ لیکن اس سے بداعتمادی کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ ایس۔ ایچ۔ او صبح و شام حوالات تھانہ کو چیک کرے اور اس امر کو بھی یقینی بنایا جائے کہ کوئی بے گناہ شخص حوالات تھانے میں بند تو نہیں ہے اور حوالات کے اندر بند ملزمان کے پاس کوئی ممنوع چیز تو نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی چیز جو خودکشی کرنے یا فراری میں ان کی معاون ثابت ہو سکے۔

اچھا پولیس افسر وہ ہے جو علاقہ میں امن و امان قائم رکھتے ہوئے ایسی پالیسی اپنائے کہ بدمعاش اور بدکردار لوگ اس سے خوفزدہ ہوں اور شریف اور دکھی لوگ اسے اپنا ہمدرد اور ساتھی سمجھیں۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کو سکھ پہنچائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محکمہ پولیس کے اندر انصاف پسند، نیک، فرض شناس، ایماندار اور خداترس لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ محکمہ کے اندر چند کالی بھیڑیں سارے محکمہ کو بدنام کر دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا محکمہ ہے جس کے ایک ملازم کی کوتاہی یا غلطی تمام محکمہ کی بدنامی کا سبب بنتی ہے اور عوام اور میڈیا بجائے اس کے کہ اس متعلقہ ملازم کو ذمہ دار ٹھہرائیں تمام محکمہ پولیس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جس سے پولیس کے خلاف نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ جہاں عوام کو پولیس کے اندر کالی بھیڑوں سے نفرت کرنی چاہیے وہاں اچھے اور مثالی پولیس افسران کی حوصلہ افزائی کرنی بھی انتہائی ضروری ہے۔ جہاں عوام پولیس سے مثالی رویہ کی توقع رکھتے ہیں وہاں ان پر بھی یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر موجود معاشرتی برائیوں کو دور کریں کیونکہ چور، ڈاکو، قاتل، لٹیرے، دغاباز، قمار باز، سمگلر، اشیائے خوردنی اور ادویات میں ملاوٹ کر کے اپنے بھائیوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے والے، راشی و مرتشی، عریانی، فحاشی، منشات کی لعنت اور دہشت گردی پھیلانے والے کون ہیں؟ اور وہ کون ہیں جو کمزور اور بے کسوں کی جائدادیں ہڑپ کرتے اور مجبور، بے کس اور بے سہارا لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں؟ یہ تمام لوگ ہمارے اندر موجود ہیں اور ہمارے معاشرہ کا حصہ ہیں۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ملک کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ ان سے نفرت کرنی بھی ضروری ہے۔ پولیس افسران اپنی جان پر کھیل کر ان کا مقابلہ کریں تو محکمہ

کی نیک نامی ہوگی۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

محکمہ پولیس کیلئے مشکلات اوران کا حل

محکمہ پولیس جتنا زیادہ اہم ہے اتنا ہی اسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دلیر، ذہین اور مضبوط اعصاب کا پولیس افسران مشکلات کا سامنا کر سکتا ہے لیکن ایک کمزور پولیس افسر مشکلات کا سامنا نہ کر سکنے کی وجہ سے حوصلہ ہار جاتا ہے اور وہ روٹین کی سروس کر کے وقت گزارنے کی کوشش کرتا ہے اس سے اس کا وجود محکمہ کیلئے ایک بوجھ ثابت ہوتا ہے اور محکمہ کے وقار کو قائم رکھنے کی بجائے وہ محکمہ کیلئے بدنامی کا باعث بنتا ہے جس سے محکمہ کے Image پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ذیل میں چند اہم قسم کی مشکلات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کا آئے دن پولیس افسر کو سامنا کرنا پڑتا ہے:

وسائل کی کمی

کم معاوضہ کے ساتھ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دینا تو پولیس افسر کا معمول بن چکا ہے جو وہ نبھا رہا ہے۔لیکن آج کل کے دور میں گاڑی اور جدید اسلحہ کے بغیر مناسب طریقہ سے فرائض کو سرانجام دینا ناممکن ہو گیا ہے۔جب کہ مجرمان کے پاس نئی گاڑیاں اور خطرناک قسم کا جدید اسلحہ ہوتا ہے اور پولیس افسر کے پاس اول تو گاڑی ہوتی ہی نہیں اگر کسی کے پاس ہو تو وہ بھی پرانی اور ناکارہ جو مجرمان کا ایک کلومیٹر تک بھی تعاقب نہیں کر سکتی۔اس طرح خطرناک مجرمان جدید خودکار اسلحہ سے لیس ہوتے ہیں اور پولیس کے پاس ابھی تک پرانی فرسودہ قسم کی 303 رائفل ہے اور ایمونیشن کا یہ عالم ہے کہ سالانہ چاند ماری کیلئے بھی ایمونیشن کی دستیابی مشکل ہوتی ہے اور پولیس ملازمین کے پاس گنتی کی چند گولیاں ہوتی ہیں۔اکثر خطرناک مجرمان کے ساتھ پولیس مقابلہ کے دوران پولیس ملازمین کے پاس موجود ایمونیشن ختم ہو جاتا ہے اور گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے مجرمان تیز رفتار گاڑی میں پولیس کا ناکہ توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور پولیس ملازمین بیچارگی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔تھانہ میں صرف ایک گاڑی ہوتی ہے جس سے تمام قسم کی ڈیوٹی

مثلاً گشت، ملزم کی گرفتاری کیلئے ریڈ، کچہری و جیل جانے کی ڈیوٹی لی جاتی ہے۔ درمیان میں یہ خراب ہو جائے تو ورکشاپ میں بھی آرام کرنا ہوتا ہے۔ باقی تمام کے تمام تفتیشی افسران اور عملہ یا تو پیدل ہوتا ہے یا ذاتی موٹر سائیکل یا سائیکل کے ذریعہ گزارا کرتے ہیں۔ اکثر سواری مہیا کرنے کا بوجھ مدعی کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو محکمہ پولیس کیلئے بدنامی کا سبب بنتا ہے۔

اکثر تھانوں کی تو اپنی سرکاری عمارت تک نہیں ہے۔ کرایہ کی چھوٹی چھوٹی عمارات میں تھانے بنے ہوئے ہیں چند مقامات پر صرف ٹینٹ لگا کر تھانے چلائے جارہے ہیں۔ ملازمین کیلئے غسل خانوں اور لیٹرین تک کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا۔

تھانہ میں بند ملزمان کی خوراک کیلئے فنڈز نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مدعی کا کردار

تھانے میں جو مدعی رپورٹ لے کر آئے گا اس میں زیادہ تر جھوٹ کی ملاوٹ کرے گا۔ معمولی واقعہ کو بھی جیب وغیرہ پھاڑ کر سرقہ بالجبر اور ڈکیتی کی واردات بنانے کی کوشش کرے گا۔ قتل جیسے سنگین وقوعہ میں بھی بے گناہ اشخاص کو ملوث کر کے ملزمان کی تعداد زیادہ لکھوائے گا اور ہر مدعی کی یہ کوشش ہوگی کہ جو بیان اس نے رپورٹ ابتدائی میں تحریر کروایا ہے اس کو حرف بحرف درست تسلیم کیا جائے اور اس کے بیان کی روشنی میں الزام علیہان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اگر کوئی افسر تفتیش کنندہ حقیقت اور میرٹ پر فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا اور مدعی کے موقف سے اتفاق نہیں کرے گا۔ تو مدعی فوراً اس کے خلاف کرپشن اور عدم اعتمادی کی درخواست دے کر سینئر پولیس افسر سے تفتیش تبدیل کرالے گا اب بے گناہ ملوث کئے گئے اشخاص کو بھی حق حاصل ہے کہ انہیں صحیح انصاف ملے۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ افسر تفتیش کنندہ سے انہیں انصاف کی توقع نہیں ہے تو وہ اس کے خلاف کرپشن اور مدعی کی طرفداری کرنے کا الزام لگا کر سینئر پولیس افسر کو درخواست دے کر تفتیش تبدیل کرالیں گے اس طرح تبدیلی تفتیش کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور کئی ماہ تک مقدمہ زیر تفتیش رہے گا۔ تفتیش کے بھی کئی مرحلے ہیں۔ ابتدائی تفتیش متعلقہ تھانہ کا کوئی تفتیشی افسر کرے گا۔ اس کے بعد ایس۔ ایچ۔ او تھانہ اس کی تصدیق کرے گا۔ کئی اہم مقدمات کی تفتیش کی تصدیق سب ڈویژنل افسر موقع واردات پر جا کر کرے گا۔ اگر اس مرحلہ تک پارٹیاں مطمئن نہیں ہوتیں تو ایس پی ضلع خود جا کر یا کسی دیگر سینئر افسر سے اس مقدمہ کی تفتیش کی تصدیق کرائیں

گے۔اگر ضلع کی حد تک بھی کوئی پارٹی مطمئن نہیں ہوتی تو متعلقہ رینج کے ڈی آئی جی اپنی رینج کے کسی افسر سے تفتیش کروائیں گے۔ہر رینج میں علیٰحدہ رینج کرائم کا ادارہ بھی ہے جس کا سربراہ ایس پی عہدہ کا افسر ہوتا ہے۔اس کے ماتحت ایک ڈی۔ایس۔پی اور کچھ انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور دیگر عملہ ہوتا ہے۔یہ براہ راست ڈی۔آئی۔جی رینج کی نگرانی میں تفتیش کرتے ہیں جو ان کے حکم پر اکثر مقدمات کی تفتیشیں ان کے حوالہ کی جاتی ہیں۔

اب اگر کوئی پارٹی اس مرحلہ پر بھی مطمئن نہیں ہوتی تو انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کی خدمت میں درخواست پیش کر کے تفتیش تبدیل کروالی جاتی ہے۔صاحب موصوف کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ صوبہ کے کسی بھی سینئر افسر سے تفتیش کروائیں یا کرائمز برانچ جو براہ راست انکی نگرانی میں کام کرتی ہے اس سے کروائیں۔کرائمز برانچ پنجاب کا سربراہ ایک ڈی آئی جی عہدہ کا افسر ہوتا ہے جس کے ماتحت چند ایس۔پی اور چند ڈی۔ایس۔پی اور بقایا عملہ انسپکٹر، سب انسپکٹر وغیرہ ہوتے ہیں۔یہ انتہائی اہم ادارہ ہے۔ان کے نتیجہ تفتیش کو حتمی سمجھا جاتا ہے۔اگر کوئی سینئر افسر آئی۔جی یا ڈی۔آئی۔جی کسی پارٹی کی خواہش کے مطابق تفتیش تبدیل نہیں کرتے تو پھر وہ پارٹی وکیل کے ذریعہ عدالت عالیہ میں رٹ دائر کر کے عدالت سے تفتیش تبدیل کرنے کے احکامات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔اِس طریقہ کار سے کئی ماہ مقدمات کی تفتیش ادھر اُدھر مختلف تفتیشی افسران کے پاس چکر کاٹتی رہتی ہے۔مختلف افسران تفتیش کنندہ کی رائے مختلف ہوتی ہے جو اپنی اپنی رائے فائل مقدمہ کی ضمنیات میں تحریر کر دیتے ہیں نتیجتہً مقدمہ کے حالات اتنے مشکوک ہو جاتے ہیں کہ عدالت کو فیصلہ اور انصاف کرنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔

ایک غلط پریکٹس جو عام چل رہی ہے یہ ہے کہ جب کوئی مظلوم کسی زیادتی کرنے والے ظالم شخص کے خلاف مقدمہ درج کراتا ہے تو ظالم شخص اپنا اثر ورسوخ اور دیگر حربے استعمال کر کے پولیس کو جھوٹی رپورٹ دے کر مظلوم شخص کے خلاف جھوٹا کر اس مقدمہ درج کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس سے مظلوم شخص دباؤ میں آ کر اپنا مقدمہ واپس لینے یا صلح کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس طرح ظالم اور مظلوم کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ایسا صرف متعلقہ پولیس افسر کی نااہلی یا ملی بھگت سے ہوتا ہے جہاں قانون کی دفعہ 154 ضابطہ فوجداری کے تحت پولیس افسر پر لازم ہے کہ جرم قابل دست اندازی پولیس کی صورت میں مقدمہ درج کرے وہاں دفعہ 157 ضابطہ فوجداری پولیس افسر کو یہ اختیار بھی دیتی ہے کہ جھوٹی یا مشکوک رپورٹ ہونے کی صورت میں

مقدمہ درج نہ کرے بلکہ روزنامچہ میں رپورٹ درج کر کے اس کی چھان بین کرے۔ اگر مقدمہ درج بھی ہو جائے تو دفعہ 156 ضابطہ فوجداری کے تحت پولیس افسر کو تفتیش کرنے کا اختیار ہے وہ واقعات کی چھان بین کر کے جھوٹے مقدمہ کو ابتدائی سٹیج پر خارج کر کے مدعی کے خلاف جھوٹی رپورٹ درج کرانے پر اس کے خلاف ضابطہ کے تحت کارروائی کرے اس سے جھوٹے مدعی کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ لیکن اکثر واقعات میں کچھ پولیس افسران کی ملی بھگت سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے واقعات میں سینئر افسران دلچسپی لے کر توجہ کے ساتھ نگرانی کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرا سکتے ہیں اور پولیس افسر کی ناجوازی پر اس کے خلاف تادیبی کارروائی کر سکتے ہیں۔

لارڈ میکالے نے برصغیر کیلئے جو قانون بنایا تھا اس میں جھوٹ بولنے یا جھوٹی رپورٹ درج کرانے، دغا، دھوکہ، فراڈ اور کسی دوسرے کی جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کو زیادہ سنگین جرم قرار نہیں دیا تھا۔ جس سے بااثر، جابر اور طاقتور شخص نے ناجائز فائدہ اٹھا کر کمزور شخص کا استحصال کیا۔

ابتدائی افسر تفتیش کنندہ اگر کچھ بھی سوجھ بوجھ رکھتا ہو تو موقعہ واردات پر پہنچ کر اسے اصل حالات کا علم ہو جاتا ہے۔ ایس۔ ایچ۔ او اور سب ڈویژنل پولیس افسر سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اگر یہ تینوں ہاتھ محنت ایمانداری اور خلوص نیت کے ساتھ مل کر کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ انصاف کے تقاضے ابتدائی سٹیج پر پورے نہ ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ افسران سیاسی دباؤ یا ذاتی لالچ کی بنا پر انصاف کے ترازو کا توازن قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں جس سے آئندہ کئی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ راقم کی چالیس سالہ سروس کا نچوڑ ہے کہ اگر کوئی افسر غلط کام کرے گا تو اس سے غلط کام کروائے جائیں گے۔ لیکن اگر کسی افسر کی شہرت یہ ہوگی کہ وہ غلط کام نہیں کرتا اور انصاف پسند ہے تو پھر اسے کوئی بااثر شخص، دوست احباب یا سینئر افسر غلط کام کہنے کی سفارش بھی نہیں کریں گے۔

بدقسمتی سے تھانوں میں تفتیش کا طریقہ کار بھی درست نہیں ہے۔ مدعی کی رپورٹ پر الزام علیہیان کے خلاف رپورٹ ابتدائی چاک کرنے کے بعد کسی افسر کو اس مقدمہ کی تفتیش پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ افسر تفتیش کنندہ رپورٹ ابتدائی کی نقل لے کر الزام علیہیان کے مسکن پر چھاپہ مار کر نامزد الزام علیہیان کو پکڑ کر حوالات تھانہ میں بند کر دیتا ہے اور رپورٹ ابتدائی میں دیے گئے گواہان کے بیانات سے رپورٹ ابتدائی کی تائید کرائی جاتی ہے اور بغیر تفتیش کے الزام علیہیان کو یا

تو حوالات جوڈیشل بھجوادیا جاتا ہے یاان کا جسمانی ریمانڈ حاصل کیا جاتا ہے۔اس طریقہ کار سے جھوٹے مدعی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پولیس افسر کو خیال کرنا چاہیے کہ رپورٹ ابتدائی تو ایک شخص کا بیان ہے۔ اگراس نے سچا بیان دیا ہے تو رپورٹ ابتدائی بھی سچی ہوگی اگر بیان جھوٹا ہے تو رپورٹ ابتدائی بھی جھوٹی ہوگی۔اس کی ذمہ داری تو افسر تفتیش کنندہ پر عائد ہوتی ہے جس کا فرض ہے کہ دونوں فریق کا موقف سنے۔گواہان کے بیانات حاصل کرنے اور مکمل چھان بین کر کے اصلیت کو صفحہ مثل پر لا کر حقیقی گنہگار کے خلاف کارروائی کرے اور بے گناہ کو اپنا حق دیا جائے۔افسر تفتیش کنندہ کا یہ فرض منصبی ہے کہ تفتیش کے دوران شہادت اکٹھی کرے اور اصل حقائق سے عدالت کو آگاہ کرے۔اس میں سینئر افسران کو چاہیے کہ وہ تفتیش کنندہ افسر کی صحیح راہنمائی کریں اور تفتیش پر گہری نظر رکھتے ہوئے انصاف کو یقینی بنائیں۔ یہ غلط ہے کہ اگر کوئی ماتحت افسر انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے رپورٹ ابتدائی میں کسی نامزد الزام علیہ کو بے گناہ قرار دیتا ہے تو سینئر افسر اس امر کا شوکاز نوٹس جاری کرے کہ رپورٹ ابتدائی میں نامزد الزام علیہ کو کیوں بے گناہ تحریر کیا گیا ہے۔سینئر افسر کے اس رویہ سے ماتحت افسر کی حوصلہ شکنی ہوگی اور وہ آئندہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام رہے گا۔سینئر افسران کو چاہئے کہ ماتحتان کی صحیح رہنمائی کریں، انصاف کی تلقین کریں اور مقدمات کی تفتیش خالص میرٹ پر کرنے کو یقینی بنائیں۔اگر کوئی ماتحت افسر دانستہ مقدمہ کو خراب کرتا ہے تو اسے مثالی سزا دی جانی چاہیے۔اس میں ضروری بات یہ ہے کہ سب ڈویژنل پولیس افسر یا ایس۔پی ضلع جو سپروائزری رول ادا کرتے ہیں ان کو خود تھانہ کی ورکنگ اور قانون پر مکمل عبور حاصل ہو۔بصورت دیگر وہ ہوشیار اور چالاک قسم کے ماتحتوں کے چکر میں آ کر اپنا اصل رول ادا کرنے میں ناکام رہیں گے۔

ایس پی ضلع یا سب ڈویژنل پولیس افسر پبلک کو زیادہ سے زیادہ فیس کریں۔اپنی ذات تک پبلک کی رسائی کو آسان اور یقینی بنائیں اور ان کو اعتماد میں لے کر ان کی دادرسی اور انصاف کریں تو بہت جلد عوام کے اندر اعتماد کی فضا بحال ہو جائے گی۔ جب پبلک پولیس افسران پر اعتماد کرنا شروع کر دے گی تو کئی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

16 سال یا زیادہ عمر کے ہر شخص کے فنگر پرنٹس بمعہ کوائف کمپیوٹرائزڈ ہونے چاہئیں۔اس سے جعلی شناختی کارڈ بننے یا دیگر جعلی ڈاکومنٹس تیار کرنے کی حوصلہ شکنی ہوگی اور عدم شناخت نعشوں

کا مسئلہ بھی بہ آسانی حل ہو جایا کرے گا۔

محکمہ پولیس میں واچ اینڈ وارڈ کیلئے تو شفٹ سسٹم کامیاب ہو سکتا ہے۔لیکن مقدمات کی تفتیش میں تفتیش کنندہ سٹاف کیلئے شفٹ سسٹم کامیاب نہیں ہوگا۔

عدالتوں کو پولیس افسران کی تفتیشوں پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ جب بھی کوئی پولیس افسر فائل مکمل کر کے چالان عدالت میں بھجوائیگا تو عدالت اس فائل پر ہر گز اعتماد نہیں کرے گی۔اسے جھوٹ کا پلندہ سمجھا جاتا ہے۔ایک وقت تھا کہ عدالتیں پولیس افسروں کی تفتیش پر مکمل اعتماد کرتی تھیں لیکن آج کل کوئی اعتماد نہیں ہے۔صاف ظاہر ہے کہ تفتیشیوں کا معیار اتنا ناقص ہو چکا ہے کہ عدالت کیلئے انصاف کرنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔ یہ مسئلہ انتہائی گھمبیر ہے اور سینئر پولیس افسران کیلئے توجہ طلب ہے۔

ایک وقت تھا کہ ایکسپرٹ کی رائے پر عدالتیں کافی اعتماد کرتی تھیں اور اس کی رائے کا مقدمے کے فیصلے پر کافی عمل دخل ہوتا تھا۔لیکن آج کل ایکسپرٹ کی رائے پر اعتماد کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرنا بھی مشکوک ہو گیا ہے۔عادی مجرم اور چالاک قسم کے جرائم پیشہ لوگ عدالتی بیلف کے ذریعہ بھی پولیس کو پریشان کر کے مرعوب کر لیتے ہیں۔ پولیس کو ملزم کے ریمانڈ کے حصول میں کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اور کئی دفعہ گناہ گار ملزم ابتدائی سٹیج پر اس لئے ڈسچارج کر دئے جاتے ہیں کہ تفتیشی افسران خود جا کر عدالت کو حالات سے آگاہ نہیں کرتے بلکہ کسی کانسٹیبل کو فائل دے کر عدالت میں بھیج دیتے ہیں جس کو مقدمہ کے حالات کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ان حالات میں اگر کوئی پولیس افسر ذاتی دلچسپی لے کر عدالت کو اصل حقائق سے آگاہ کرے تو بہتری کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

ایک زیادہ اہم اور توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ خطرناک قسم کے چوروں اور ڈاکوؤں کے گینگ جن کو پولیس بڑی جانفشانی، محنت اور تگ و دو کے بعد گرفتار کرتی ہے کچھ عرصہ بعد جب عدالت سے ضمانت منظور ہوتی ہے تو جعلی ضمانت نامے پیش کر کے رہا ہو جاتے ہیں اور بعد میں عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔اس طرح عدالتوں سے غیر حاضر ہو کے مفرور ہو جاتے ہیں اور پھر سرگرم عمل ہو کر وارداتیں شروع کر دیتے ہیں۔عدالتوں سے ریکارڈ حاصل کر کے جعلی ضمانتوں اور ٹاؤٹوں کے خلاف موثر قانونی کارروائی کرنے اور متعلقہ لیگل برانچ کے افسران کو الرٹ کرنے سے اس کا انسداد ہو سکتا ہے۔

دیہاتوں سے شہروں میں منتقل ہونے کے رجحان کی وجہ سے شہروں کی آبادی میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔ اکثر مجرمان بڑے شہروں کی مضافاتی بستیوں میں مکان کرایہ پر حاصل کرکے عارضی طور پر رہائش پذیر ہوکر اپنے مذموم مقاصد میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ اس سے جرائم کا گراف کافی اوپر چلا جاتا ہے۔ جرائم کے انسداد کا موثر ذریعہ جرائم کی Detection ہوتا ہے۔ اگر ایس۔ ایچ۔ او اپنے علاقہ کے پراپرٹی ڈیلروں کے ذریعہ ایسے لوگوں کا ریکارڈ چیک کرائے اور باقاعدہ چھان بین کرے تو ایسے لوگوں کو بے نقاب کر کے جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ پولیس کے لیے ایک مشکل یہ بھی ہے کہ خاص طور پر چوری اور ڈکیتی کے مقدمات میں مدعی کو اپنا مال مل جائے تو مقدمے کے ساتھ اسے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اول تو وہ عدالت میں گواہی دینے کیلئے پیش نہیں ہوتا اگر پیش ہو کر گواہی دے تو منحرف ہوجاتا ہے۔ اس سے خطرناک قسم کے چور ڈاکو عدالت سے بری ہوجاتے ہیں۔ یہ امر پولیس افسروں کیلئے خاصی پریشانی کا سبب بنتا ہے کیونکہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر شب و روز کی محنت سے وہ مجرمان کو گرفتار کر کے مال برآمد کرتے ہیں۔ مدعی کا عدم تعاون پولیس افسران کی حوصلہ شکنی اور مجرمان کی حوصلہ افزائی کا سبب بنتا ہے۔ ان حالات میں اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک پیشہ ور ایس ایچ او عقلمندی اور حکمت عملی سے مدعی کو اپنے اعتماد میں لے کر ذاتی دلچسپی سے ملزمان کو عدالت سے سزا کرا سکتا ہے۔

ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی ہے وہ پولیس افسران کا ایک دوسرے سے عدم تعاون ہے اور ایک دوسرے سے رابطہ کا سلسلہ انتہائی ناقص ہے۔ کئی مجرمان اشتہاری دوسرے تھانے میں گرفتار ہو کر ضمانت پر رہا ہوجاتے ہیں اور جس تھانے کا وہ مجرم اشتہاری ہوگا اس کو پتہ نہیں چل سکے گا۔ اس طرح لاہور کے کسی تھانے سے کار یا موٹر سائیکل چوری ہوتی ہے اور وہ ضلع گوجرانوالہ کے کسی تھانے میں لاوارث مل جاتی ہے تو تین چار ماہ تک متعلقہ تھانے کو یہ علم ہی نہیں ہوسکے گا کہ اس کے علاقہ سے چوری شدہ گاڑی فلاں تھانے میں پکڑی گئی ہے۔ اس طرح لاہور شہر کی کئی مثالیں ہیں کہ ایک تھانہ سے گاڑی چوری ہوتی ہے اور وہ لاہور شہر ہی کے دوسرے تھانہ میں لاوارث پکڑی جاتی ہے لیکن کئی ماہ تک متعلقہ تھانہ کو پتہ نہیں چل پاتا۔ وائرلیس اور ٹیلیفون کا موثر نظام موجود ہے۔ جب گاڑی چوری ہوتی ہے تو وائرلیس پر باقاعدہ اناؤنس کیا جاتا ہے۔ اس میں یا تو اناؤنسمنٹ کا نظام صحیح نہیں ہے یا متعلقہ چینل پر وائرلیس کنٹرول اناؤنس کر دیتا ہے اور بقایا چینلز کو اطلاع نہیں دی جاتی۔ بہرحال یہ ایک ایسا خلا ہے جو محکمہ پولیس کے Image پر کافی

منفی اثرات چھوڑتا ہے۔

اس کے لیے بذریعہ وائرلیس کنٹرول تمام چینلز پر اناؤنسمنٹ کا موثر انتظام ہونا چاہیے اور ہر ایس۔ایچ۔او محرر تھانہ کے ذریعہ روزانہ چوری ہونے والی گاڑیوں کی تفصیل ایک رجسٹر میں درج کرائے اور اس کی تفصیل تھانہ کے تمام تفتیشی افسران کو مہیا کرے۔ایسا کرنے سے یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ ویسے تو ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر مسروقہ گاڑی کی اطلاع سی۔آئی۔اے کی سی آر او برانچ میں بھیجی جاتی ہے۔وہاں سے بذریعہ مشتہری گزٹ تمام اضلاع کی پولیس کو اطلاع بھیجتے ہیں۔لیکن چونکہ یہ سلسلہ بذریعہ ڈاک چلتا ہے اس لئے اس میں کافی تاخیر ہو جاتی ہے اور عام طور پر ایس ایچ او صاحبان ان گزٹ کو غور سے پڑھتے بھی نہیں حالانکہ یہ انتہائی ضروری Document ہے۔ایس ایچ او کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کو بغور پڑھے، اس سے مسروقہ گاڑیوں کے علاوہ بھی کئی مفید اطلاعات مل سکتی ہیں۔

پولیس کے لیے ایک اور مرحلہ بھی بہت پریشان کن ہوتا ہے کہ کوئی سنگین واردات ہونے پر لوگ جلوس کی شکل اختیار کر کے سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔اس سے پولیس افسران کی توجہ اصل کام سے ہٹ کر امن و امان قائم کرنے میں لگ جاتی ہے جس کا فائدہ مجرمان کو پہنچتا ہے۔

پاکستان کے اندر کئی علاقے ایسے ہیں جن کو "علاقہ غیر" کہا جاتا ہے۔ایسے علاقوں میں قبائلی دستور چلتا ہے۔ پولیس ان کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتی بلکہ اس علاقہ میں پولیس کا داخلہ بھی ممنوع ہوتا ہے۔ اکثر خطرناک مجرمان سنگین قسم کے جرائم کا ارتکاب کر کے علاقہ غیر میں چلے جاتے ہیں اور وہاں عارضی یا مستقل رہائش رکھ لیتے ہیں۔اس طرح سے وہ قانون کے شکنجے سے محفوظ رہتے ہیں۔ منشیات اور ناجائز اسلحہ کی سپلائی بھی علاقہ غیر سے ہوتی ہے۔ گویا پاکستان ایک ایسی سٹیٹ ہے جس کے اندر کئی دوسری سٹیٹس ہیں جہاں پاکستان کا قانون بے بس ہے۔

کچھ سیاستدانوں کی مداخلت پولیس افسران کیلئے کئی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ جائز کاموں کی حد تک سیاستدانوں کو ضرور Oblige کرنا چاہیے لیکن جہاں تک ناجائز کام اور پولیس افسران کی ترقی، تقرری، تعیناتی اور تبادلوں کا معاملہ ہے اس میں سیاستدانوں کی مداخلت ایک ڈسپلن کی پابند فورس کے ساتھ زیادتی ہے۔

ان کی ترقی، تقرری، سزا اور تبادلوں کا اختیار ان کے سینئر افسران کو ہوتا ہے جو موزوں افسر سے موزوں جگہ پر کام لینا جانتے ہیں۔ سیاسی مداخلت نے پولیس کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ سیاسی دور میں نااہل اور بددیانت افسران اچھی پوسٹنگ لے لیتے ہیں اور ایماندار اور اچھے لوگ کھڈے لائن لگا دیئے جاتے ہیں، بلکہ اب تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ اکثر افسران کو مختلف سیاسی شخصیات سے منسوب کیا جاتا ہے کہ فلاں افسر فلاں سیاسی شخصیت کا بندہ ہے اور فلاں افسر فلاں سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کی تقسیم نے محکمہ پولیس کے Image اور وقار کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ماتحت کو اپنے سینئر پر کوئی اعتماد نہیں رہا اور اکثر افسر سیاسی اور با اثر شخصیات کے دروازوں پر چکر لگاتے نظر آتے ہیں اور سیاسی سفارش کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

اس حالت زار کو دیکھ کر محکمہ پولیس کے سینئر افسران کو سنجیدگی سے اس پر غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اگر ہر ضلع کا ایس پی ہر ہفتہ اپنے ماتحت افسران کی تکالیف اور شکایات سنے اور میرٹ کے مطابق ان کو حل کرے۔ تمام ڈی آئی جی اپنی اپنی رینج میں اور انسپکٹر جنرل پولیس صوبہ میں دربار لگا کر اپنے ماتحت افسران کی شکایات اور مسائل سنیں اور ان کو میرٹ پر حل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ماتحت افسران ان پر اعتماد نہ کریں۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ماتحت افسر اپنے کسی جائز مسئلہ یا جائز تکلیف کیلئے اپنے سینئر افسر کے پیش ہوتا ہے تو عام طور پر اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔

پھر وہ سیاسی سفارش تلاش کرتا ہے اور سیاسی سفارش کے ذریعہ اسی افسر سے اپنا کام کروالیتا ہے تو قارئین کرام آپ انصاف کریں کہ اس ماتحت افسر کی وفاداری اپنے سینئر افسر کے ساتھ ہوگی یا اس سیاسی شخصیت کے ساتھ ہوگی جس کی سفارش پر اس کا کام ہوا ہے؟ اس کی میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

سی۔ آئی۔ اے لاہور میں تعیناتی کے دوران میرے ایک انتہائی محنتی، ان تھک اور دلیر انسپکٹر کا تبادلہ ایس ایس پی لاہور نے پولیس لائن میں کر دیا۔ میں نے اس کے تبادلہ کی منسوخی کیلئے ایس ایس پی کی خدمت میں زبانی اور تحریری سفارش کی لیکن تبادلہ منسوخ نہ کیا گیا۔ متعلقہ انسپکٹر نے میرے پاس آ کر اپنے تبادلہ کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے اسے صاف صاف بتلا دیا کہ ایس ایس پی صاحب نہیں مان رہے۔ اس نے کہا کہ سر اگر آپ ناراض نہ ہوں اور اجازت دیں تو کل بارہ بجے سے پہلے پہلے میں اپنا تبادلہ منسوخ کرا لیتا ہوں۔ میں نے اجازت دے دی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اس نے مجھے اپنے تبادلہ کی منسوخی کے آرڈر

دکھائے اور سب کچھ بتلا دیا کہ کون سی سیاسی سفارش استعمال کی۔ میرے حساب سے وہ سفارش بھی کوئی اتنی اہم نہیں تھی۔ اب اس انسپکٹر کا تبادلہ تو منسوخ ہو گیا لیکن سینئر پر اعتماد ختم ہو گیا۔ بعد میں اس نے سرکاری کاموں کے بجائے متعلقہ سیاسی شخصیت کے کاموں پر زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس طرح ایک اچھے پولیس افسر کی وفاداری اپنے محکمہ سے ہٹ کر ایک سیاسی شخصیت کے ساتھ ہو گئی۔ اس سلسلہ کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک ڈی آئی جی نے میری موجودگی میں انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کو ٹیلیفون کیا کہ فلاں ڈی۔ ایس۔ پی کے خلاف علاقہ سے کافی شکایات آ رہی ہیں کہ وہ کھلے عام رشوت لے رہا ہے، مہربانی کر کے اسے وہاں سے تبدیل کر دیا جائے۔ آئی جی صاحب نے جواب میں اس ضلع کی ایک با اثر سیاسی شخصیت کا نام لے کر کہا کہ پہلے آپ ان سے Clearance لے لیں۔

ان حالات میں اس فورس کا کیا حال ہوگا جو نظم و نسق چلانے کی ذمہ دار ہے اور جس کے ذمے انتہائی اہم فرائض ہیں۔

سینئر پولیس افسران میرٹ کی پالیسی اختیار کریں۔ اپنی فورس کے ساتھ انصاف کریں۔ ان کے جائز مسائل ضرور حل کریں تا کہ ان کو کسی اور کا سہارا نہ لینا پڑے۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آرمی کی طرح اسے بھی فورس بنایا جائے۔ اس کی تقرری، ترقی، پوسٹنگ اور ٹرانسفرز آرمی پیٹرن اور رولز کے مطابق کی جائیں اور آرمی معیار کے مطابق اسے چلایا جائے تو بہتر سے بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بصورت دیگر اس کو فورس کہنا مذاق ہے۔ یہ کیسی فورس ہے جس کے صوبائی سربراہ انسپکٹر جنرل پولیس کو بغیر کسی قصور کے ایک ایم پی اے تبدیل کرا دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی مثالی فورس ہو جس پر کوئی سیاستدان، وڈیرہ، با اثر شخص اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ایسی فورس ہو جو جرائم پیشہ اور بدکردار لوگوں کے خلاف آہنی ہاتھ استعمال کر کے معاشرہ کو ان سے پاک کرے اور مظلوم اور شریف لوگوں کی صحیح معنوں میں خدمت کرے۔ یہ ظالم کیلئے فورس ہو اور مظلوم کیلئے خادم ہو۔

محکمہ پولیس کے اندر موجود کالی بھیڑوں اور قابل نفرت لوگوں سے نفرت ضرور کرنی چاہیے لیکن اس حد تک نہیں جو ذیل کی تصویروں سے ظاہر ہے۔

لوگوں کی جان مال، عزت اور ناموس کے تحفظ کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں سے اتنی نفرت کیوں؟



شاہ عالمی لاہور میں مظاہرین ایک پولیس افسر کا ریوالور چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں



شاہ عالمی پولیس اور دکانداروں کے تصادم میں زخمی ہونے والا ایک پولیس اہلکار



شاہ عالم مارکیٹ میں دکانداروں اور پولیس کے درمیان تصادم میں ایک پولیس افسر کو نوجوانوں نے گھیرا ہوا ہے۔ پولیس افسر رو رہا ہے۔



احتجاجی مظاہرہ کے دوران کارکن پولیس اہلکار کی پٹائی کر رہے ہیں



سرکلر روڈ پر مظاہرین ایک پولیس والے کی پٹائی کررہے ہیں۔



شاہراہ قائداعظم پر دو پولیس والے اور طلبہ۔



سرکلر روڈ پر ایک کارکن پولیس والے کو ماررہا ہے۔

علمائے کرام

علماء دین کے ستون ہیں۔ دین اسلام کا پرچار کرنے اور اس کو پھیلانے میں ان کا کردار انتہائی اہم ہے۔ وعظ و نصیحت کے ذریعہ بدی سے بچاؤ اور نیکی کی تلقین کر کے لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

جہاں علماء کے اچھے عمل کے ذریعہ نیکی کو بدی پر غالب ہونے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں بدقسمتی سے کچھ علماء اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر ملک کے اندر انتشار اور مذہبی کشیدگی پھیلانے کا سبب بن رہے ہیں جس سے کئی نامور عالم دین، مفکر، سکالرز، ڈاکٹرز، پروفیسرز اور دانشور مذہبی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اِس سے دنیا میں ہمارا ملک نہ صرف بدنام ہوا ہے بلکہ معاشی طور پر بھی کافی کمزور ہو گیا ہے۔ علمائے کرام خواہ وہ کسی ملک یا مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہوں ان کیلئے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ان کو یہ اچھی طرح علم ہے کہ یہ ملک کتنی جانی اور مالی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ خدانخواستہ اس ملک کو کچھ ہوا تو آئندہ نسلوں کو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ یاد رکھیں کہ آئندہ نسلیں ہمیں ہرگز معاف نہیں کریں گی۔

علمائے کرام مختلف فرقوں میں بٹنے کی بجائے صرف مسلمان اور پاکستانی بن کر نئے جذبہ اور ولولہ کے ساتھ میدان میں آئیں۔ تمام مسلمان پاکستانی قوم کو اتحاد و یک جہتی کا درس دے کر فرقہ وارانہ کشیدگی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکیں۔ ملک کے اندر نیکی کو پھیلائیں۔ اس سے نہ صرف ملک کے اندر امن کی فضا قائم ہوگی بلکہ ملکی معیشت بھی مضبوط ہوگی اور پاکستانی قوم خوشحال ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنی مقدس کتاب قرآن حکیم میں فرماتے ہیں

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

اوران لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور واضح احکام آنے کے بعد ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بڑا عذاب ہوگا۔ (سورہ آل عمران آیت ۱۰۵)

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ○

جن لوگوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے نکالے اور کئی کئی فرقے ہو گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں ان کا کام خدا کے حوالے پھر جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کو سب بتائے گا۔

(سورہ الانعام آیت ۱۵۹)

مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ○

(اور نہ) ان لوگوں میں ہونا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور (خود) فرقے فرقے ہو گئے۔ سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔

(سورہ الروم آیت ۳۲)

مذہبی منافرت اور گروہ بندی کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

وا نہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زبان
چھپ کے بیٹھا ہوا ہے ہنگامہ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھے تیری تقریر سے
منفعت ایک ہی ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہے سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی جو ہوتے مسلمان بھی ایک

علماء قرآن حکیم کے فرمان اور علامہ اقبال کے ارشاد کی روشنی میں مسلمانوں میں اتحاد، اخوت، بھائی چارہ اور یک جہتی کی فضا پیدا کریں۔ اس سے انشاء اللہ ہمارا پیارا وطن جو لاکھوں قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے امن کا گہوارہ بن کر ترقی اور خوشحالی کی طرف گامزن ہوگا۔

سیاستدان

اچھے سیاستدان کسی بھی ملک کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں جو اچھی منصوبہ بندی کر کے اس ملک کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چلاتے ہیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خان کے بعد ہمیں کوئی مخلص اور ایماندار لیڈر نہیں ملا۔ فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کے دور میں کچھ اچھی منصوبہ بندی ہوئی جس سے پاکستان ترقی اور خوشحالی کی طرف گامزن ہوا جسے پاکستان کی تاریخ کا بہترین دور کہہ سکتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کا دور اگرچہ کافی لمبا تھا لیکن ماسوائے ہیروئن اور کلاشنکوف Introduce ہونے کے کوئی نمایاں کام نہیں ہوئے، ہاں البتہ اسلام کی طرف چند قدم کا فاصلہ طے کیا۔ 17 اگست 1988ء جنرل محمد ضیاء الحق کی وفات کے بعد پاکستان کا ہر قدم تنزلی کی طرف گیا۔ اس کی ذمہ داری ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے ملک کو داؤ پر لگا دیا۔ قوم کا پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ سرکاری فنڈز سے کروڑوں روپے اپنے اپنے سیاسی جلسے کامیاب کرانے پر خرچ کئے جاتے رہے۔ ملک کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا گیا۔ 2 دسمبر 1988ء سے 6 اگست 1990ء کا دور جب ایک بڑی سیاسی پارٹی کی سربراہ ملک کی وزیراعظم اور دوسری بڑی پارٹی کے سربراہ صوبہ پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے، یہ دور پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور تھا۔ اس دور میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے حواریوں نے اپنے اپنے لیڈروں کو خوب بلیک میل کیا۔ کلاشنکوف کلچر، قبضہ گروپ اور اسمگلر پاکستان کی سیاست پر چھا گئے۔ بار بار کے الیکشن اور دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کی رسہ کشی نے ملک کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا جس نے ملکی معیشت پر انتہائی منفی اثرات چھوڑے اور ترقی ایک خواب بن کر رہ گئی۔ پاکستان کے عوام سیاستدانوں کے رویہ سے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ 12 اکتوبر 1999ء کو جب سیاسی دور ختم ہوا تو لوگوں نے گھر گھر خوشیاں منائیں۔ سیاستدانوں کے کردار پر مختلف اخبارات میں مختلف شخصیات کی طرف سے

وقتاً فوقتاً نکتہ چینی ہوتی رہی ہے اور اداریے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اگست 1998ء میں قومی اخبارات میں عمران خان کے حوالہ سے ایک بیان شائع ہوا کہ اسمبلی میں مراثیوں کے ٹولہ کا قبضہ ہے۔ اس بیان پر مولا بخش عرف پیرو مراثی نے اعتراض کیا تھا کہ نہ تو انہوں نے کبھی بینکوں سے قرض لیا ہے اور نہ ہی وہ چور ڈاکو اور قاتل کو پناہ دیتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے قومی خزانے کو لوٹا ہے۔ وہ تو شرافت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، سیاستدانوں کو ان سے تشبیہ دینا سراسر زیادتی ہے۔ اس سے ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

9 اگست 1998ء کے ایک قومی اخبار میں جناب خالد اعوان کے حوالہ سے ایک مضمون شائع ہوا ''سوروں کو نکیل''۔ سوروں کی فطرت اجاڑنا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی اس نیک فطرت پر عمل کرتے ہوئے اپنے پیارے ملک پاکستان کو اجاڑا ہے۔ ان کو کسی ایرانی سرکس کے پنجروں میں بند کر کے تمام ملک میں گھمایا جائے۔ مورخہ 14 مئی 2001 کے ایک قومی اخبار پر مشہور کالم نویس جناب حسن نثار نے ایک کالم، ''اجتماعی اعمال کا کشید کردہ عطر'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ جس میں انہوں نے سیاست کی تعریف کرتے ہوئے مزید لکھا ''لیکن ہمارے ملک کی حکومت جیب کتروں، بنارسی ٹھگوں، گھٹیا قسم کے مہم جوؤں، رنگ بازوں، چھچھوروں، خودغرض لالچیوں اور ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ گئی جن کے دماغ چھوٹے اور اوجھڑیاں بہت بڑی تھیں''۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے اپنے ستاستدانوں کے متعلق ایسی باتیں پڑھ کر مجھے انتہائی صدمہ اور دکھ ہوا کہ یہ ہے عزت ہمارے ملک کے سیاستدانوں کی۔ اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ یورپ میں ایک بچہ کے والدین اُسے سکول میں داخل کرانے سے قبل ماہر نفسیات کے پاس لے گئے تا کہ چیک کرائیں اس کا دماغ کدھر چلے گا۔ ماہر نفسیات نے ایک کمرے میں نوٹوں کی گٹھی، بائبل کی کتاب اور شراب کی بوتل رکھ دی۔ نوٹوں کی گٹھی اٹھائے گا تو کاروباری ذہن، بائبل کی کتاب اٹھائے گا تو مذہبی رجحان اور شراب کی بوتل اٹھائے گا تو شو بزنس کی طرف جائے گا۔ بچے کو کمرہ کے اندر بھیجا گیا۔ شیشے سے دیکھا کہ بچے نے تمام چیزیں اٹھالیں اور چل دیا۔ ماہر نفسیات نے بچے کے والدین کو مبارک باد دی کہ بچہ بڑا ہو کر سیاستدان بنے گا۔

سیاستدانوں میں اچھے لوگ بھی ہیں لیکن ان کو آگے آنے کا موقع کم ملتا ہے۔ صرف دولت کمانے کی خاطر سیاست میں حصہ لینا نہ صرف اپنے بلکہ قوم اور ملک پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ صرف دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اگر عزت نہ ہو تو دولت کس کام کی؟ دولت سے نفرت

کرنے والے بزرگان کے نام آج تک زندہ ہیں۔اور دولت کے پجاریوں کا آج کوئی نام لیوا بھی نہیں۔ یہ تو ایسی بے وفا ہے کہ ہمیشہ کیلئے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیتی۔بابا گورونانک نے دولت کے متعلق فرمایا ”پاپاں باجھ نہ جڑدی نانک تے مویاں ساتھ نہ جاندی“۔ایک اور بزرگ نے کیا خوب کہا۔

مایہ تو ٹھگنی بھئی ٹھگتی پھرے سنسار
جس ٹھگ نے ایہہ ٹھگنی ٹھگی تُس ٹھگ کو نمسکار

سیاستدانوں کو اگر کبھی آئندہ اقتدار کا موقع مل جائے تو محنت، ایمانداری اور خلوص نیت سے اس ملک کی بنیادیں مضبوط کریں اور ایک مخلص اور محبِّ وطن شہری ہونے کا ثبوت دیں۔ یہ جان لیں کہ ہماری شہرت عزت بلکہ سب کچھ اسی کے دم سے ہے۔ہم خود انصاف کریں اور اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ پاکستان بننے سے قبل ہم کیا تھے اور پاکستان بننے کے بعد ہم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔عزت، دولت، منصب اور شہرت سب کچھ اس پیارے وطن کی بدولت ہے۔ پھر ہم اس پیارے وطن کے ساتھ انصاف کیوں نہ کریں! یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ اس ملک کی دی ہوئی دولت سے ہم غیروں کے پیٹ بھر رہے ہیں اور اپنے ملک کو معاشی طور پر کھوکھلا اور کمزور کر رہے ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں نے اقتدار کی خاطر اس پیارے وطن سے جو سلوک کیا اور پھر جو ان کا انجام ہوا اس کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔

14 اگست 1947ء کو نواب زادہ لیاقت علی خان اس ملک کے وزیر اعظم بنے۔4 سال 2 ماہ 2 دن وزیر اعظم رہنے کے بعد راولپنڈی کے جلسہ عام میں گولی مار کر شہید کر دیئے گئے۔اس کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے جو 16 اکتوبر 1951ء سے 17 اپریل 1953ء تک صرف ایک سال 6 ماہ اور ایک دن اس منصب پر فائض رہے جن کو گورنر جنرل غلام محمد نے عہدے سے بر طرف کر دیا۔اس کے بعد محمد علی بوگرہ 17 اپریل 1953ء سے 11 اگست 1955ء تک 2 سال 3 ماہ 24 دن وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد مستعفیٰ ہو گئے۔ان کے بعد چوہدری محمد علی نے بطور وزیر اعظم ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔11 اگست 1955ء سے 12 ستمبر 1956ء تک ایک سال ایک ماہ کے بعد اسمبلی میں اکثریت برقرار نہ رکھنے کی بنا پر انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔اس کے بعد حسن شہید سہروردی 12 ستمبر 1956ء سے 17 اکتوبر 1957ء ایک سال ایک ماہ اور پانچ دن ملک کے وزیر اعظم رہے اور بالآخر اکثریت برقرار نہ رکھنے پر وزارت عظمیٰ ختم ہو گئی۔اب بالکل

مختصر عرصہ کیلئے اسماعیل ابراہیم چندیگر کو 18 اکتوبر 1957ء سے 11 دسمبر 1957ء تک صرف ایک ماہ 23 دن کیلئے موقع ملا۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں بھی اکثریت برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے یہ عہدہ چھوڑنا پڑا۔ پھر 13 دسمبر 1957ء سے 8 اکتوبر 1958ء تک 9 ماہ 5 دن ملک فیروز خان نون وزیر اعظم بنے لیکن مارشل لاء لگنے پر ان کو بھی اس منصب کو خیر باد کہنا پڑا۔ 24 اکتوبر 1958ء کو صدر سکندر مرزا نے مارشل لاء لگا کر جنرل محمد ایوب خان کو اس عہدے پر فائز کیا جنہوں نے تین دن بعد سکندر مرزا کو معزول کر دیا اور خود صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ 28 اکتوبر 1958ء سے 25 مارچ 1969ء 10 سال 4 ماہ 27 دن اقتدار کی کرسی پر جھولتے رہنے کے بعد عوامی احتجاج کے نتیجے میں استعفیٰ دے دیا اور اقتدار اس وقت کے کمانڈران چیف جنرل یحییٰ خان کے حوالہ کر دیا۔ اب ملک کی تقدیر جنرل محمد یحییٰ خان کے ہاتھ میں آ گئی جو 25 مارچ 1969ء سے 20 دسمبر 1971ء 2 سال 8 ماہ 25 دن تک اقتدار کا نشہ لیتے رہے۔ اسی دوران مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا۔ اقتدار انہوں نے اکثریتی پارٹی کے مسٹر بھٹو کے حوالہ کر دیا۔ تمام باتوں کے باوجود اس بات کا کریڈٹ ان کو ضرور جاتا ہے کہ انہوں نے الیکشن انتہائی شفاف اور منصفانہ طریقے سے کرائے۔

یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کے آخری دنوں میں مسٹر نورالدین کو بھی وزیر اعظم مقرر کیا تھا جن کا عرصہ اقتدار صرف 13 دن تھا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو 20 دسمبر 1971ء سے 13 اگست 1973ء ایک سال 11 ماہ 20 دن ملک کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر رہے اور 1973ء کا آئین بنا کر صدر کا عہدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بن گئے۔ اس طرح 14 اگست 1973ء سے 4 جولائی 1977ء تک 3 سال 11 ماہ 20 دن ملک کے وزیر اعظم رہے۔ اس کے بعد 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے قومی اتحاد کی تحریک جو کہ انہوں نے بھٹو کے خلاف الیکشن کی دھاندلی کے سلسلے میں چلائی تھی کے نتیجے میں مارشل لاء لگا کر بھٹو کی حکومت ختم کر دی اور بھٹو کو قصوری کے قتل کیس میں پھانسی دے دی۔ جنرل محمد ضیاء الحق مورخہ 5 جولائی 1977ء سے 17 اگست 1988ء تک 11 سال 1 ماہ 12 دن ملک کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر رہے جو بہاولپور کے نزدیک طیارہ کے حادثہ میں فوت ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تخریب کاری تھی لیکن کوئی ثبوت آج تک نہیں ملا۔ اس دوران محمد خان جونیجو کی حکومت آئی جو 23 مارچ 1985ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ان کی

حکومت سمیت قومی وصوبائی اسمبلیاں توڑ دیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق کے انتقال پر اس وقت کے سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خان نے ملک کا عہدہ صدارت سنبھال لیا اور ملک کے اندر عام انتخابات کرائے۔ اکثریتی پارٹی کی لیڈر بینظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم منتخب ہوگئیں جو 2 دسمبر 1988ء سے 6 اگست 1990ء تک ایک سال 8 ماہ 4 دن اقتدار کی کرسی پر بیٹھی رہیں۔ صدر محمد اسحاق خان نے کرپشن کے الزامات لگنے پر کابینہ اور اسمبلی توڑ دی جس سے بینظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی اور غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیر اعظم مقرر ہوئے جو 6 اگست 1990ء سے 6 نومبر 1990ء تک تین ماہ تک اقتدار میں رہے۔ اس دوران عام انتخاب ہوئے۔ میاں نواز شریف اکثریت سے جیتے۔ 6 نومبر 1990ء سے 17 اپریل 1993ء دو سال چار ہ ماہ گیارہ دن ملک کے وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہے۔ صدر اسحاق خان نے پھر کابینہ اور اسمبلی توڑ دی اور میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا جو 25 مئی 1993ء تک ایک ماہ 7 دن رہے۔ اس دوران سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بحال کر دی مزاری صاحب فارغ ہو گئے اور محمد نواز شریف نے پھر مورخہ 25 مئی 1993ء کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا 18 جولائی 1993ء تک وزیر اعظم رہے پھر خود اسمبلی توڑ دی اور جناب غلام اسحاق خان نے بھی استعفیٰ دے دیا اس کے بعد معین قریشی نگران وزیر اعظم مقرر ہوئے جو 18 اکتوبر 1993ء تک تقریباً تین ماہ رہے۔ اس دوران عام انتخابات ہوئے۔ اکثریتی پارٹی کی بینظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم مقرر ہوئیں جنہوں نے 4 نومبر 1996ء تک تین سال 15 دن قلمدان وزارت عظمیٰ سنبھالے رکھا اور بالآخر صدر محمد فاروق لغاری نے ان کی حکومت ختم کر دی۔ یہ یاد رہے کہ محمد فاروق لغاری بینظیر بھٹو کی پارٹی کے دست راست تھے اور اُنہی کی آشیر باد سے صدر کے عہدہ پر چنے گئے تھے اور انہوں نے ہی بینظیر بھٹو کی حکومت ختم کی۔

بینظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے پر ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا گیا جو 17 فروری 1997ء تک اس عہدے پر رہے۔ اس دوران پھر ملک کے اندر عام انتخابات ہوئے اور اکثریتی پارٹی کے محمد نواز شریف پھر ملک کے وزیر اعظم چنے گئے جنہوں نے 18 فروری 1997ء کو اپنا عہدہ سنبھالا۔

12 اکتوبر 1999ء کو پاکستان آرمی کے چیف جناب پرویز مشرف نے بطور چیف ایگزیکٹو ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ محمد نواز شریف کی حکومت ختم ہوگئی۔ ان کے خلاف طیارہ کے اغوا کا

کیس درج ہوا جس میں وہ گرفتار ہوئے اور بعد میں ملک بدر کر دیئے گئے جو آج کل اپنی فیملی کے ہمراہ سعودی عرب میں پناہ گزیں ہیں۔

تو یہ ہے وطن عزیز پاکستان کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کی تاریخ۔ اس سے سیاستدانوں بلکہ ہم سب کو سبق سیکھنا چاہیے۔

اللہ اکبر! سپریم پاور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کی بادشاہی لازوال ہے۔ یہ دنیا تو محض ایک ڈرامہ ہے جس میں ہر شخص وقت کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا مختصر کردار ادا کر کے رخصت ہو جاتا ہے اور اس کے کردار کی اچھی یا بُری یادیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ کئی شہنشاہ جو عالم پناہ اور ظل الٰہی کہلوانے میں فخر محسوس کرتے تھے آج ان کا کوئی نام لیوا باقی نہیں ہے۔ وقت کی رفتار بہت تیز ہے۔ اقتدار کی گھڑیاں بیتے زمانے کی چند دھندلی یادیں چھوڑ کر بڑی تیزی سے گزر جاتی ہیں۔

صحافی اور دانشور

صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس کا رول معاشرہ کے کردار اور ملکی حالات پر براہ راست مثبت یا منفی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ صحافت کو جہاں تک مکمل آزادی ہونی چاہیے وہاں صحافی حضرات پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ تصدیق کئے بغیر کوئی خبر اخبارات میں شائع نہ کرائیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ اخبارات میں ایسی سنسنی خیز خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہو جاتی ہیں جن میں ذرہ بھر حقیقت نہیں ہوتی۔ اس سے خواہ مخواہ ملک کے اندر خوف و ہراس پھیل جاتا ہے۔ جہاں برائی کی تشہیر ہوتی ہے وہاں نیکی کی حوصلہ افزائی کو بھی نظر انداز کرنا انصاف کے منافی ہے۔ جہاں کسی علاقہ میں ڈاکہ کی خبر کو اخبار کے صفحہ اول پر شہ سرخی کے ساتھ چھاپا جاتا ہے تو اس واردات کے ملزم گرفتار ہونے پر بھی اگر اسی انداز میں خبر چھپ جائے تو ملزمان کو پکڑنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو سکتی ہے اور لوگوں کے اندر بھی اعتماد کی فضا بحال ہو سکتی ہے۔ صحافی اور دانشور کسی بھی ملک کا بہت قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ ان کی قلم سے تحریر کئے گئے الفاظ ملکی حالات پر کافی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے قلم کو اپنے وطن کی ترقی، سلامتی اور بقا کیلئے استعمال کریں کیونکہ ہمیں سب کچھ اسی پیارے وطن کی بدولت ملا ہے۔

وکلاء

وکالت ایک ایسا پیشہ ہے جو کسی معصوم اور بے گناہ کو انصاف دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے معاشرے کے قانون شکن، ظالم، بدمعاش، چور، ڈاکو اور قاتل بھی اس سے فائدہ اٹھا کر قانون کے شکنجہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہر مجرم وکیل کے ذریعہ عدالت میں اپنی بے گناہی کیلئے صفائی پیش کرتا ہے۔ جس کو اس کا وکیل بے گناہ، معصوم اور مظلوم ظاہر کر کے عدالت میں پیش کرتا ہے یہ امر غور طلب ہے کہ وکلاء کے موقف کے مطابق اگر ان کے موکل معصوم اور بے گناہ ہیں تو اتنے زیادہ جرائم کا مرتکب کون ہو رہا ہے؟ چوری، ڈاکہ، زنا، قتل وغارت اور دہشت گردی کی وارداتیں کونسی مخلوق کر رہی ہے؟ یہ درست ہے کہ اس بیروزگاری اور مہنگائی کے دور میں ایک وکیل کی بھی اپنی مجبوری ہے۔ وکالت ایسا پیشہ ہے جو ایک وکیل کا ذریعہ آمدنی ہے۔ وکلاء پیشے کو محنت اور دیانتداری سے نبھائیں اور اپنے موکل کو قانونی امداد دیں کیونکہ یہ ان کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ قانونی دلائل کے ذریعہ بے گناہ یا گنہگار ثابت کرنے کی کوشش کریں لیکن قانون شکن عناصر کو قانون کی نظروں سے بچ نکلنے کے لیے طریقے اور حربے نہ بتائے جائیں جس سے قانون پر عمل کرنے والے اداروں کو بے بس اور مفلوج کر دیا جائے اور قانون شکن عناصر کی حوصلہ افزائی ہو جس سے وہ اپنی من مانی کرتے پھریں۔ تاخیری حربے استعمال کرنے سے عدالت کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

عدلیہ

عدلیہ ایک مقدس، معزز اور باوقار پیشہ ہے جس کو ملک کے اندر ہر طبقہ کے لوگوں کو یکساں عدل وانصاف مہیا کر کے ترازو کے پلڑے کو برابر رکھنا ہوتا ہے۔ کسی ملک کے حالات چاہے جتنے بھی خراب ہو جائیں، اگر صرف عدل وانصاف قائم رہے تو اس ملک کی بقا کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ''ربّ العٰلمین اپنی مقدس کتاب قرآن پاک کے تمام الفاظ واپس لے لیں، صرف اعدلو کا لفظ باقی رہ جائے تو پھر بھی کاروبار حیات قائم رہ سکتا ہے''۔ قارئین کرام آپ غور فرمائیں کہ عدل کا مقام کتنا اونچا ہے اور جس شخص کو عدل وانصاف کرنے کا مکمل اختیار دے دیا جائے تو اس کے مقام کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

اس طرح ایک روایت ہے کہ ایک طوطا اور طوطی شادی کے بعد پکنک منانے کیلئے اڑتے اڑتے کسی اُجڑے دیس میں پہنچ گئے جہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ ایک درخت پر پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے کہ ایک اُلو آ کر ان کے قریب بیٹھ گیا اور ان کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور کھانے کی دعوت دی۔ طوطا طوطی بن سنور کر اُلو کے ہاں دعوت کھانے گئے۔ جب دعوت سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے تو اُلو نے طوطی کو روک لیا کہ یہ میری بیوی ہے۔ طوطے نے کہا تم پاگل ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن اُلو طوطی کو اپنی بیوی بنانے پر بضد رہا۔ معاملہ عدالت تک گیا تو عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فیصلہ دیا کہ طوطی واقعی اُلو کی بیوی ہے۔ جب طوطا فیصلہ سن کر مایوس ہو کر گھر جانے لگا تو اُلو نے اسے روک کر کہا کہ واپس آؤ اپنی بیوی کو ساتھ لیتے چلو۔ طوطا واپس آیا تو اُلو نے کہا کہ تم نے انصاف دیکھ لیا ہے۔ اس ملک کی ویرانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں انصاف ختم ہو چکا ہے۔ اس روایت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناانصافی کا انجام کس قدر بھیانک ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی عدلیہ کی ماضی کی شاندار روایات ہمارے لئے باعث فخر

رہی ہیں۔ انشاءاللہ ہماری عدلیہ آئندہ بھی ان اعلیٰ روایات پر عمل پیرا ہو کر انصاف کے تقاضے پورے کرتی رہے گی اور ملک کی بقا اور سالمیت کے لیے عدل و انصاف کو یقینی بنائے گی۔

والدین

اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے، باکردار اور بااخلاق بنانے میں زیادہ تر ہاتھ والدین کا ہوتا ہے۔ جو والدین خود باکردار اور بااخلاق ہوں گے ان کی اولاد بھی اچھے کردار کی مالک اور خوش اخلاق ہوگی۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اولاد کو نہ صرف اعلیٰ تعلیم دلائیں بلکہ انہیں اچھا انسان بھی بنائیں۔ انسان کیا ہے؟ یہ جسم اور روح کا حسین امتزاج ہے۔ جسم کثیف اشیاء سے مرکب ہے اور کثافت کا مظہر ہے جب کہ روح لطیف ترین شے ہے اور لطافت کا مظہر ہے۔ جسمانی تقاضوں کی تکمیل آب و گل ہے اور روح کی تشنگی ارتقاء عالم ملکوت سے وابستہ ہے۔

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

بچوں کی پرورش پر گھر کا ماحول اور والدین کی تربیت کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ جو والدین اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے ان کے بچے آوارہ ہو کر جرائم کی دنیا کا رخ کرتے ہیں۔ اور اگر خاندان کا ایک فرد بھی آوارہ ہو کر جرائم میں ملوث ہو جائے گا تو سارے خاندان کا نظام خراب ہو جائے گا اور معاشرہ میں اس خاندان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔

والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کو دینی تعلیم کی طرف راغب کریں۔ بچوں کی ہر حرکت پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی بچہ دیر سے گھر آتا ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ دیر سے کیوں گھر آئے ہو اور خیال رکھا جائے کہ اس کی دوستی کس قسم کے بچوں کے ساتھ ہے۔ بچے کی نفسیات کے مطابق اس سے برتاؤ کیا جائے۔ بچوں کو اپنے اعلیٰ کردار اور

اچھے اصولوں کا نمونہ پیش کر کے ان کو اس کی پیروی کی تلقین کر کے یقین کر لیں کہ آپ کے بچے اس کا اثر قبول کر رہے ہیں۔

نوجوان طلباء

کسی ملک کا مستقبل اس ملک کے نوجوان طلباء ہوتے ہیں جنہوں نے آئندہ اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہر طالب علم اپنے اچھے مستقبل کی طرف گامزن ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جو طالب علم رات دن محنت کر کے توجہ کے ساتھ علم حاصل کرتے ہیں وہ مستقبل قریب میں اپنی منزل پا لیتے ہیں اور جو طلباء منفی تنظیمی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں وہ اپنی منزل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ طلباء کے پاس اپنا مستقبل بنانے میں بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت سے فائدہ اٹھائیں گے تو ان کا مستقبل سنور جائے گا۔ اور اگر وہ اس وقت کو ضائع کر دیں گے تو نہ صرف اپنا مستقبل خراب کریں گے بلکہ والدین کے لئے پریشانی کا سبب بنیں گے۔ طلباء حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر دن رات محنت اور لگن سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور نہ صرف اپنے والدین بلکہ اپنے پیارے وطن کا نام روشن کریں۔

اساتذہ

جس طرح اچھی مائیں اچھی نسل پیدا کرتی ہیں اسی طرح اچھے استاد اچھے شاگرد بناتے ہیں۔ اچھے اور فرض شناس استاد پوری توجہ، محنت کے ساتھ اپنے شاگردوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ پوری قوم کے معمار بنتے ہیں۔ شاگردوں کے دلوں میں ہمیشہ کیلئے ان کی عزت اور احترام قائم رہتا ہے۔ لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ آج کل اکثر اساتذہ کرام اچھے کردار ادا نہیں کر رہے بلکہ ہوس اور لالچ کی وجہ سے انہوں نے تعلیم کو کمرشل کر کے ذریعہ آمدنی بنالیا ہے۔ سکولوں میں پڑھائی کا فقدان ہے۔ والدین مجبور ہو کر بھاری ٹیوشن فیس ادا کر کے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔ پرانے زمانے کے استاد خود محنت سے پڑھاتے تھے۔ اگر ان کو یہ علم ہو جاتا تھا کہ ان کا کوئی شاگرد ٹیوشن پڑھ رہا ہے۔ تو اس کی باقاعدہ گوشمالی کی جاتی تھی۔ ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ 1954ء میں، میں مڈل سکول سلانوالی میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر حافظ احمد بخش ہمیں پڑھاتے تھے۔ ایک دن حافظ صاحب انتہائی غصہ کی حالت میں کلاس روم میں داخل ہوئے اور آتے ہی ایک لڑکے کا نام لے کر کہا کہ اوپر بینچ پر کھڑے ہو جاؤ۔ جب وہ بنچ پر کھڑا ہو گیا تو تمام کلاس کے لڑکوں کو مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ سب لڑکے اس کی شکل دیکھو۔ یہ وہ لڑکا ہے جس نے ایک ٹیچر کے پاس ٹیوشن پڑھنی شروع کی ہے۔ زور زور سے چلا کر کہنے لگے کہ کیا میں مر گیا ہوں کہ میرے شاگرد کو کسی اور کے پاس ٹیوشن پڑھنے کی ضرورت پڑی ہے؟ مزید فرمانے لگے کہ آج سے میں اپنے آپ کو سزا دیتا ہوں اور تمام کلاس کو آٹھ بجے رات سے نو بجے رات تک اوور ٹائم لگا کر خود پڑھایا کرونگا۔ پھر اس روز سے انہوں نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ آٹھویں کے فائنل کے امتحان میں سکول کا نتیجہ 99 فیصد آیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ نتیجہ 100 فیصد کیوں نہیں آیا۔

یہ ہے ایک استاد کی شان جو بے لوث، بغیر کسی لالچ کے اپنے شاگردوں کا اس قدر خیال

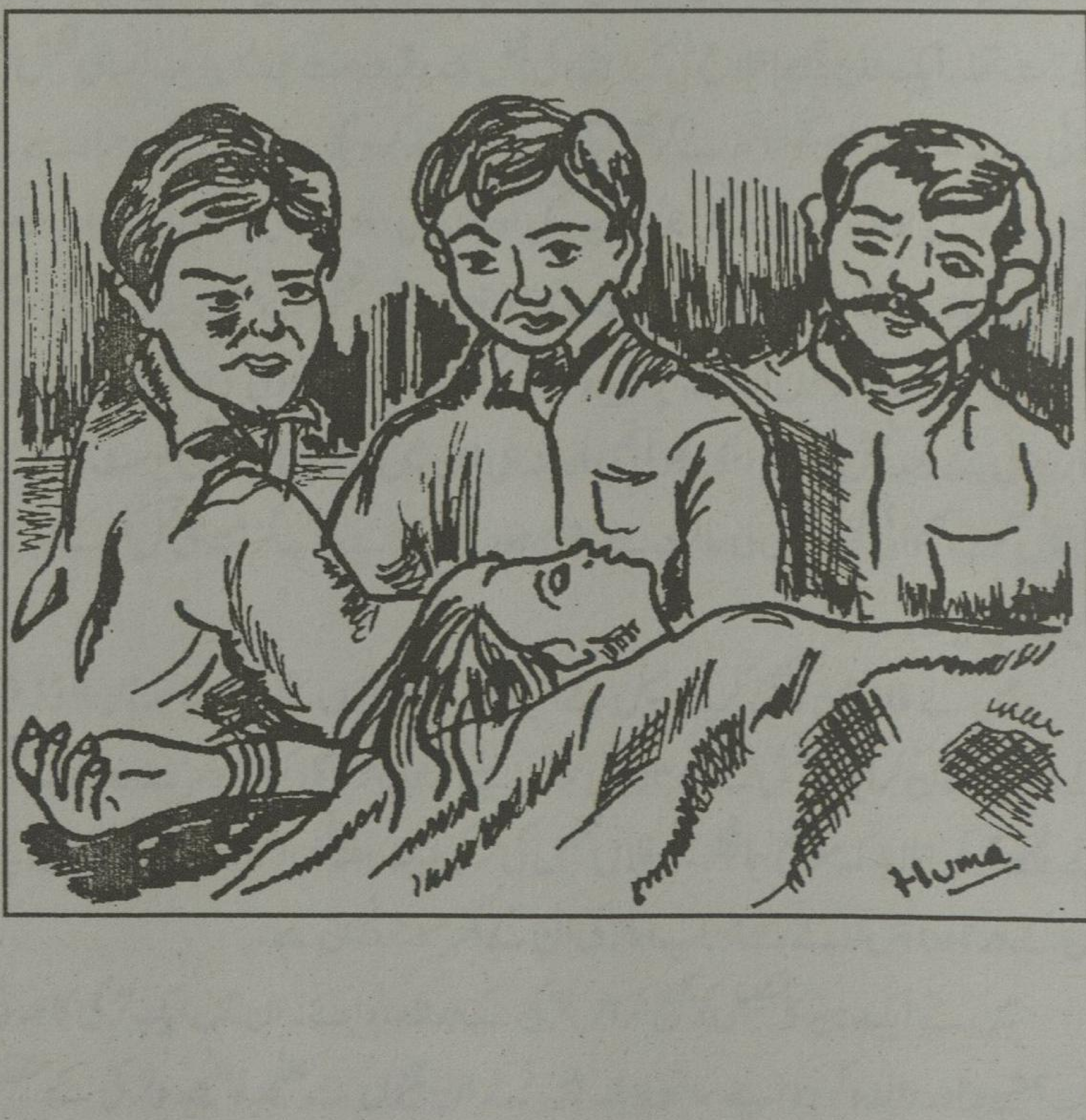
رکھتے تھے۔آج بھی ہمارے دلوں کے اندران کا خوف اوراحترام اسی طرح موجود ہے۔آج کل کے استاداورشاگرد کا حال آپ کے سامنے ہے۔استاداپنی پرانی روایات پرعمل کر کے ملک کے مستقبل کوروشن کریں۔ یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب وہ اپنے ملک اورقوم کی خوشحالی اورترقی کیلئے ایک خاص جذبہ اورلگن کے ساتھ اپنے فرائض نبھائیں گے۔تعلیم ہی کسی ملک کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔

حصّہ دوم

- ماں کی ممتا
- اندھیری رات
- عشق نہ پوچھے ذات
- غصّہ حرام
- انگوٹھی سے قاتل تک
- سفید خون
- جنگل میں پھانسی
- عشق میں بیوی کا قتل
- نیکی کا بدلہ برائی
- موٹی ویشن (Motivation)
- چناب ایکسپریس سے فراری
- قاتل نرس
- بیٹے کے فرض پر باپ قربان

- خونیں بینک ڈاکہ
- عزتوں کے لٹیرے
- دارا تے شاہنا
- سفّاک ماں
- خونی انگلیاں
- خون کی ہولی
- ڈپٹی کمشنر کے گھر خونیں ڈاکہ
- حبیب بینک لیڈیز برانچ میں ڈاکہ
- اغواء برائے تاوان
- چھ لاشیں خون میں لت پت
- دونالی بندوق
- بنگالی ڈاکو
- ایک پستول کا سفر
- میں ڈاکو کیسے بنا

ماں کی مامتا



1971ء

1971ء کی بات ہے کہ چوکی پولیس نیا لاہور جو کہ اس وقت تھانہ گوجرہ ضلع فیصل آباد کی چوکی تھی۔ اور اب نیا لاہور علیحدہ تھانہ بن چکا ہے اور ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ علیحدہ ضلع بننے پر اس کی حدود میں شامل ہو چکا ہے۔ اس تھانہ کی حدود مغرب میں تھانہ بھوانہ اور جنوب میں تھانہ موچی والا ضلع جھنگ سے ملتی ہیں۔ تھانہ بھوانہ کی اقوام لک، سپرا، رجوکے، ملوکے اور ناگے اور تھانہ موچی والا کی بلوچ قوم کے جرائم پیشہ افراد زیادہ تر نیا لاہور کے علاقہ میں مویشی چوری کرنے کی واردات کرتے ہیں۔ نیا لاہور کے علاقہ کی آبادی، آبادکار اور مہاجرین پر مشتمل ہے جب کہ تھانہ بھوانہ اور موچی والا میں مقامی جنگلی لوگ آباد ہیں جن میں زیادہ تر جرائم پیشہ ہیں اور وہ نیا لاہور اور گوجرہ کے علاقہ کو دُھر سمجھ کر واردات کرتے ہیں۔ ان دنوں میں چوکی پولیس نیا لاہور میں بطور سب انسپکٹر انچارج تعینات تھا۔ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ راجباہ کی ٹیل بحد رقبہ دوست پور میں ایک انسانی نعش اٹکی ہوئی ہے۔ میں ملازمین کو ساتھ لے کر تقریباً دو بجے دن متذکرہ جگہ پر پہنچا۔ نعش کو راجباہ سے باہر نکلوایا۔ وہ نعش جوان عورت کی تھی جو سربریدہ تھی اور اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اور دونوں ہاتھ کہنیوں سے کٹے ہوئے تھے جو نعش کے ساتھ موجود نہ تھے۔ نعش کے جسم پر سیاہ رنگ کی ریشمی قمیض تھی جس کے کندھوں اور گلے پر سفید دھاگہ کی کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ مناسب ضابطہ کی کارروائی کے بعد نعش جو نہ تو ابھی پھولی تھی اور نہ ہی اس میں بدبو پیدا ہوئی تھی پوسٹ مارٹم کیلئے ہسپتال گوجرہ بھجوائی گئی۔ نعش کی حالت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے شب گزشتہ ہی قتل کر کے نہر میں پھینک دیا گیا ہے۔

میں نے ملازمین کو بھیج کر 15 میل کے ایریا تک جتنے گاؤں تھے، کی مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اعلان کرایا اور نعش کے وارثان کی تلاش کیلئے لوگوں کو آگاہ کیا۔ دوسرے روز ایک شخص نے مجھے آ کر بتلایا کہ موضع جانگلو میں فلاں شخص کی لڑکی ایک ہفتہ قبل اغوا ہو گئی تھی جو دو دن پہلے اس کے ورثاء واپس لائے تھے اور اب وہ لڑکی ان کے گھر موجود نہیں ہے۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھیج کر اس لڑکی کے ورثاء بلوائے۔ ان میں ایک لڑکی کا بھائی، ایک ہمشیرہ اور والدہ کو وہ اپنے ساتھ لایا۔ میں نے ان تینوں سے علیحدہ علیحدہ لڑکی کے متعلق

دریافت کیا۔ ہر ایک کا بیان ایک ہی تھا کہ لڑکی اغوا ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک ٹریس نہیں ہوئی۔ جس شخص نے مجھے اطلاع دی تھی وہ قابل اعتماد آدمی تھا۔ اس نے بتلایا تھا کہ لڑکی دو یوم قبل واپس آ گئی تھی جس کو اس نے خود والدین کے گھر دیکھا تھا۔

میں نے دوبارہ ان سے دریافت کیا تو وہ اپنے سابقہ بیان پر ہی قائم رہے۔ لیکن ان کے چہروں کے تاثرات سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ دروغ گوئی سے کام لے کر حقیقت کو چھپا رہے ہیں کیونکہ لڑکی کو ان لوگوں نے بدنامی کی وجہ سے خود ہی قتل کیا تھا۔ اور سر ہاتھ اور پاؤں اسلئے کاٹ دیئے تھے کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ میں نے ہر طریقہ سے ان کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

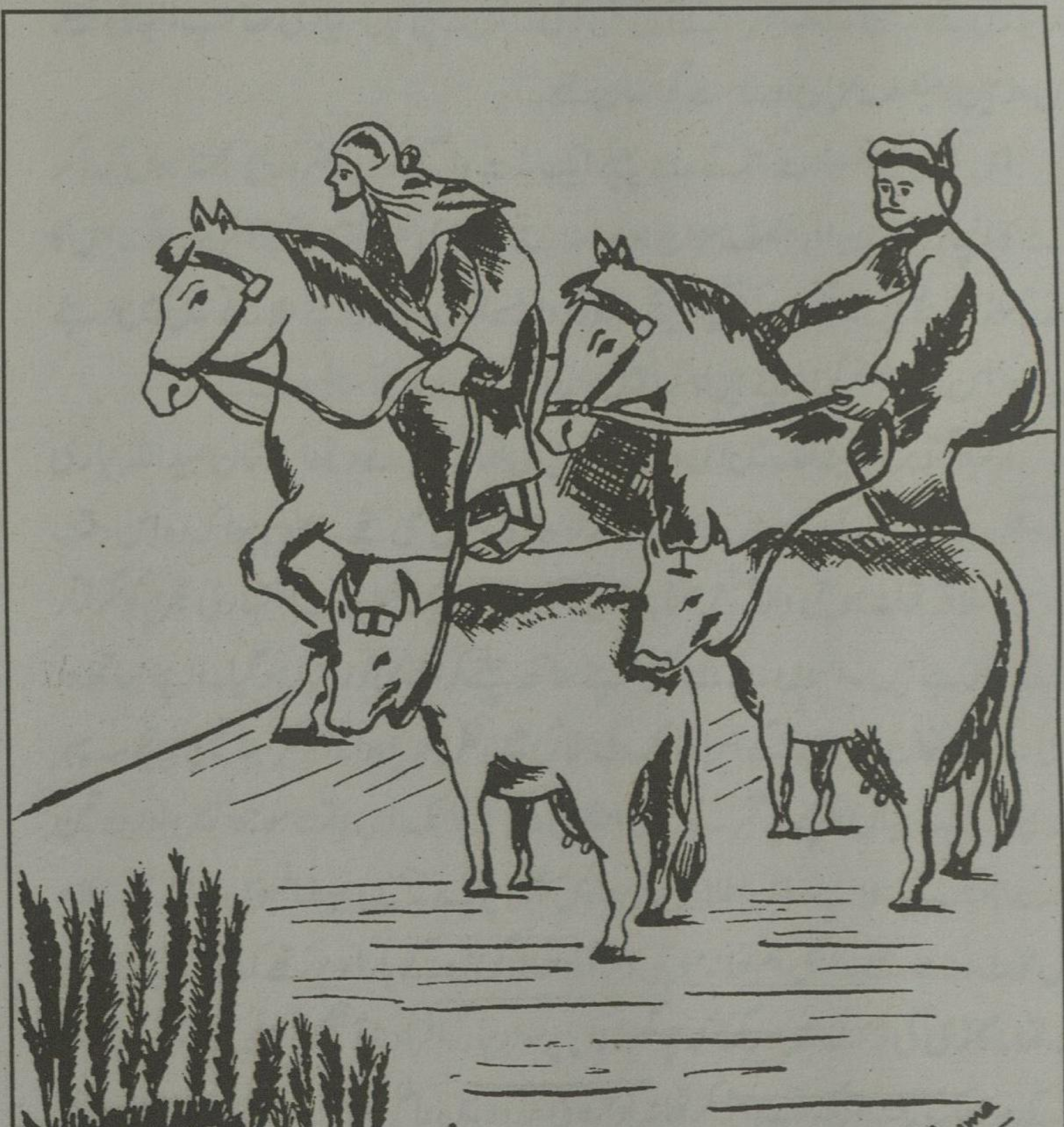
میں نے سوچا کہ ماں ہی ایک ایسا رشتہ ہے جس کو بیٹی کے ساتھ اندھا پیار ہوتا ہے۔ اس کو اعتماد میں لے کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کو میں نے اپنے پاس کرسی پر بٹھایا اور باقی سب کو چوکی کی حدود سے باہر بھجوا دیا۔ اسے چائے کا کپ دے کر پینے کو کہا جس نے پہلے تو چائے پینے سے انکار کیا لیکن بعد میں میرے اصرار پر اس نے چائے پینی شروع کی اور ساتھ ہی ٹھنڈی آہ بھری۔ میں نے اس خاندان کی ساری ہسٹری پوچھی اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اعتماد میں لیا اور کہا کہ مائی ٹھیک ہے کہ تم لوگوں نے اپنی لڑکی کو قتل کیا ہے۔ اس کا چال چلن اچھا نہیں تھا۔ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ مائی نے فوراً میری بات کو کاٹتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا کہ تھانیدار صاحب میرے بیٹوں نے یہ کام نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ مائی میں آپ کے بیٹوں پر الزام نہیں لگا رہا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ درست ہے کہ لوگ بد چلن لڑکیوں کو مار دیتے ہیں۔ لیکن اگر مارنا ہی تھا تو اس بے چاری کی گردن کیوں کاٹی۔ اس کے پاؤں گھٹنوں سے اور ہاتھ کہنیوں سے کیوں کاٹے؟ اتنے بے رحم اور سفاکانہ طریقہ سے اس کے جسم کے ٹکڑے کیوں کیے؟ اب اس موقع پر میں مائی کے چہرہ کو غور سے پڑھتا رہا۔ چہرے کے آثار اور اتار چڑھاؤ پر مسلسل نظر رکھی اور نفسیاتی غیر ارادی اور ارادی طور پر اس کی حرکات کو نوٹ کرتا رہا۔ اور ساتھ ہی اپنے الفاظ کو دو مرتبہ دہرایا تو مائی نے پھر ٹھنڈی آہ بھری اور اس کی دونوں آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو جاری ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب مائی سب کچھ اگلنے والی ہے تو میں نے اس کے ساتھ مزید ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ اسی اثنا میں، میں نے اسے نعش کے جسم سے اتاری ہوئی سیاہ قمیض دکھائی تو قمیض کو دیکھ کر وہ پھوٹ

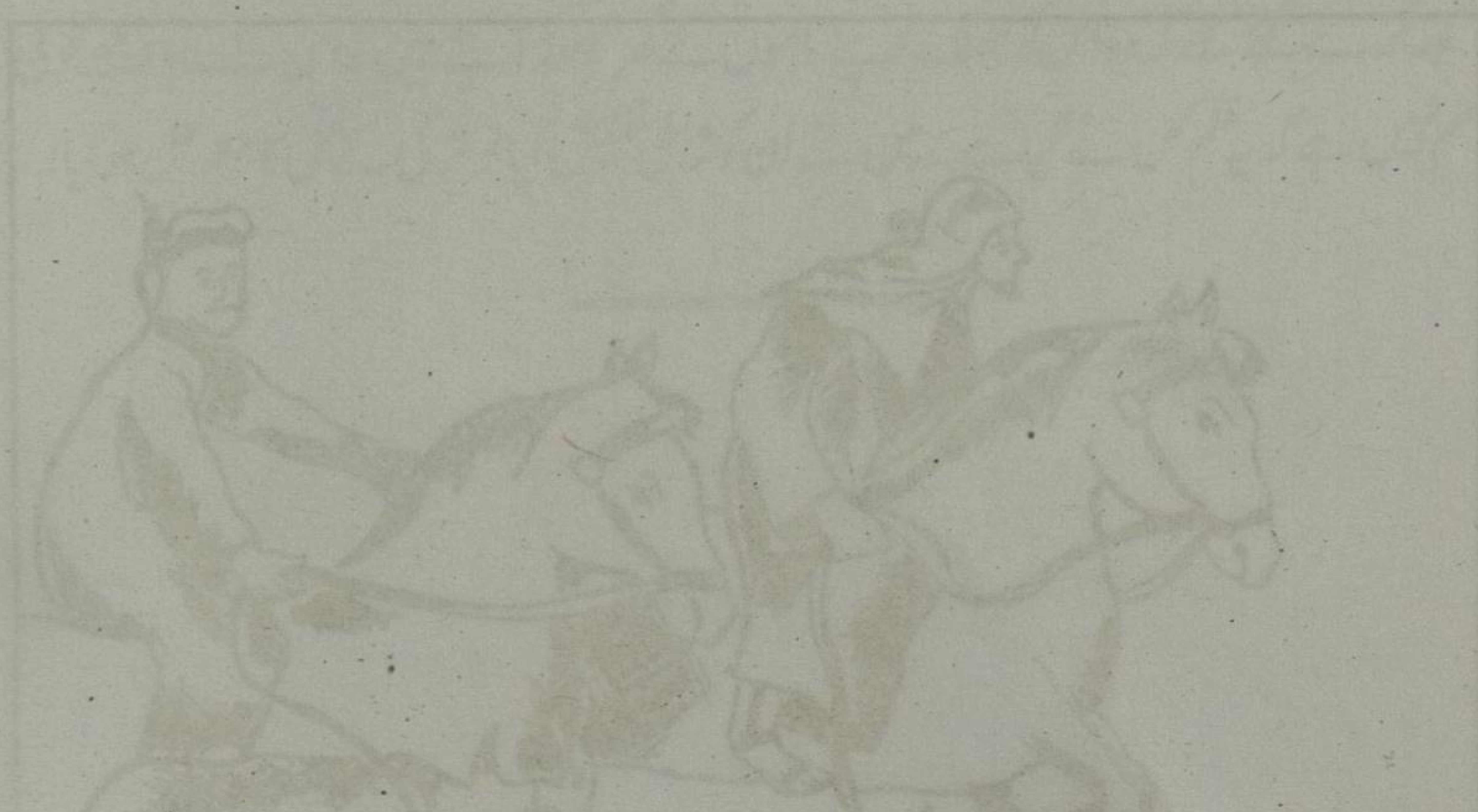


پھوٹ کر رونے لگی۔

قمیض کو اپنے سینے سے لگالیا اور کہا کہ بیٹا یہ قمیض واقعی میری بیٹی کی ہے۔لیکن اگر میرے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ میں نے قمیض شناخت کرلی ہے تو وہ مجھے جان سے ماردیں گے۔ کیونکہ انہوں نے آتی دفعہ مجھے باربار تاکید کی تھی کہ ہم نے نعش کے وارث نہیں بننا۔اگر وارث بن گئے تو قتل کے مقدمہ میں پھنس جائیں گے۔میں نے اسے امداد کرنے کی یقین دہانی کرائی۔اس نے کہا کہ ہر کوئی بیٹیوں والا ہے اللہ ہر ایک کی عزت محفوظ رکھے۔اور بات جاری رکھتے ہوئے بتلایا کہ ایک ہفتہ ہوا کہ اس کی بیٹی گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ اغوا ہوگئی تھی۔ دودن ہوئے ہیں کہ بازو واپس کرائے ہیں۔عشاء ویلہ کے قریب میرے دو بھانجے اور ایک بھتیجا لڑکی کو اپنے ساتھ یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ وہ اس کو جھنگ اپنے ماموں کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔اس کے علاوہ مجھے کوئی علم نہیں ہے کہ یہ ظلم کس نے کیا ہے۔میں نے ان کو شامل تفتیش کیا تو لڑکی کے قتل کا معمہ حل ہوگیا۔

اندھیری رات





1971ء

دیہی علاقوں میں جرائم پیشہ لوگ اکثر اندھیری راتوں میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ نقب زنی و مویشی چوری کی وارداتیں ایسی راتوں میں عام ہو جاتی ہیں اور پولیس کو اپنا گشت بڑھانا پڑتا ہے۔

1971ء میں میری تعیناتی پولیس چوکی نواں لاہور میں تھی جو تھانہ گوجرہ ضلع فیصل آباد میں واقع ہے۔ یہاں میں بطور انچارج اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ نواں لاہور فیصل آباد جھنگ روڈ پر واقع ہے۔ آج کل اسے تھانہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ان دنوں تھانہ گوجرہ کے انچارج خان عبید اللہ نیازی تھے۔ ان کے صاحبزادے آج کل ڈی۔ ایس۔ پی ہیں۔ نیازی صاحب انتہائی بھلے مانس، ذہین، منصف مزاج اور راست گو انسان تھے۔

اس کیس کی تفصیلات بتانے سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر تھانے کا انچارج ذہین اور منصف مزاج ہو اور علاقے پر پوری نظر رکھتا ہو تو جرائم پیشہ لوگ اس کا علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ان کی پہنچ اوپر تک ہو تو وہ ایسے ایس ایچ او کو اپنے علاقے میں نہیں رہنے دیتے اور اس کی ٹرانسفر کرا دیتے ہیں تاکہ انہیں واردات کرنے میں آسانی رہے۔

غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اس وقت چوکی پر ہی تھا۔ میں نے دیکھا کہ خان عبید اللہ نیازی ایک ویگن پر سوار ہو کر آ رہے ہیں۔ ان کے ہمراہ چار کانسٹیبل بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت چک سپرا علاقہ تھانہ موچی والا ضلع جھنگ میں مانک نامی ایک خطرناک اشتہاری مجرم کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا میں فوراً تیار ہو گیا۔ اپنے ساتھ دو سپاہی لئے اور خان صاحب کے ہمراہ مانک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ہم تقریباً تین بجے سہ پہر چک سپرا پہنچے۔ یہاں پہنچنے پر مخبر نے ہمیں اطلاع دی کہ مانک اس وقت موجود نہیں اور دو تین روز سے جھنگ گیا ہوا ہے۔ اس اطلاع پر ہم واپس چل پڑے۔ ہمیں بہت افسوس ہوا کہ ہم ناکام واپس لوٹ رہے تھے۔ ابھی ہم تھانہ موچی والا اور تھانہ گوجرہ کے بارڈر پر تھے کہ دس بجے رات کا وقت تھا۔ گاڑی کی لائٹ میں دیکھا کہ چھ گھوڑوں پر سوار بارہ افراد جو آتشیں اسلحہ سے لیس تھے سیم نالہ کے نزدیک پختہ سڑک سے اتر کر تھانہ گوجرہ کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ ان سواروں کا رخ چک 348 ج۔ب کی جانب تھا۔ یہ ضرور کوئی واردات کرنے جا رہے تھے۔ جس سمت ان کا

رخ تھا وہ راستہ بڑا خراب اور ناہموار تھا۔ راستے میں جا بجا گہرے کھڈ اور خاردار جھاڑیاں تھیں اور ویگن کے ذریعے ان کا تعاقب کرنا مشکل تھا۔ میں نے خان صاحب سے کہا کہ اگر وہ جانا چاہتے ہوں تو واپس چلے جائیں، کیونکہ مجھے اس گروہ کے پیچھے جانا ہے۔ خان صاحب نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر وہ واپس گوجرہ چلے گئے۔ اس وقت میرے ساتھ صرف دو سپاہی فرزند علی اور محمد سلیم رہ گئے۔ فرزند بڑا قد آور اور دلیر نوجوان تھا مگر سلیم فرزند کے مقابلے میں کمزور جسم کا مالک ہونے کے باوجود بہادری اور دلیری میں اس سے پیچھے نہ تھا۔

میں دونوں سپاہیوں کے ہمراہ چک 348 ج۔ب پہنچا۔ سب سے پہلے نمبردار اور چوکیدار کو ملا اور انہیں ہوشیار کیا کہ کچھ لوگ واردات کی غرض سے ادھر آ رہے ہیں۔ ہم نے گاؤں والوں کو جمع کیا اور کچھ لوگوں کو فوری طور پر سیم نالہ کی طرف ناکہ بندی کے لئے روانہ کر دیا۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے انکشاف کیا کہ یہاں اکثر وارداتیں بلوچ کرتے ہیں اور واردات کے بعد وہ اکثر اسی راستے راجباہ کی پٹڑی کو استعمال کرتے ہوئے واپس اپنی جھوکوں کو چلے جاتے ہیں۔ میں نے گاؤں کے کچھ اور لوگوں کو چند دوسرے ملحقہ دیہاتوں میں بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ فوری جا کر تمام لوگوں کو اس گروہ کی آمد کی خبر کریں۔ یہ ہدایت کرنے کے بعد میں واپس اس جگہ پہنچا جہاں سے یہ گھڑسوار ہمارے علاقہ میں داخل ہوئے تھے۔ سیم نالہ پر متعین پارٹی کو میں نے تاکید کر دی تھی کہ اگر بلوچ ادھر سے گزریں تو ان کا راستہ روکا جائے۔ ہمارے ساتھیوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اگرچہ مجرمان کو ہم پہلے دیکھ چکے تھے کہ وہ چھ گھوڑوں پر دو دو سوار ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی ہے اور میرے ہمراہ صرف دو کانسٹیبل ہیں لیکن علاقہ کے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کا جذبہ ہمارے اندر موجود تھا۔

ہر طرف گھمبیر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سخت اندھیری رات میں کبھی کبھار کوئی اکادکا گاڑی سڑک سے گزرتی تو ہم سرکنڈوں کے پیچھے چھپ جاتے۔ ہم کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ہم یہاں کسی کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تقریباً آدھی رات گزر چکی تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص گھپ اندھیرے میں ہماری طرف آ رہا ہے۔ ہم لوگ کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ لیکن جب وہ شخص قریب آیا تو پتہ چلا کہ وہ ہمارا ہی آدمی ہے۔ اس کا نام شریف تھا اور وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ سیم نالہ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا کہ کچھ گھوڑ سوار چار بیل چوری کر کے لے جا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہم ان کا

مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ تعداد میں ہم سے زیادہ ہیں۔اس کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ چمرانوالہ راجباہ کے راستے جھوک سیمے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے فوری فیصلہ کیا کہ اگر ہم جتنی جلدی بھی ممکن ہو پل چک کالیاں پر پہنچ جائیں تو ان سے مڈبھیر ہو سکتی ہے اور ان کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ صرف دو کانسٹیبل تھے تیسرا شریف شامل ہو گیا۔ سلیم کے پاس 303 رائفل تھی اور شریف کے پاس بارہ بور بندوق تھی۔ خوف میرے دل میں بھی پیدا ہوا کیونکہ ہماری تعداد بلوچوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اللہ کا نام لے کر پل چک کالیاں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں فیصل آباد کی جانب سے نیوخان کی بس آ گئی۔ ہم نے اسے تائید ایزدی سمجھا اور بس کو روک کر اس میں سوار ہو گئے۔ وہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر اڈا چک کالیاں تھا۔ یہاں پہنچنے میں ہمیں صرف چند منٹ لگے۔ یہاں سے ہم پیدل چل پڑے اور تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ہم پل چک کالیاں پہنچ گئے اور پل کے نزدیک راجباہ کے ساتھ سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھے ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ہمیں ایک سمت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آوازیں بتدریج قریب آتی جا رہی تھیں۔ بلوچوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ کامیاب ہو کر واپس لوٹتے ہیں تو اونچی آواز میں ڈھولا ضرور گاتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اونچی آواز میں ڈھولا گا رہے تھے۔ شریف بہت سہما اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے دلاسہ دیا تو کہنے لگا جناب میں صرف اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ وہ تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں اور ان کے پاس خطرناک اسلحہ بھی موجود ہے، اس لئے ان کو نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔ شریف نے دلیل بھی دی کہ چونکہ بلوچوں کا گاؤں نزدیک ہی ہے لہٰذا یہاں سے کافی لوگ ان کی مدد کیلئے آ سکتے ہیں۔ اندھیری رات چار انسان دو بندوقوں کے ساتھ سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھے ہوں، سامنے بارہ بلوچ گھوڑوں پر سوار خطرناک اسلحہ سے لیس ہوں، ایسے میں مقابلہ تو دور کی بات جان بچانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شریف کا موقف کافی درست اور برموقع تھا۔ لیکن اگر ہم واپس چلے جاتے اور بلوچ ہمارے علاقہ کے مسروقہ بیل اپنے علاقہ میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمیشہ ہمارا ضمیر ملامت کرتا رہتا۔

جوں جوں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب آ رہی تھی ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جاتی تھیں۔ کسی کو علم نہ تھا کہ چند لمحوں بعد کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اس موقع پر شریف سے کہا کہ وہ حوصلہ نہ ہارے اور اگر وہ خوف زدہ ہے تو خاموشی سے واپس چلا جائے۔ شریف نے جانے

میں ہی عافیت سمجھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس مقابلے کے بعد وہ زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ لیکن میں نے جانے سے پہلے اس سے بندوق لے کر اپنے ماتحت فرزند کو دے دی۔ جو ابھی تک نہتا تھا۔ خود میرے پاس سرکاری ریوالور تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ وہ خوفزدہ تو نہیں؟ لیکن ان دونوں نے بیک زبان ہو کر کہا کہ وہ باہمت اور باحوصلہ جوان ہیں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہیں۔ جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے میں نے بڑے غور سے ان کے چہروں کی جانب دیکھا۔ وہاں مجھے خوف کی بجائے شیروں کا سا حوصلہ نظر آیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کی پیٹھ تھپکی اور کہا کہ اگر آج ہمیں اپنے علاقے کے لوگوں کی جان و مال کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑے تو ہمیں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے علاقہ کے لوگوں کی حفاظت کریں۔ ورنہ ہمیں یہ وردی پہننے کا کوئی حق نہیں۔

بلوچ اب ہمارے قریب آ چکے تھے۔ میں نے فرزند اور سلیم کو کچھ ضروری ہدایات دیں کہ مزاحمت کی صورت میں ہمیں کس طرح فائرنگ کا جواب دینا ہو گا۔ اس وقت ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم تینوں میں کوئی غیبی طاقت شامل ہو گئی ہے۔ ہم ہر خطرے اور خوف سے بے نیاز بلوچوں کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد ہم نے دیکھا کہ آگے والے گھوڑے پر سوار دو افراد مسروقہ بیلوں کی رسیاں پکڑے ہمارے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ ہم نے موقع دیکھتے ہی سرکنڈوں سے باہر نکل کر انہیں للکارا۔ وہ اس اچانک افتاد پر گھبرا گئے اور بیل وہیں چھوڑ کر اپنے گھوڑے سرپٹ اپنے گاؤں کی طرف دوڑا دیئے۔ لیکن اسی اثنا میں پیچھے سے آنے والے ان کے دوسرے ساتھیوں نے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ ہم نے ایک درخت کی آڑ میں پناہ لی اور جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ان کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ ہم مزید کچھ دیر درخت کی آڑ میں بیٹھے رہے۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو اٹھ کر چاروں اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ جس سمت سے ہم پر فائرنگ ہو رہی تھی ادھر گئے تو دیکھا کہ وہاں کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ شاید خدا نے ان کے دلوں میں ہماری دہشت بٹھا دی تھی اور وہ خوف کے مارے رات کی اس تاریکی میں بیلوں کو چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ ہم نے صبح ہونے کا انتظار کیا۔ اور جب دن کے اجالے میں جائے وقوعہ کا معائنہ کیا تو ہمیں وہاں خون نظر آیا۔ خون کے قطرے دور تک چلے گئے تھے۔ ہم ان پر چلتے ہوئے تقریباً ایک فرلانگ آگے گئے تو وہاں قریب ہی مویشیوں کی حویلی سے ایک شخص ہمیں دیکھ کر باہر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ رات کے آخری پہر جب اس کا پالتو کتا زور زور سے بھونکا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر آ

کر دیکھا تو چار آدمی حویلی کے باہر کھڑے اسے زور زور سے آوازیں دے رہے تھے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کا ایک ساتھی شدید زخمی ہو گیا جسے وہ چار پائی پر ڈال کر گاؤں لے جانا چاہتے ہیں انہوں نے مجھ سے چار پائی کا مطالبہ کیا جو میں نے انہیں دے دی۔ میرے سوال پر اس شخص نے بتایا کہ وہ زخمی کو چار پائی پر ڈال کر جھوک کی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ آیا اسے معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ اس نے ذرا رک کر کہا وہ ان کو نہیں جانتا۔ میں نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ انہیں جانتا تو ہے لیکن دانستہ طور پر بتانے سے گریز کر رہا ہے۔ جب میں نے اسے اعتماد میں لیا تو اس نے بتایا کہ مجھے کچھ اور علم نہیں صرف یہ معلوم ہے کہ جو شخص زخمی ہوا ہے اس کا نام رب نواز ہے اور وہ محمد علی نمبردار ساکن ''سیمے کی جھوک'' کا داماد ہے۔

چوکی پولیس نواں لاہور کو بھی کسی طرح اس وقوعہ کی اطلاع مل گئی تھی۔ چوکی کے کئی ملازم اسلحہ سمیت موقع پر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ قریبی دیہاتوں کے بھی کچھ آدمی تھے۔ ہم نے پہلے مسروقہ بیلوں کو تلاش کیا جو ہمیں قریب ہی سے مل گئے۔ اب ہمارے سامنے اہم کام ملزمان کی گرفتاری تھا۔ میں نے تھانہ موچی والا سے ایس پی صاحب فیصل آباد کو اس سارے واقعہ کی اطلاع دی جنہوں نے شاباش دیتے ہوئے کہا کہ وہ مزید فورس تھانہ موچی والا بھیج رہے ہیں۔ اور ایس پی جھنگ کو بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ بھی کچھ فورس بھیج دیں۔

تقریباً دو گھنٹے بعد فیصل آباد اور جھنگ سے پولیس کی کافی کمک پہنچ گئی۔ میں نے 'سیمے کی جھوک'' میں رب نواز کے گھر پر چھاپہ مارا۔ وہ زخمی حالت میں کسی اور گھر میں چھپا ہوا تھا۔ چھاپے کی خبر سن کر گاؤں کے دو سر کردہ افراد میرے پاس آئے جن میں محمد علی نمبردار اور فاضل شامل تھے۔ جھوکوں کے بلوچ اکثر پولیس کے ساتھ مزاحمت کرتے ہیں۔ لیکن میرے ساتھ فورس بہت زیادہ تھی اس لئے محمد علی اور فاضل نے مجھے ہر ممکن تعاون کا یقین دلا کر کہا کہ آپ فورس واپس تھانہ موچی والا لے جائیں وہ ہر صورت میں تمام ملزمان کو آج شام آپ کے روبرو پیش کر دیں گے۔ شام کے وقت محمد علی نمبردار اور فاضل آ گئے۔ انہوں نے 8 ملزمان پیش کر دیئے۔ رب نواز اور ریاض زخمی تھے۔ رب نواز کو بائیں ٹانگ میں جب کہ ریاض کو کندھے میں گولی لگی تھی۔ انہوں نے 6 بندوقیں بھی تھانے میں پیش کیں۔ ہم نے جملہ تمام ملزمان کو گرفتار کر لیا جنہیں ضروری قانونی کارروائی کے بعد جیل بھیج دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری عزت رکھ لی اور ہم نے جب بیل ان کے

اصل مالکوں تک پہنچائے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ اپنے بیل پا کران کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

عشق نہ پچھے ذات



1973ء

کوٹ مومن تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ پسماندہ علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں تعلیم کا رجحان بہت کم ہے۔ صرف اکا دکا لوگ ہی تعلیم یافتہ ہیں۔ قصبہ کے بیشتر لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ یہاں سنگترے اور مالٹے کے باغات ہر طرف نظر آتے ہیں۔ بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ لیکن اپنی زرخیزی اور شادابی کے برعکس یہاں کے لوگ سخت ضدی اور سرکش واقع ہوئے ہیں۔ معمولی اور ذرا سی رنجش بھی سخت عداوت کا باعث بن جاتی ہے۔ اور یہ عداوت پھر عرصہ دراز تک قتل و غارت گری کی صورت میں چلتی رہتی ہے۔ اور وہ جب تک اپنے انتقام کی آگ نہیں بجھا لیتے انہیں چین نہیں آتا اور جو خاندانی عداوت اور رنجش کا بدلہ نہ لے اسے بزدل سمجھا جاتا ہے۔

یہ 1973ء کی بات ہے جب میں بطور سب انسپکٹر تھانہ کوٹ مومن میں تعینات تھا۔ مجھے ایک دن ایک کیس کے سلسلہ میں علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھلوال جانا پڑا۔ ابھی میں فارغ ہو کر کمرہ عدالت سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے اپنے تھانے کا ایک کانسٹیبل پریشانی کے عالم میں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ بڑا بدحواس تھا اور اس کی بے وقت اور اچانک آمد کسی خطرے کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں نے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ موضع للیانی کے ایک ڈیرہ پر مسلم شیخ برادری کا ایک شخص قتل ہو گیا ہے۔ یہ سن کر میں نے فوراً کانسٹیبل کو تھانہ کی طرف روانہ کر دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ تھانہ پہنچ کر کسی اے ایس آئی اور چند ملازمین کو فوری جائے وقوعہ کی جانب روانہ کرے، جب کہ میں خود جائے وقوعہ پر جانے کیلئے روانہ ہو گیا۔ نصف گھنٹہ کے بعد میں جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔ یہاں مسلم شیخ برادری کی عورتیں اور مرد رو پیٹ رہے تھے۔ ان کا حال دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ سب مجھ سے انصاف کا تقاضا کر رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں جلد از جلد مجرموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچاؤں۔ میں نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ وہ پہلے مجھے اس قتل کی تمام تفصیلات سے آگاہ کریں تا کہ میں اپنی تفتیش کا آغاز کر سکوں۔ انہوں نے جو کچھ مجھے بتایا اس کے مطابق قتل ہونے والے شخص کا نام نور تھا جس کے زمینداروں کی ایک لڑکی کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔ اور یقین ظاہر کیا کہ اسی بنا پر زمینداروں نے نورے کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے انہیں مکمل انصاف کی

یقین دہانی کرائی۔ اس دوران تھانے سے ایک اے ایس آئی اور چند دیگر ملازمین بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ان کے پہنچنے پر میں نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

اس وقت اندھیرا قدرے چھا چکا تھا۔ روشنی کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث مجھے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے میں کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ تاہم معائنہ پر مجھے لوسن کے کھیت کے ایک مقام پر دیسی ساخت کا ایک پرانا جوتا الٹا پڑا ہوا ملا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ نورے کا جوتا ہے۔ مزید کچھ فاصلے پر مجھے دوسرا جوتا بھی مل گیا۔ یہ جوتا بھی اسی انداز میں پڑا ہوا تھا۔ مزید چند قدم آگے ایک کھیس پڑا ہوا ملا۔ ان تمام اشیاء کا اس ترتیب سے ملنا اور جائے وقوعہ کا زمینداروں کے ڈیرے کے قریب ہونا اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ نورا لڑکی کو ملنے زمینداروں کے ڈیرہ پر گیا۔ اس کی خبر زمینداروں کو ہوگئی۔ وہ یہاں سے بھاگا۔ زمیندار بھی تعاقب کرتے ہوئے اس کے پیچھے آئے اور آخر کار حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے باریک بینی سے ملاحظہ موقع نہ کیا جا سکا تا کہ کھوج اور خون کا پتہ چل سکے۔ موقعہ کی حفاظت پر ملازمین مامور کر دیئے تا کہ دوسرے روز ملاحظہ کیا جائے۔

میں نے زمینداروں کے ڈیرہ پر پہنچ کر تفتیش کا آغاز مسماۃ فتیس بی بی کے گھر والوں سے کیا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کے ساتھ نورے کی دوستی اور ناجائز تعلقات بیان کیے گئے تھے۔ میں نے جب فتیس بی بی کے والد سے کہا کہ وہ لڑکی کو پیش کرے تو وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا جناب وہ تو دو تین ہفتے سے اپنے بڑے بھائی محمد خان کے گھر مڈھ رانجھا گئی ہوئی ہے۔ مجھے شک ہوا کہ ممکن ہے انہوں نے لڑکی کو بھی قتل کر دیا ہو۔ میں نے لڑکی کے والد کو کہا کہ اسے وہاں سے بلوائیں۔ جناب میں ابھی اپنے دوسرے بیٹے کو اس کے پاس بھیجتا ہوں۔ وہ ابھی لے کر آ جاتا ہے۔

اس کے بعد اس نے گھر میں موجود اپنے بیٹے کو مڈھ رانجھا روانہ کر دیا۔ چونکہ ان دنوں عام طور پر لوگ گھوڑوں پر سفر کرتے تھے، اس لئے وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں فتیس بی بی کے والد سے پوچھ گچھ کرتا کہ وہ مجھے صحیح صورتحال بتا دے۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر کہا کہ اگر اس نے مجھے اس قتل کی بابت صحیح معلومات مہیا کر دیں تو میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔ اور اگر اس نے حقائق نہ بتائے تو صبح تک اصل معاملہ ضرور منظر عام پر آ جائے گا۔ پھر اس صورت میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ یہ سن کر لڑکی کے والد نے

زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "جناب! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نورے کو کس نے قتل کیا ہے"۔

میں نے دریافت کیا کہ آیا وہ جانتا ہے کہ نورے کے اس کی بیٹی کے ساتھ مراسم تھے تو اس نے تسلیم کیا کہ اس کے علم میں یہ بات تھی۔ اس لئے جب اس نے محسوس کیا کہ بات بڑھ گئی ہے اور اس کی عزت خطرے میں ہے تو اس نے فوراً بیٹی کو اپنے گاؤں سے باہر دور اس کے بڑے بھائی کے پاس مڈھ رانجھ بھجوا دیا۔ اگرچہ وہ بار بار یہی بتا رہا تھا کہ اس کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں اور وہ بے گناہ ہے، لیکن میں اب تک جتنے افراد سے مل چکا تھا ان کے بیانات سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان زمینداروں نے باہم مشورے کے ساتھ نورے اور اپنی لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔ اگرچہ حالات واقعات کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی کا والد جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس کے بیان سے مجھے سچائی نظر آ رہی تھی۔ میں عجیب شش و پنج میں تھا۔ اس کیس نے مجھے بری طرح الجھا دیا۔ میں حیران تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اگر لڑکی کے ورثاء بے گناہ ہیں تو پھر نورے کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ دوسرے روز روشنی میں یہ ملاحظہ موقع کرنے سے کوئی نئی بات سامنے آنے کی امید تھی۔

سردیوں کی سخت ترین رات تھی۔ میں چارپائی پر لحاف اوڑھے کب سے بیٹھا اسی وقوعہ پر غور کرتا رہا۔ صبح جب سورج نے اپنا سفر شروع کیا تو میں اے ایس آئی محمد حسین اور دیگر ملازمین کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا اور دوبارہ ان جگہوں کا معائنہ کیا جہاں نورے کے جوتے اور کھیس پڑے تھے۔ کھیس والی جگہ پر ایک شخص کا کھوج ملا۔ جہاں سے جوتے ملے تھے وہاں بھی ایک ہی شخص کی نشاندہی ہوتی تھی۔ اب ہمیں اس بات کا سراغ لگانا تھا کہ یہ کھوج کے نشانات واقعی نورا کے ہیں۔ ایک بات مشکوک لگ رہی تھی کہ جس شخص کے کھوج کے نشانات تھے وہ نشانات بھاگتے شخص کے نہیں تھے۔

پھر ہم اس جگہ پہنچے جہاں لوسن کی فصل تقریباً ایک فٹ اونچی تھی۔ اس کے پاس ہی کافی مقدار میں خون پڑا ہوا تھا۔ قابل توجہ بات یہ تھی کہ خون ایک ہی مقام پر جما ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کوئی چھینٹے وغیرہ نہیں تھے۔ گھٹنوں کے بل جھک کر خون سونگھا تو میں نے اندازہ لگایا کہ یہ انسانی خون نہیں کیونکہ انسانی خون سونگھا جائے تو اس میں سے بدبو آتی ہے جب کہ اس خون میں کسی قسم کی بو نہیں آ رہی تھی۔ اب میں موقع پر کھڑے کھڑے سوچ رہا تھا کہ اگر نورا مسلم شیخ کو تعاقب کر

کے قتل کیا جاتا تو وہ بھی آگے سے مزاحمت کرتا اور خون کے چھینٹے مختلف جگہوں پر ہوتے جب کہ یہ خون ایک جگہ پڑا ہے اور وہ بھی انسانی خون معلوم نہیں ہو رہا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس جگہ کسی جانور کو ذبح کیا گیا ہو۔ میری پریشانی مزید بڑھ گئی کہ کیس حل ہونے کی بجائے اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب میں نے خون کو غور سے دیکھا تو اچانک میری نظر خون کے آس پاس پڑے ہوئے بے شمار چھوٹے چھوٹے سفید بالوں پر پڑی۔ میں نے سمجھا کہ یہ بکری کے بال ہو سکتے ہیں۔

اور اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس جگہ ضرور کوئی ڈرامہ رچایا گیا ہے معاملہ کچھ اور ہے۔ اے ایس آئی محمد حسین کو ہدایت کی کہ وہ تمام بال احتیاط کے ساتھ سفید کاغذ پر جمع کر لے۔ وہ اس کام میں لگ گیا۔ اسی سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار تیزی سے ہماری طرف آ رہا ہے۔ ہم سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جب وہ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ فتیس بی بی کا بھائی فتح محمد ہے۔ وہی کل رات مڈھ رانجھا اپنی بہن کو لینے گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر کہ وہ اپنی بہن فتیس بی بی کو ساتھ کیوں نہیں لایا وہ پھٹ پڑا "تھانیدار صاحب! ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہماری عزت خاک میں مل گئی"۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو اس نے انکشاف کیا کہ تھانیدار صاحب نورا زندہ ہے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور تفصیل کے ساتھ حالات و واقعات بتانے کو کہا۔ اس پر وہ کہنے لگا" تھانیدار صاحب! آپ خود ہی اس سے پوچھ لیں۔ اس وقت وہ میرے بھائی کے ڈیرے پر موجود ہے اور وہاں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے"۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جانے سے پہلے محمد حسین اے ایس آئی کو فتح محمد کے ساتھ روانہ کر دیا اور ہدایت کی کہ اسے سیدھا تھانے لے آئیں۔ میں بھی تھانے کے لیے روانہ ہوا اور راستہ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا کہ یہ عجیب معمہ ہے۔

شام ہوئی تو محمد حسین اے ایس آئی نورے کو پکڑ کر تھانے میں لایا۔ سب سے پہلے میں نے فتح محمد سے تمام حالات کو جاننا ضروری سمجھا۔ میں نے اسے کہا "فتح محمد اب جب کہ تمام معاملہ سامنے آ چکا ہے اور نورا بھی قتل نہیں ہوا تو یہ سب ڈرامہ کس لیے کیا گیا؟" فتح محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے بڑی رازداری سے مجھے اصل بات بتانی شروع کی۔ "تھانیدار صاحب! جب عزت کا معاملہ ہو تو انسان کٹ مرنے سے بھی نہیں گھبراتا۔ نورے نے میری بہن کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ہمیں اس بابت معلوم ہوا تو ہم نے بڑی خاموشی سے نورے کو سمجھایا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے کیونکہ اس طرح ہماری بدنامی ہو رہی ہے۔ ہم نے اپنی

بہن کے بھی باہر نکلنے پر مکمل پابندی عائد کردی۔ مگر وہ دونوں باز نہ آئے اور کسی نہ کسی ذریعے سے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ہمیں اس میل ملاقات کی خبر ہوئی تو آخرکار ہم نے اپنی بہن کو اپنے دوسرے بھائی محمد خان کے پاس بھیج دیا جو مڈھ رانجھہ ہوتا ہے۔ اب محمد خان بھی ہمارے ساتھ آیا ہے باقی واقعہ اس سے پوچھ لیں"۔ میں نے محمد خان کو بلوایا تو اس نے دریافت کرنے پر بتلایا کہ "کل رات میں اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے کوٹھ میں سویا ہوا تھا میری بہن فتیس بی بی بھی ہمارے ساتھ اس کوٹھ میں سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت رات کافی گزر چکی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر ہمارے صحن میں روڑا گرنے کی آواز آئی۔ میں خاموش لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بہن چارپائی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مجھے شک ہوا کہ نورا نے روڑا پھینکا ہے جس کی آواز سن کر وہ باہر گئی ہے۔ میں چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک دیوار پر چڑھی۔ ابھی وہ باہر کودنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے باہر نکل کر اسے بلایا۔ دوسری جانب نورا موجود تھا۔ میری آواز سن کر وہ بھاگ نکلا اور قریبی کماد کے کھیت میں روپوش ہو گیا۔ میں نے چور چور کا شور کیا۔ کچھ لوگ شور کی آواز سن کر اکٹھے ہو گئے۔ ہم نے نورے کو کماد کے کھیت سے تلاش کر کے پکڑ لیا"۔ جب میں محمد خان سے یہ ساری روداد سن چکا تو میں نے کہانی کا دوسرا رخ جاننے کے لیے نورے کو بلایا اور اس پر کئی طرح کے سوالات کیے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور اس سے ٹھیک طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ آخر وہ بولا "تھانیدار صاحب! میں واقعی گناہ گار ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کر دیں"۔

میں نے اسے اصل بات بتانے کو کہا۔ اس پر نورا بولا کہ میں موضع للیانی کے زمیندار اللہ بخش کا ملازم ہوں۔ اس کے ڈیرے کے کچھ فاصلے پر ایک اور زمیندار طاہر خان کا ڈیرہ ہے جہاں میں اکثر کسی نہ کسی کام کے لئے آتا جاتا تھا۔ ایک دن وہاں گیا تو میری نظر فتیس بی بی پر پڑی جو طاہر خان کی بیٹی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی اور اکثر ہمارے ملاقات ہونے لگی۔ ہمارے درمیان عہد و پیمان ہونے لگے۔ ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی جانے لگیں۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ لیکن بعد ازاں اس کا علم طاہر خان اور اس کے بیٹوں کو ہو گیا۔ انہوں نے فتیس بی بی کے باہر نکلنے پر سخت پابندی لگا دی۔ اور پھر اس کو اپنے بھائی محمد خان کے پاس مڈھ رانجھہ بھیج دیا۔

میں نے اپنی ایک رشتہ دار خاتون کو جس کے ذریعے پہلے بھی ہماری ملاقاتیں ہوتی

تھیں قنیس بی بی کے پاس پیغام بھیجا کہ دونوں بھاگ جائیں۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسا ڈرامہ کیا جائے کہ لوگ ہمیں ڈھونڈ نہ سکیں اور نہ ہی ہمارا پیچھا کر سکیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ یہ دونوں قتل ہو گئے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ کسی دوست سے ایک قتل کے بارے میں سنا تھا۔ میں نے بھی اس منصوبے پر عمل کا فیصلہ کیا۔ میرے مالکوں نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ جب شام ہوئی میں نے چپکے سے اسے اپنے ساتھ لیا اور لوسن کے کھیت میں چلا آیا۔ ایک تیز دھار چھرا میرے پاس پہلے سے موجود تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔ میں نے کتے کو پیار کرتے ہوئے نیچے لٹایا اور پھر اچانک اس کے گلے پر چھرا چلا دیا اور اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مر گیا۔ میں نے سوچا اب میرا منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا۔ میں نے راستے میں کھیس اور جوتے اس ترتیب سے پھینک دیئے کہ پولیس اور گاؤں کے لوگ اس بات پر یقین کر لیں کہ نورے کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کے قتل میں زمینداروں کا ہاتھ ہے۔ بعد ازاں میں نے ذبح شدہ کتے کی لاش قریب ہی واقع ایک راجباہ میں پھینک دی اور پروگرام کے مطابق میں خود قنیس بی بی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تقریباً رات کا پچھلا پہر تھا کہ میں مڈھ رانجھا پہنچ گیا۔ میں نے اسے ایک مخصوص اشارہ دیا یعنی ان کے صحن میں روڑا پھینکا تو اسے میری آمد کا پتہ چل گیا۔ ابھی وہ باہر آنے کے لیے دیوار پھلانگ ہی رہی تھی کہ اس کا بھائی محمد خان بھی وہاں آ گیا اور اس نے باہر نکل کر شور مچا دیا۔ میں شور سن کر کماد کے کھیت میں چھپ گیا۔ اس دوران بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور مجھے کھیت میں تلاش کرنے لگے۔ بالآخر انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور خوب مارا۔ اس نے روتے ہوئے کہا ''جناب! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔'' جب ساری حقیقت میرے سامنے آ گئی تو میں نے مسلم شیخ برادری کے سرکردہ افراد کو بلایا اور ان کی موجودگی میں نورا سے کہا کہ وہ دوبارہ وہی کہانی بیان کرے۔ اس نے دوبارہ وہی کہانی سنانا شروع کی جو اس سے پہلے وہ مجھے سنا چکا تھا۔ سب نے اس پر خوب لعن طعن کی۔ بعد ازاں میں نے گاؤں کے سب افراد کی موجودگی میں راجباہ سے ذبح شدہ کتا برآمد کر لیا جو راجباہ کی ٹیل میں اٹکا ہوا تھا۔ نورا کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی۔ قارئین حضرات اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ ایک گاؤں کا جاہل شخص جس کا تعلق مسلم شیخ برادری سے تھا اس نے یہ ڈرامہ رچا کر پولیس اور علاقہ کے لوگوں کو کس قدر دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ علاقہ کے لوگ اور پولیس یہ سمجھیں گے کہ اسے اور قنیس بی بی کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ خود دور دراز علاقہ میں چھپ کر اپنی زندگی گزار دیں

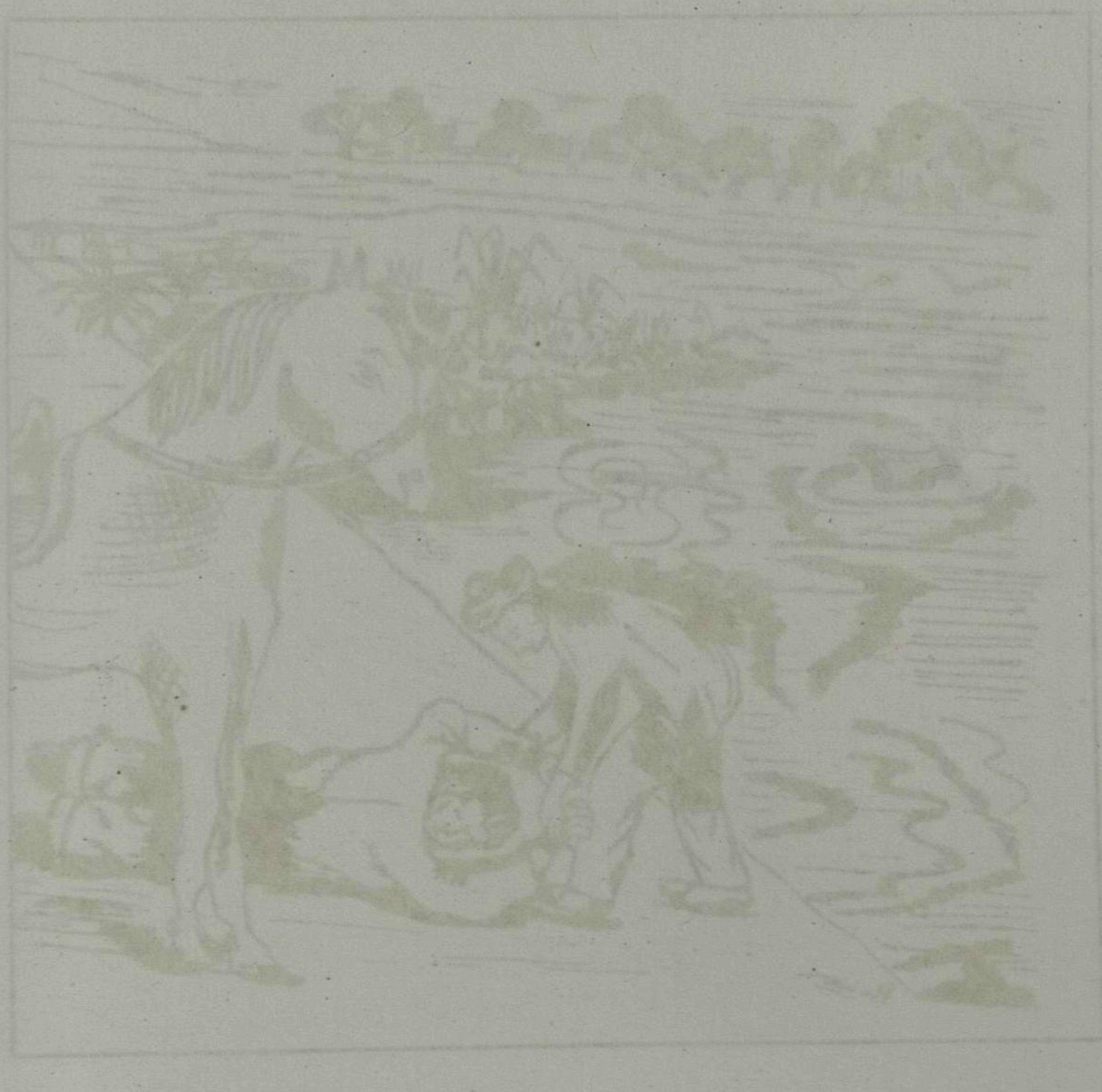
گے۔آخر وہ اپنے اس رچائے ہوئے ڈرامہ میں کامیاب نہ ہوسکا اور قانون کے شکنجے میں آ گیا۔

عشق بھی عجیب چیز ہے۔ایک زمیندار گھرانے کی لڑکی نے ایک مسلم شیخ نوکر کے ساتھ تعلقات استوار کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے اس فعل سے اس کے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔سچ کہتے ہیں کہ عشق نہ پچھے ذات۔اللہ تعالیٰ ہر ایک کی عزت محفوظ رکھے (آمین)

غصّہ حرام



وامضة



1973ء

غصہ حرام ہے۔ غصہ کی شدت انسانی عقل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ انسان غصہ کے عالم میں وہ سب کچھ کر بیٹھتا ہے جو بعد میں اسے پچھتانا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غصہ آئے تو فوراً پانی پی لینا چاہیے۔ اگر کھڑے ہوں تو بیٹھ جانا چاہیے۔ غصہ کو پی جانا بھی ایک عبادت ہے۔ ایک ایسا واقعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں ایک بھائی نے غصہ میں آ کر دوسرے بھائی کو قتل کر دیا۔

کوٹ مومن ضلع سرگودھا کا ایک قصبہ ہے۔ یہ تحصیل بھلوال میں واقع ہے۔ 1973ء میں، میں کوٹ مومن پولیس اسٹیشن کا انچارج تھا۔ ایک شخص نے مجھے اطلاع دی کہ موضع او پی کا ایک شخص، جس کا نام خان محمد ہے عرصہ دو مہینے سے لاپتہ ہے۔

موضع میٹرے میں خان محمد اور مانک دو بھائیوں نے 1/2 مربع زمین پٹہ پر لی ہوئی ہے۔ دونوں بھائی وہاں زمین میں کام کرتے تھے۔ دو ماہ سے خان محمد کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا بھائی عام لوگوں کو کہتا ہے کہ اس کا بھائی خان محمد دریائے چناب میں ڈوب گیا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کے ڈوب کر مرنے کی اطلاع بھی تھانہ میں نہیں دی ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ خان محمد کے متعلق پتہ چلا کہ وہ انتہائی شریف، نیک سیرت اور صاف گو انسان تھا۔ اس کو کسی کے ساتھ کوئی دشمنی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانہ میں درج کی۔ اور دریافت کیلئے اس کے بھائی مانک کو بلایا۔

مانک نے بتایا کہ موضع میٹرے میں خان محمد اور اس نے مل کر 1/2 مربع اراضی احمد میٹرا سے پٹہ پر لی ہوئی ہے۔ ان کے کنبہ کے افراد موضع او پی میں ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں بھائی پٹہ پر لی ہوئی زمین کاشت کرتے ہیں اور وہاں ہی زمین میں ڈیرہ بنا کر رہائش رکھی ہوئی ہے۔ دو مہینے گزرے ہیں 15 ماہ رمضان رات کو ڈیرہ سے ان کی ایک بھینس چوری ہوگئی۔ صبح سویرے ان دونوں بھائیوں نے چوروں اور بھینس کا کھوج رواں کیا۔ دو بجے دن کے قریب یہ دونوں بھائی کھوج لے کر دریائے چناب پر پہنچے وہاں کھوج گم ہوگیا۔ یہ دونوں بھائی کھوج کی تلاش میں دریا کے کنارے پھر رہے تھے کہ اچانک خان محمد کا پاؤں پھسلا اور وہ دریا میں گر پڑا۔ میں نے شور واویلہ کیا لیکن کوئی شخص نزدیک نہیں تھا جو امداد کو پہنچتا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بھائی

کو دریا کی لہریں نگل گئیں۔ یہ اپنے طور پر چند روز دریا کے کنارے پھرتا رہا ہے۔ لیکن اس کے بھائی کی لاش نہیں مل سکی۔ چونکہ اس کا بھائی اتفاقیہ طور پر دریا میں ڈوب گیا تھا، اس لئے اس نے تھانہ میں کوئی اطلاع وغیرہ نہ دی تھی۔

میں نے اس کو ہمراہ لیا۔ موضع اوپی کے چند معززین کو ساتھ لیا اور موضع میٹرے میں سیدھے ان کے ڈیرہ پر پہنچے۔ وہاں موضع میٹرے کے صالح محمد نمبردار کو بلا لیا۔ وہاں پر جب مانک سے پوچھا گیا کہ جس جگہ سے اس کی بھینس چوری ہوئی ہے اس جگہ کی نشاندہی کرے اور بھینس کا حلیہ بھی بتائے۔ اس نے اس جگہ کی نشاندہی کی اور بھینس کا حلیہ بھی بتایا۔

اس سوال کے جواب میں کہ جائے وقوعہ سے دریائے چناب کا فاصلہ تقریباً بارہ میل ہے۔ جب یہ کھوج نکال کر جا رہے تھے تو راستہ میں کون لوگ ملے تھے اور کس کس جگہ پانی پیا یا روٹی وغیرہ کھائی۔ اس پر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا اور بالکل لاجواب ہو گیا۔ اسی اثنا میں ان کے ایک پڑوسی ڈیرہ والے نے بتایا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ ان کی کوئی بھینس چوری ہوتی تو انہیں بھی پتہ چلتا اور جو حلیہ یہ بتا رہا ہے اس حلیہ کی ان کی کوئی بھینس تھی ہی نہیں۔

اب جب وہ بالکل لاجواب ہو گیا تو اس نے بتایا کہ وہ سب کچھ جھوٹ بول رہا ہے۔ 15 ماہ رمضان کو اس نے اور اس کے بھائی خان محمد نے روزے رکھے ہوئے تھے۔ شام کو افطاری کیلئے یہ توے پر روٹی پکا رہا تھا کہ روٹی جل گئی۔ اس کے بھائی خان محمد نے اس کو گالی دی کہ روٹی کیوں جلائی ہے۔ اس کو فوراً غصہ آ گیا۔ پاس چھری پڑی تھی۔ اس نے اٹھائی اور خان محمد کو ماردی جو اس کی وکھی میں لگی۔ خون جاری ہو گیا۔ اس نے کپڑا وکھی پر باندھ کر خون بند کرنے کی کوشش کی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے خان محمد فوت ہو گیا۔ اس نے چارپائی پر ڈال کر کپڑا اوپر ڈال دیا۔ آدھی رات کے وقت ڈیرہ کے نزدیک زمین کھود کر دفن کر دیا۔ دوسرے روز خیال آیا کہ اگر پولیس کو پتہ چل گیا اور لاش موقع سے برآمد ہو گئی تو وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا اس نے رات کو اپنے بھائی کی نعش نکالی، ایک چادر میں باندھ کر گھوڑی پر لاد کر موضع سیکدے کے قریب دریائے چناب میں پھینک دی۔ جہاں سے نعش پھینکی وہاں دریا کا کنارہ کافی اونچا اور نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ پانی زیادہ نہیں تھا۔ اس نے نعش کنارے سے نیچے پھینکی اور اوپر سے کنارے کی مٹی نعش پر گرا دی۔ اور دوسرے روز دریا کے کنارے واویلہ شروع کر دیا کہ اس کا بھائی دریا میں ڈوب گیا ہے"۔

اس نے انکشاف کیا اب اس واقعہ کو دو ماہ گزر چکے ہیں۔ بظاہر اتنے عرصہ کے بعد نعش کا

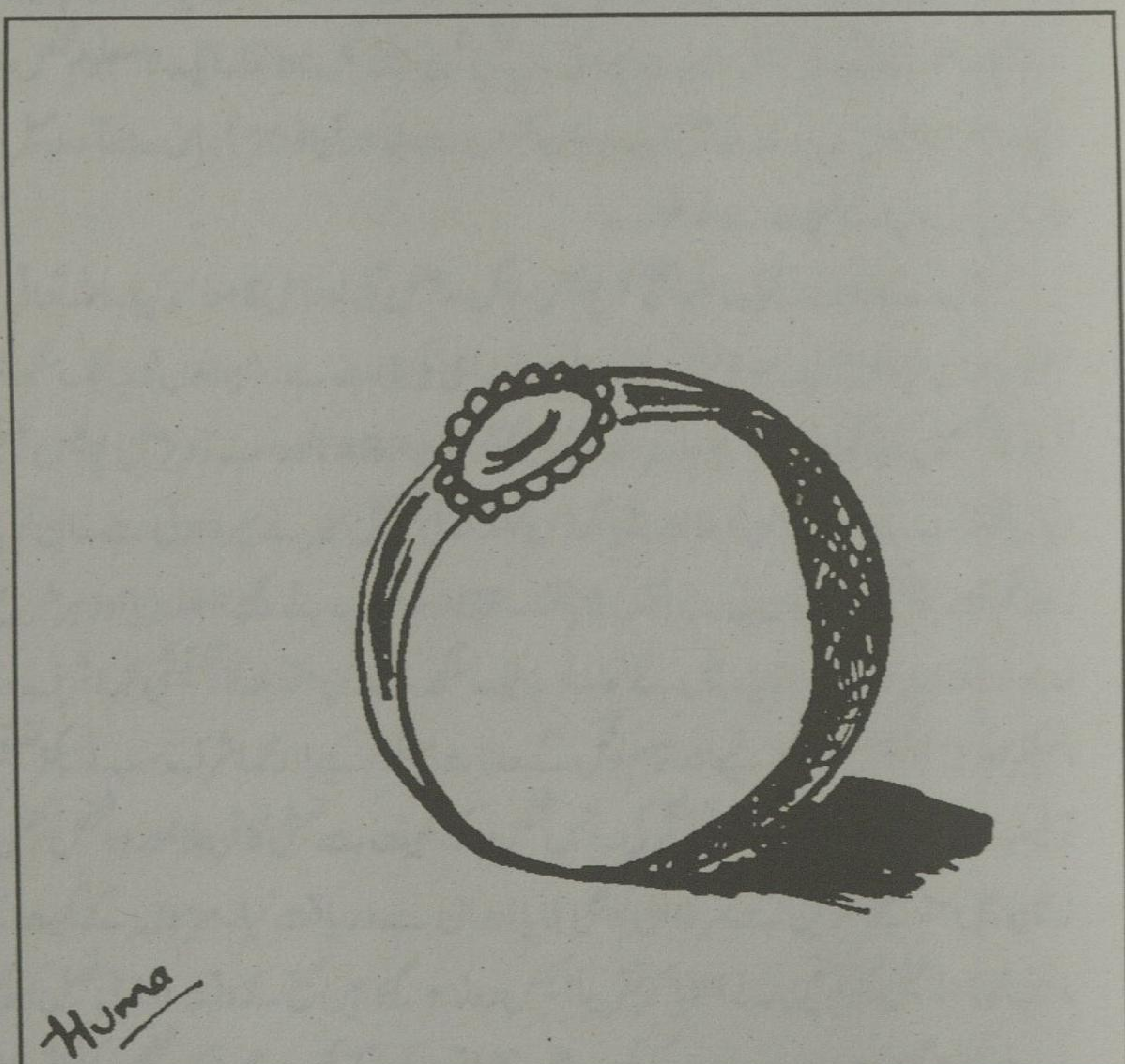
دریائے چناب سے ملنا ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن مجھے خیال آیا کہ کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

اس کے اس انکشاف پر تھانہ کوٹ مومن میں مقدمہ قتل درج کیا گیا اور ملزم کو باقاعدہ گرفتار کر کے دوسرے روز علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر کے نعش کی نشاندہی کیلئے سات یوم کا ریمانڈ جسمانی حاصل کیا۔ اور اگلے روز معززین علاقہ کو ہمراہ لے کر گھوڑیوں پر سوار ہو کر دریائے چناب اس کی نشاندہی پر گئے۔ چونکہ اس نے نعش رات کو پھینکی تھی اور عرصہ بھی دو مہینے کا گزر گیا تھا وہ شخص جگہ کی نشاندہی نہ کر سکا۔ البتہ اس نے دریا کے کنارے ایک جگہ کھڑے ہو کر بتایا کہ اس ایریا میں نعش پھینکی تھی۔ میں گھوڑی پر سوار دریا پر تقریباً 100 گز اوپر کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خان محمد کی نعش صحیح سلامت دریا میں پڑی تھی جو صاف نظر آ رہی تھی۔ ہوا یوں کہ نعش نیچے ریت میں دفن رہی۔ سردیوں کا موسم تھا دریا میں پانی کم ہو گیا تو نعش بالکل ننگی ہو گئی۔ اسے ہمرائیوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ خان محمد کی نعش ہے۔ لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص نیک تھا اس لئے اس کی نعش محفوظ رہی ہے۔ نعش کا پوسٹ مارٹم کروایا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں چھری کا زخم لگنا ثابت ہو گیا۔ ملزم کے خلاف عدالت میں چالان بھجوایا گیا۔

چونکہ بھائیوں کا معاملہ تھا ان کی صلح ہو گئی اور گواہان نے اس کے خلاف شہادت نہ دی بلکہ اپنے بیانات سے انحراف کر گئے۔ اس وجہ سے مانک ملزم کو عدالت نے بری کر دیا۔

غصہ نے ایک قیمتی جان لے لی۔ وقتی طور پر غصہ کو پی لینے سے انسان ایک بہت بڑی تباہی سے بچ سکتا ہے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ غصہ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔

انگوٹھی سے قاتل تک



1976ء

میں جنوری 1976ء میں ضلع میانوالی سے تبدیل ہو کر ضلع لائل پور موجودہ ضلع فیصل آباد آیا۔ ان دنوں میرا عہدہ سب انسپکٹر تھا۔ اس وقت فیصل آباد کے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس جناب غلام اصغر ملک تھے۔ اُن دنوں غلام اصغر ملک کا شمار انتہائی لائق، محنتی اور ایماندار پولیس افسروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک باریک بین اور معاملہ فہم شخصیت تھے۔ میں چونکہ دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر آیا تھا اس لئے میں رسمی اور اخلاقی طور پر ایس ایس پی صاحب کو ملنے کیلئے ان کے دفتر گیا۔ اردلی کی معرفت اطلاع بھجوائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایس ایس پی نے مجھے ملاقات کا موقع دیا۔ تعارفی گفتگو کے بعد انہوں نے فرمایا کہ تمہاری شہرت تو اچھی سنی ہے لیکن وہ خود ٹیسٹ کریں گے تو پھر وہ اپنی رائے قائم کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ٹیسٹ کرنے کیلئے تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک اندھے قتل کی تفتیش میرے سپرد کی۔ یہ قتل تین ہفتے قبل ہوا تھا۔ ایک نامعلوم شخص کا سر، چک نمبر 512 ج ب کے رقبہ میں ایک ویران کنواں سے ملا اور تن (دھڑ) وہاں سے آدھ میل کے فاصلہ پر سرسوں کے کھیت سے ملا تھا۔

میں نے تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچ کر پولیس فائل حاصل کی اور اس کا معائنہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا کی کیونکہ عزت اور ذلت دینے والی صرف اسی کی ذات ہے۔ ان دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ فیصل آباد کا تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ چوہدری محمد عرفان محمود خان ASP بطور سب ڈویژنل پولیس آفیسر وہاں تعینات تھے۔ میں ان کو ملا اور بتایا کہ اس مقدمہ کی تفتیش میرے سپرد ہوئی ہے۔ ان کو پہلے سے علم تھا۔ غالباً ایس ایس پی نے انہیں بتایا تھا۔ ASP صاحب نے مجھے حوصلہ دیا اور ہر طرح کی امداد اور تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اس مقدمہ کا تفتیشی محمد اشرف سب انسپکٹر اور 2 کانسٹیبل ساتھ لیے اور شام کو قتل کے حالات معلوم کیے اور محمد اشرف سب انسپکٹر تفتیشی آفیسر سے بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ جس شخص کے کھیت سے نعش کا تن ملا اور وہ شخص جس کی زمین میں اندھے کنویں سے سر ملا ان کو بھی بلایا اور ان سے دریافت کیا۔ سرسوں کے کھیت کے مالک محمد اسماعیل آرائیں نے بتلایا کہ تقریباً اکیس روز ہو گئے ہیں صبح کے وقت وہ اپنی فصل کو پھیرا مارنے کیلئے گیا۔ جب وہ سرسوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ کھیت میں ایک شخص کی نعش پڑی

ہوئی ہے جس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور سر موجود نہ ہے۔ خاکی رنگ کے کپڑے شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ محمد اسماعیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتلایا کہ اس نے فوراً ہی گاؤں میں آ کر نمبردار کو بتایا جس نے تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ اطلاع دی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ نعش کو اٹھا کر انہوں نے پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوادیا اور نعش کے سر کی تلاش شروع کر دی۔ جائے وقوعہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر فقیر محمد آرائیں کی زمین میں اندھا کنواں ہے۔ ایک چرواہے نے آ کر اطلاع دی کہ کنویں کے اندر پانی میں بال نظر آ رہے ہیں۔ چنانچہ پولیس وہاں پہنچی تو وہاں سے نعش کا سر بھی مل گیا۔

محمد اشرف اے ایس آئی نے بتایا کہ انہوں نے نمبردار کی اطلاع پر قتل کا مقدمہ درج کرلیا تھا۔ نعش کا سرتن (دھڑ) گاؤں کے لوگوں کو دکھایا لیکن کسی نے شناخت نہ کیا۔ ان کیلئے یہ معمہ بن گیا کیونکہ مقتول کی شناخت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ کون ہے۔ قاتل تلاش کرنا تو دور کی بات تھی۔ ہم نے رات گاؤں کے سکول میں بسر کی۔ محمد اشرف سب انسپکٹر نے عدالت میں گواہی کیلئے جانا تھا۔ اس کو فارغ کر دیا اور قریب آٹھ بجے دن نمبردار اور چوکیدار کو ساتھ لے کر موقع پر پہنچا۔ دونوں کانسٹیبل بھی ساتھ تھے۔ جائے وقوعہ سرسوں کے کھیت میں تھا۔ سرسوں پک چکی تھی۔ جس مقام پر نعش ملی تین چار گز کے ایریا میں فصل لتاڑی گئی تھی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ اس مقام پر کش مکش ہوئی ہے۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور ٹوٹے ہوئے سرسوں کے تنکے اٹھانے شروع کیے تا کہ موقع پر کوئی چیز رہ گئی ہو تو پتہ چل سکے۔ میں نے نہایت باریک بینی کے ساتھ موقع کا ملاحظہ کیا۔ تنکے صاف کرتے ہوئے موقع سے مجھے چند بال اور ایک چاندی کی انگوٹھی جس میں بڑے سائز کا سبز رنگ کا نگ تھا جو عام طور پر ملنگ ٹائپ لوگ پہنتے ہیں ملے میں نے ان چیزوں کو محفوظ کیا اور پھر کنویں پر گئے جہاں نعش کا سر ملا تھا۔ اس کنویں کے اندر پانی سے تلاش کروانے پر ایک چاندی کا تعویذ ملا جس میں کالے رنگ کا دھاگا تھا۔ تعویذ بھی قبضہ میں لیا۔

واپس گاؤں آ گئے۔ گاؤں میں منادی کروا کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور انگوٹھی اور تعویذ دکھایا۔ شام کو محمد طفیل نمبردار میرے پاس آیا۔ کہا کہ "ایک شخص آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے"۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ گاؤں کا غریب آدمی ہے۔ بات بتانے سے ڈرتا ہے۔ میں نے نمبردار کو اعتماد میں لیا۔ وہ اس شخص کو رات کے اندھیرے میں میرے پاس لے آیا (اب بھی اس کا نام صیغہ راز میں رکھا جائے گا اور میں اس شخص کا نام تحریر نہیں کروں گا)۔ گیارہ بجے رات کا وقت تھا۔ اس

شخص نے اِدھر اُدھر دیکھ کرانتہائی رازداری کے ساتھ مجھے بتایا کہ تقریباً تین ہفتے گزرے ہیں کہ وہ بوٹا گوجر کے گھر نو بجے رات کے قریب گیا۔اس نے بوٹا سے پانچ سو روپے ادھار لیا تھا وہ واپس کرنے کیلئے گیا تھا۔وہاں ایک چارپائی پر بوٹا بیٹھا تھا اور دوسری چارپائی پر ایک شخص جواں عمر بیٹھا تھا جس نے خاکی رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں کو انگلیوں میں موٹے نگوں والی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ شخص ان کے گاؤں کا نہیں تھا اور نہ ہی پہلے وہ کبھی اس علاقہ میں دیکھا گیا تھا۔اور اس روز کے بعد اسے نہیں دیکھا۔آج آپ نے جو انگوٹھی دکھائی ہے یہ اس کی انگوٹھی کی طرح ہے۔

جب میں نے خاکی کپڑوں اور نگوں کی بات سنی تو میں بھانپ گیا اور کامیابی کے آثار مجھے نظر آنے لگے کیونکہ مقتول نے کپڑے خاکی رنگ کے ہی پہنے ہوئے تھے اور قتل والی جگہ سے انگوٹھی موٹے نگوں والی ملی تھی۔

یہاں سے تھانہ ٹوبہ صرف ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔میں نے گاڑی میں ایک کانسٹیبل کو تھانہ بھیجا کہ وہاں سے مقتول کے کپڑے لائے۔آدھ گھنٹہ کے بعد کانسٹیبل کپڑے لے کر واپس آ گیا۔کپڑے دیکھتے ہی اس شخص نے کہا کہ یہی کپڑے اس شخص نے پہنے ہوئے تھے جس کو اس نے بوٹا گوجر کے گھر دیکھا تھا۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری تفتیش درست سمت جا رہی ہے اور انشاءاللہ عنقریب یہ عقدہ کھلنے والا ہے۔میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے واپس گھر بھیج دیا۔

صبح اٹھ کر خفیہ طور پہ بوٹا گوجر کا پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر موجود ہے۔چوکیدار اور ایک کانسٹیبل کو بھیج کر بوٹا کو بلوایا۔''کیا نام ہے تمہارا''؟ میں نے اس سے پوچھا جس پر اس نے اپنا نام بوٹا بتایا۔''چارپائی پر بیٹھ جائیں'' میں نے اس سے کہا۔بوٹا گوجر چارپائی پر بیٹھ گیا۔اس کے چہرہ کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔اس کا چہرہ اس کے پاپ کی عکاسی کر رہا تھا۔

''ایک ماہ کے اندر تمہارے گھر کوئی مہمان آیا ہے''؟ میں نے بوٹا گوجر سے سوال کیا۔

''نہیں جناب میرے گھر ایک مہینے سے کوئی مہمان نہیں آیا'' بوٹا گوجر نے جواب دیا۔

''ذرا سوچ کر بتائیں کسی کے گھر مہمان کا آنا کوئی جرم نہیں۔اگر ثابت ہو گیا کہ تمہارے گھر مہمان آیا ہے اور تم جھوٹ بول رہے ہو تو اس کی ذمہ داری تم پر ہو گی''۔میں نے اسے ذرا

سخت لہجے میں کہا۔ بوٹا گوجر نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بتایا کہ موضع جانی والا سے محمد دین گوجر تین ہفتے پہلے اس کے گھر آیا تھا جو رات اس کے ہاں ٹھہرا اور دوسرے روز واپس چلا گیا تھا۔ ''اس نے کپڑے کیسے پہنے ہوئے تھے''؟ اس سے سوال کیا۔ ''یہ مجھے یاد نہیں'' اس نے جواب دیا۔ اسی اثنا میں ایک کانسٹیبل کو موٹر سائیکل پر موضع جانی والا بھیجا کہ وہ محمد دین کا پتہ کر کے اسے لائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ محمد دین گوجر کو ساتھ لے کر آ گیا۔ جب بوٹا گوجر نے دیکھا کہ محمد دین گوجر آ گیا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اب اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے گا۔ اس نے محمد دین سے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا کہ یہ اس کے گھر بطور مہمان نہیں آیا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ محمد دین سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بوٹا گوجر اس کا واقف کار ضرور ہے لیکن اس سے ملے ایک سال ہو گیا ہے۔

میں نے بوٹا گوجر کو کہا کہ وہ سچ سچ بتا دے کیونکہ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ جو مہمان اس کے گھر آیا تھا اس نے موٹے نگوں والی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ یہ اشارہ ملتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جان گیا کہ ان کو پتہ چل چکا ہے۔ ''میں علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کو اپنے قریب بٹھا لیا باقی لوگوں کو علیحدہ چلے جانے کو کہا۔

اس نے انکشاف کیا کہ محمد حسین نامی شخص اس کو گزشتہ سال موضع جھکڑ کے میلہ میں ملا تھا جو گوجر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اس کا گھر جڑانوالہ جیوٹ ملز کے قریب ہے۔ باتوں باتوں میں اس کے ساتھ آشنائی ہو گئی۔ اس نے بتلایا کہ وہ ڈنگروں کا بیوپار کرتا ہے۔ دو مہینے ہوئے ہیں کہ یہ اس کو ملنے کیلئے جڑانوالہ گیا تھا۔ اس کے پاس ایک رات گزار کر واپس آ گیا تھا۔ تقریباً تین ہفتے ہوئے ہیں کہ محمد حسین اسے ملنے کیلئے اس کے گھر آیا۔ شام کا کھانا وغیرہ کھلایا۔ باتوں باتوں میں محمد حسین نے بتلایا کہ وہ جھنگ سے ڈنگر خریدنے جا رہا ہے۔ خیال آیا کہ راستہ میں آپ سے بھی ملتا جاؤں۔ یہ سن کر اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ یہ ڈنگروں کا بیوپار کرتا ہے اور ڈنگر خریدنے جا رہا ہے اس کے پاس کافی رقم ہو گی۔ اس نے بیوی کو کہا کہ محمد حسین کیلئے چائے بناؤ وہ ابھی آتا ہے۔ وہ اپنے دوست امانتی جٹ کے پاس گیا اور اس کے ساتھ محمد حسین کو ٹھکانے لگا کر رقم لینے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس کو ساتھ لے کر اپنے گھر آیا۔ چائے تیار ہو چکی تھی۔ تینوں نے مل کر چائے پی۔ پھر محمد حسین کو کہا کہ چلیں یار ڈیرہ پر ڈنگروں کے پاس سوتے ہیں۔ یہ تینوں دس بجے رات کے قریب گاؤں سے اپنے ڈیرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے اور امانتی جٹ نے محمد حسین کو پکڑ کر سرسوں کی فصل میں گرا لیا۔ چادر سے اس کے

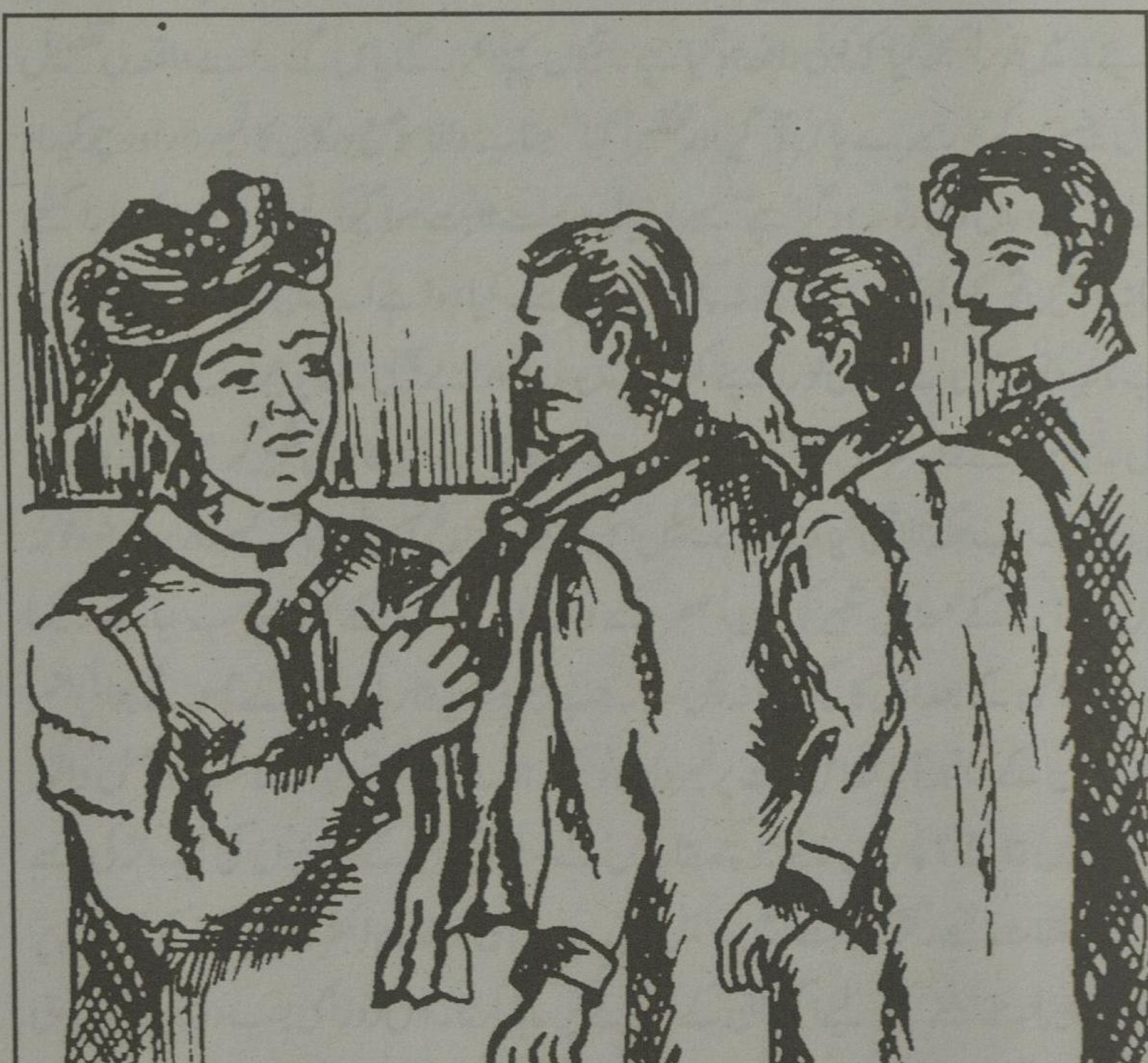
گلے میں پھندا ڈال کر زور سے کھینچ کر اسے پھاہ دے کر قتل کر دیا۔ جیب سے بارہ ہزار روپے نکلے۔ ٹوکہ کے ساتھ گردن کاٹ کر اس کا سر علیحدہ کر دیا جو کنویں میں پھینک دیا۔ محمد حسین نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں موٹے نگ والی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس خوف سے کہ ان انگوٹھیوں سے اس کی شناخت نہ ہو جائے اس کے ہاتھوں سے انگوٹھیاں اتار لیں تھیں۔ اندھیرے میں جلدی انگوٹھیاں اتارتے ہوئے ہمیں علم نہ ہو سکا کہ اس کی کوئی انگوٹھی گر گئی ہے۔ بوٹا گوجر کا بیان قلمبند کیا۔

اس کے بعد امانتی جٹ کا پتہ کروایا تو معلوم ہوا کہ صبح جس وقت بوٹا گوجر آیا تھا اس وقت سے وہ اپنے گھر سے غائب ہے۔ اس کے عزیزوں پر نمبردار کے ذریعے دباؤ ڈالا جس پر شام کو نمبردار نے امانتی جٹ کو تلاش کر کے ہمارے پیش کر دیا۔ اس نے پوچھنے پر ابتداء میں کافی غلط بیانی کی لیکن بعد میں سچ بتانے پر اس نے بوٹا گوجر کی کہانی کی حرف بحرف تائید کی۔ میں نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ دوسرے روز بوٹا گوجر کی نشاندہی پر محمد حسین مقتول کے ورثاء کو اطلاع دی۔ وہ بھی پہنچ گئے۔ محمد حسین کی والدہ اور بھائی نے اس کے خاکی رنگ کے کپڑے، انگوٹھی اور تعویذ شناخت کر لیے۔ محمد حسین مقتول کی والدہ نے یہ چیزیں دیکھتے ہی سر پیٹنا شروع کر دیا۔ اور بین کرنے لگی کہ ہائے یہ چیزیں اس کے بیٹے محمد حسین کی ہیں۔ اس طرح یہ عقدہ حل ہو گیا۔

موقع سے جو بال ملے تھے ان کا پارسل تیار کیا تھا۔ بوٹا گوجر اور امانتی جٹ کے سر کے بالوں کے نمونے لے کر لیبارٹری میں تجزیہ کروایا گیا تو موقع سے دستیاب شدہ بالوں کی مطابقت بوٹا گوجر کے بالوں کے ساتھ ہو گئی۔

اور اس کے علاوہ دیگر مکمل ثبوت فراہم کر کے تفتیش کی تکمیل کی اور چالان عدالت میں بھجوایا۔ جب اس کی اطلاع ملک غلام اصغر ایس ایس پی فیصل آباد کو بھجوائی تو انہوں نے مجھے طلب کر کے شاباش دی اور میری تعیناتی بطور ایس ایچ او تھانہ گوجرہ کر دی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

سفید خون



1976ء

گوجرہ آج کل تحصیل ہیڈکوارٹر ہے۔ 1976ء میں یہ ضلع فیصل آباد کی حدود میں واقع تھا لیکن جب ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ضلع کا درجہ حاصل ہوا تو یہ اس کا حصہ بن گیا۔ یہاں خوردنی اجناس کی ایک بہت بڑی منڈی بھی ہے جس کی وجہ سے اسے ملک گیر شہرت حاصل ہے۔

یہ 1976ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں تھانہ گوجرہ میں بطور انچارج تعینات تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ میں معمول کے مطابق اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ جس جگہ دفتر تھا وہاں سے تھانے میں ہر آنے جانے والے کو باآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ تین بجے کا وقت ہوگا کہ موضع ورکاں کا نمبر دار اور چوکیدار جن کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا، تھانہ کی حدود میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔ تینوں پہلے محرر کے پاس گئے۔ اسے واقعہ کی تفصیل بتائی جسے سن کر محرر میرے پاس آ گیا اور مختصراً کہا ''جناب والا موضع ورکاں کا نمبر دار اور چوکیدار آئے ہیں وہاں کوئی وقوعہ ہو گیا ہے''۔ میرا خیال درست ثابت ہوا کیونکہ نمبر دار اور چوکیدار اکٹھے تھانہ آئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے اب میں یہی جاننے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلایا اور بے چینی سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لائے ہیں۔ نمبر دار نے بتانا شروع کیا ''یہ جو لڑکا ہمارے ساتھ آیا ہے اس کا بھائی شبیر گزشتہ تین روز سے لاپتہ ہے۔ سب جگہ تلاش کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا''۔ نمبر دار نے جو وقوعہ بیان کیا اس کے مطابق شبیر کو تقریباً عصر کے وقت اپنے ڈیرہ کے غربی جانب جاتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جب نمبر دار یہ بتا رہا تھا شبیر کے چھوٹے بھائی منیر نے جو ان کے ساتھ آیا تھا اس بات پر نمبر دار کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ تھانیدار صاحب کو اصل واقعہ کیوں نہیں بتاتے؟ پھر اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق شبیر کے آرائیوں کی ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات تھے۔ لڑکی بہت حسین و جمیل تھی۔ دونوں کی ملاقات اکثر آرائیوں کے ڈیرے پر ہوتی۔ شبیر اسے ملنے کے لیے اکثر ان کے ڈیرے پر جایا کرتا۔ اس روز بھی جب دوپہر ڈھل رہی تھی وہ ان کے ڈیرے کی طرف گیا اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ منیر نے شبہ ظاہر کیا کہ ارائیوں نے اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ منیر کے علاوہ نمبر دار اور چوکیدار کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن میں

پولیس افسر کی حیثیت سے واقعات کو کسی اور طرح دیکھ رہا تھا۔ جب منیر نے مجھے یہ کہانی سنائی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے ایک جھوٹی کہانی سنا رہا ہے۔ یہ اندازہ میں نے اس کی حرکات وسکنات اوراس کے چہرے کے ایک مخصوص تاثر سے لگایا۔ کسی بھی کامیاب تفتیش کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ آپ واقعات کے پہلو کا بغور جائزہ لیں اور اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری معلومات حاصل کریں۔ اسی لیے میں نے پہلے شبیر کی بیوی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں اس کے پاس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود روتے ہوئے تھانے پہنچ گئی اور آہ وزاری کرنے لگی۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ اس کا خاوند گزشتہ تین روز سے لاپتہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ منیر نے مجھے جو کہانی سنائی تھی جب میں نے اسے دہرایا اور اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”نہیں جناب شبیر ایسا نہیں ہے۔ بڑا بھلا مانس اور چنگا ہے۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کرسکتا“۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے اسے صحیح حالات کا علم نہ ہو۔ تاہم میں نے اس کے بیان پر مقدمہ درج کرلیا۔ منیر کو میں نے جان بوجھ کر مقدمے سے دور رکھا اور تفتیش کیلئے موضع ورکاں کی جانب روانہ ہوگیا۔

میرے ساتھ اللہ بخش اے ایس آئی اور کچھ دوسرے ملازمین بھی تھے۔ میں نے نمبردار چوکیدار اور منیر کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل ہم ان کے ڈیرہ پر پہنچے۔ یہ ڈیرہ ڈنگروں کیلئے مخصوص تھا اور گاؤں سے مغرب کی جانب تقریباً ایک مربع کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں میں ان دونوں بھائیوں کی خاصی اراضی تھی۔ والد فوت ہوچکا تھا والدہ حیات تھی۔ ان کا کوئی اور بہن بھائی نہ تھا۔ شبیر کی تین چار ماہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی خوبصورت اور اچھے چال چلن کی مالک تھی۔ منیر ابھی کنوارہ تھا۔ ان کی اراضی زرخیز اور گاؤں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کافی قیمتی تھی۔ ڈیرہ پر مویشیوں کی تعداد بھی خاصی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مالدار زمیندار ہیں۔ مجھے یہاں ان کے دو ملازم بھی نظر آئے۔ ایک کا نام دینا اور دوسرے کا گامی تھا۔

میں نے یہاں آکر سب سے پہلے شبیر کے متعلق معلومات اکٹھی کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ شبیر سارا دن فارغ رہتا ہے۔ کام کاج سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ کاشتکاری کا سارا کام چھوٹے بھائی منیر نے سنبھال رکھا ہے۔ وہی اپنے ملازمین کے ساتھ مل کر زمینداری کرتا ہے اور مویشیوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے ہے۔ شبیر کے متعلق مزید معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھار ہی ڈیرہ پر آتا، کچھ دیر قیام کرتا، چھوٹے بھائی اور ملازمین کو ضروری ہدایات دیتا اور پھر واپس گاؤں چلا جاتا ہے۔

وہ سارا دن ادھر ادھر گھوم پھر کر گزارتا ہے۔ میں نے اس کے چال چلن کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ لیکن سب لوگوں نے اس کی تعریف کی۔ منیر کے سوا مجھے کسی طرف سے بھی کوئی ایسا اشارہ نہ ملا جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کے آرائیوں کی کسی لڑکی سے ناجائز تعلقات تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر منیر مجھے کیوں غلط راستے پر ڈالنا چاہتا ہے۔ میرا ذہن آرائیوں کی طرف بھی گھوم رہا تھا۔ تفتیش سے پہلے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہاں ایک بات بتا تا چلوں کہ میں دوران تفتیش تشدد کا قائل نہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات ملزم تشدد کے خوف سے اقرار جرم تو کر لیتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تفتیشی افسر باتوں باتوں میں ملزم پر حاوی ہو جائے اور ہر سمت سے اسے باتوں میں گھیر کر جھوٹا ثابت کرے تو وہ سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تفتیشی افسر کی ذہانت اور قوت مشاہدہ جتنی تیز ہوگی اتنا ہی جلد وہ کیس کی تہہ تک پہنچ پائے گا۔ میرا شروع سے اصول رہا ہے کہ میں کسی بھی ملزم یا مشتبہ شخص کی ہر حرکت کو نہ صرف نوٹ کرتا ہوں بلکہ نفسیاتی طور پر اس کا باریک بینی سے جائزہ بھی لیتا رہتا ہوں۔ اور باتوں باتوں میں اسے جھوٹا ثابت کر کے اس کے گرد گھیرا تنگ کر لیتا ہوں۔ وہ غیر ارادی طور پر مختلف حرکتیں شروع کر دیتا ہے مثلاً وہ مصنوعی جمائی لیتا ہے، اپنے کان کو کھجاتا ہے اور بعض اوقات وہ Over Acting بھی شروع کر دیتا ہے۔ یہ تفتیشی افسر کی اہلیت، ذہانت اور حاضر دماغی پر منحصر ہے کہ وہ کسی ملزم یا مشتبہ شخص کی ان حرکات کو کس طرح نوٹ کرتا ہے اور موقع کی مطابقت کے تحت کس طرح سوال کرتا ہے۔ بہر حال انٹیروگیشن ایک علیحدہ مضمون ہے اور ایک فن ہے۔

اس وقت بات ہو رہی تھی شبیر کی۔ ہم نے اس کی اچانک گمشدگی کے معمے کو حل کرنا تھا۔ میں نے تفتیش کا آغاز ان کے ڈیرے سے ہی کیا۔ میں نے منیر سے کہا کہ میں سب سے پہلے اس جگہ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں اس نے اپنے بھائی کو آخری بار دیکھا تھا۔ میں منیر کی نشاندہی پر اس جگہ گیا۔ جگہ کا معائنہ کرنے پر پتہ چلا کہ وہاں پر کسی شخص کے قدموں کے نشان ہیں جو ظاہر کر رہے تھے کہ کوئی شخص وہاں سے گزرا ہے۔ قریب ہی پانی کا کھال تھا۔ میں نے نشانات کو غور سے دیکھا اور ان پر چلتا آیا۔ نشان ان کے اپنے ڈیرے کی بیرونی دیوار تک آ کر ختم ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص اسی ڈیرہ پر آیا تھا۔ قدموں کے نشانات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دو تین روز پرانے ہیں۔ اب اس بات کو بھی تقویت ملتی تھی کہ شبیر پانی کے کھال تک گیا اور پھر واپس ڈیرے پر

آ گیا، اس کے بعد کہاں گیا۔ اس بات کا سراغ مجھے لگانا تھا۔ اس وقت منیر کے انداز اور تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ وہ افسردہ اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اسے لے کر واپس ڈیرہ پر آ گیا۔ میرا رخ ایک کمرہ کی جانب تھا۔ کمرہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اسے بیٹھک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سا کمرہ تھا۔ دو تین چار پائیاں اور دیگر چند اشیاء بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ اسی دوران چوکیدار میرے لیے کرسی لے آیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ منیر سے کہا وہ چار پائی پر بیٹھ جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ چار پائی پر بیٹھنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس موقع پر میں نے بڑے پیار سے اُسے کہا کہ وہ اطمینان سے چار پائی پر بیٹھ جائے اور مجھے دوبارہ ساری بات بتائے۔ اس نے پھر وہی کہانی سنانا شروع کی جو وہ اس سے پہلے مجھے سنا چکا تھا۔ میں نے سوال کیا کہ اس کا بھائی شبیر کس راستے سے آرائیوں کے ڈیرے کی طرف گیا تھا کیونکہ پیروں کے نشان تو مذکورہ مقام سے واپس ڈیرے کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ واپس ڈیرہ کی جانب آیا تھا۔ تم کیسے کہتے ہو کہ وہ آرائیوں کے ڈیرے کی طرف گیا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ ڈیرہ پر آنے کے بعد واپس آرائیوں کے ڈیرے کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ کون سے راستہ پر گیا تھا تو اس نے کہا کہ یہاں سے سیدھا وہ سامنے والے کھیتوں سے ہوتا ہوا ان کے ڈیرے کی طرف گیا تھا۔ اس سمت خالی زمین تھی۔ میں نے اس جگہ کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن بغور دیکھنے پر بھی مجھے کوئی ایسا نشان نہ ملا جو ظاہر کرتا کہ شبیر یہاں سے گزرا ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ منیر جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے جب منیر کو گہری نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ پریشان ہو گیا اور کہنے لگا "تھانیدار صاحب! مجھے کافی پیاس لگی ہے۔ اگر اجازت دیں تو میں پانی پی آؤں"؟ میں نے اس کو اجازت نہ دی اور کہا کہ میں پانی ادھر ہی منگوا دیتا ہوں۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ وہ منیر کیلئے پانی لے آئے۔ جب وہ پانی پی چکا تو میں نے اے ایس آئی اللہ بخش کو ہدایت کی کہ وہ منیر کو اپنے پاس بٹھا کر اس کا مفصل بیان تحریر کرے اور اس کو علیحدگی میں یہ بھی سمجھایا کہ اس کی کڑی نگرانی کرنی ہے۔ اور اس کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دینا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

میں نے انہیں ایک دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اب میں نے ان کے ملازم دینا کو اپنے پاس بلایا۔ دریافت کرنے پر دینا نے بتایا کہ پرسوں گیارہ بجے دن وہ بمعہ منیر اور گامی مویشیوں کے لئے چارا کتر رہا تھا کہ شبیر گاؤں کی طرف سے آیا اور ایک بیل کے متعلق پوچھنے لگا کہ اسے کس

نے زخمی کیا ہے۔منیر نے جواب دیا کہ دونوں بیل آپس میں لڑ پڑے تھے اس لیے وہ زخمی ہو گیا۔لیکن شبیر نے اس کی بات نہ مانی اس پر دونوں کے مابین سخت تلخ کلامی ہوئی۔دونوں بھائی آپس میں لڑ پڑے تھے۔میں نے اور گامی نے انہیں چھڑایا۔بعد میں شبیر گالیاں دیتا ہوا گاؤں کی طرف چلا گیا۔اس مرحلہ پر میں نے اسے کہا کہ شبیر تو پانی کے کھال کی طرف گیا تھا اور پھر واپس ڈیرہ پر آیا تھا تم کیوں غلط بیانی کر رہے ہو۔میں نے تفتیش کے نقطہ نگاہ سے اس پر مختلف سوالات کیے اور ساتھ ساتھ اس کی Face Reading بھی کرتا رہا۔میں کافی پر امید ہو گیا کہ انشاء اللہ یہ معمہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔میں نے دینا کو بھی ایک الگ کمرے میں بھیج دیا۔اب گامی کی باری تھی۔میں نے اس سے بھی پوچھ گچھ شروع کی۔اس کے بیان میں بھی کافی تضاد تھا۔وہ بھی کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔

تفتیش سے پہلے میں نے منیر، دینا اور گامی کو الگ الگ کر دیا تھا اور کچھ ملازمین ان کی نگرانی پر لگا دیئے تھے۔وہ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ایک دوسرے کی بات نہیں سن سکتے تھے اور نہ ہی نقل و حرکت نوٹ کر سکتے تھے۔میں رات بھر تینوں سے باری باری تفتیش کرتا رہا اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کیلئے ان سے سوال جواب کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں دوران تفتیش تشدد کا قائل نہیں اس لیے میں نے تشدد اور جبر کے بغیر اپنی تفتیش جاری رکھی۔ساری رات اسی طرح گزر گئی دن چڑھ آیا۔مجھے یقین ہو گیا کہ شبیر کا قتل ان تینوں کے اندر ہے اور اب صرف ان کے منہ سے اگلوانا باقی ہے۔میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ان تینوں نے شبیر کو قتل کیا ہے تو لاش بھی ڈیرہ میں ہی کہیں ہو گی۔چنانچہ میں اٹھا اور ڈیرے کا مکمل طور پر جائزہ لینے لگا۔جس ڈیوڑھی میں چارا کترنے والی مشین لگی تھی اس سے ملحقہ کمرے میں مویشی بندھے ہوئے تھے۔میرا دل کہہ رہا تھا کہ نعش اس ڈیرے کے اندر کہیں دفن ہے۔میں مکمل جائزہ لے کر پھر بیٹھک میں آ گیا اور ملازمین کو کہا کہ گامی کو میرے پاس لائیں۔ان میں گامی مجھے کچا لگ رہا تھا۔میرا اندازہ تھا کہ یہ جلدی بریک ہو جائے گا۔جب گامی آیا تو میں نے ملازمین کو باہر نکال دیا۔میرا طریقہ کار بھی اس طرح ہے کہ میں بالکل تنہائی میں مشتبہ شخص سے انٹیروگیشن کرتا ہوں۔میں نے گامی کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا ''پتر! اب تو ساری بات کا پتہ چل گیا ہے۔تم بڑے پکے بنے ہوئے ہو۔تمہارے ساتھیوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔اب وقت ہے سچ سچ بتا دو، ورنہ مقدمے کا تمام بوجھ تم پر ڈال دوں گا۔'' جب میں نے اسے کہا کہ تمہارے ساتھیوں نے سب

کچھ بتا دیا ہے تو اسے یقین ہو گیا کہ تھانیدار کو ہر بات کا علم ہو چکا ہے۔ ویسے بھی جب میں ڈیرہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ گامی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے سمجھا کہ اس کے ساتھی مجھے سب کچھ بتا چکے ہیں۔ اور جہاں لاش دفن کی ہے وہ جگہ بھی انہوں نے تھانیدار کو بتا دی ہے۔ یہ بات پہلے سے اس کے ذہن میں آ چکی تھی۔ اب اس کے پاس سوائے سچ بتانے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے پہلے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص تو اس کے نزدیک نہیں ہے۔ ویسے بھی انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی راز کی بات کسی سے کرنے لگے تو وہ دائیں بائیں ضرور دیکھتا ہے چاہے اس کے نزدیک کوئی بھی نہ ہو۔ اس نے کہنا شروع کیا ''تھانیدار صاحب! آپ وعدہ کریں کہ آپ میرے ساتھ رعایت کریں گے اور ماریں گے نہیں''۔ میں نے انتہائی مشفقانہ انداز میں اسے اعتماد میں لے کر یقین دلایا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس نے مجھے ایک دلچسپ اور لرزہ خیز کہانی سنائی۔ اس کہانی کا خلاصہ آپ بھی سن لیجئے۔

''شبیر کے چھوٹے بھائی کا معاشقہ گاؤں کی ایک الہڑ دوشیزہ سے چل رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے اور بے حد پیار کرتے تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ ان کی آپس میں شادی ہو جائے۔ منیر چونکہ زیادہ وقت اپنے ڈیرہ پر رہتا اس لیے دینا اور گامی سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ ان سے پیغام رسانی کا بھی کام لیتا۔ دینا اور گامی اکثر منیر کا پیغام لے کر اس کی محبوبہ کے پاس جاتے اور انہی کے ذریعے وہ ڈیرہ پر اس لڑکی سے میل ملاقات کرتا۔ وہ دونوں اس کے گہرے ہمراز تھے۔ اسی لیے منیر ان کی بہت قدر کرتا اور ہر طرح کا خیال رکھتا۔ دینا اور گامی شبیر کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ بہت غصیلا اور بدزبان تھا۔ جب بھی ڈیرے پر آتا دینا اور گامی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور گالیاں وغیرہ دیتا۔ اس لیے وہ دونوں شبیر کے بے حد خلاف تھے اور دن بدن ان کے دل میں شبیر کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اکثر منیر کے کان بھرتے اور کہتے کہ شبیر ایک تو کوئی کام کاج نہیں کرتا اوپر سے تمہیں اور ہمیں گالیاں دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے تمہاری گاؤں میں کوئی عزت نہیں ہے۔ تم تو نوکروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہو۔

قدرتی امر تھا کہ منیر کے دل میں بھی اپنے بھائی کے خلاف دن بدن نفرت پیدا ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن منیر نے کھل کر اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ یا تو اپنے حصے کی زمین اور مویشی علیٰحدہ کر لو یا پھر میرے ساتھ برابر کا کام کرو۔ یہ بات شبیر کو سخت ناگوار گزری۔ اس نے منیر کو خوب ڈانٹا بلکہ سخت غصے میں آ کر اس کے منہ پر تھپڑ بھی مار دیا کہ تم کون ہوتے ہو ایسی

باتیں کرنے والے۔ یہ واقعہ منیر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔اس کے دل میں اپنے بڑے بھائی کے لئے نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔

جب دینا اور گامی نے دیکھا کہ منیر اپنے بڑے بھائی سے سخت نفرت کرنے لگا ہے تو انہوں نے موقع غنیمت جان کر منیر کو کہا کہ وہ دونوں اس کے وفادار ہیں، اس کے ذرا سے اشارے پر اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر شبیر راستے سے ہٹ جائے تو نہ صرف تم ساری جائیدار کے مالک بن سکتے ہو بلکہ اپنی محبوبہ کو بھی ہمیشہ کیلئے اپنا سکتے ہو۔

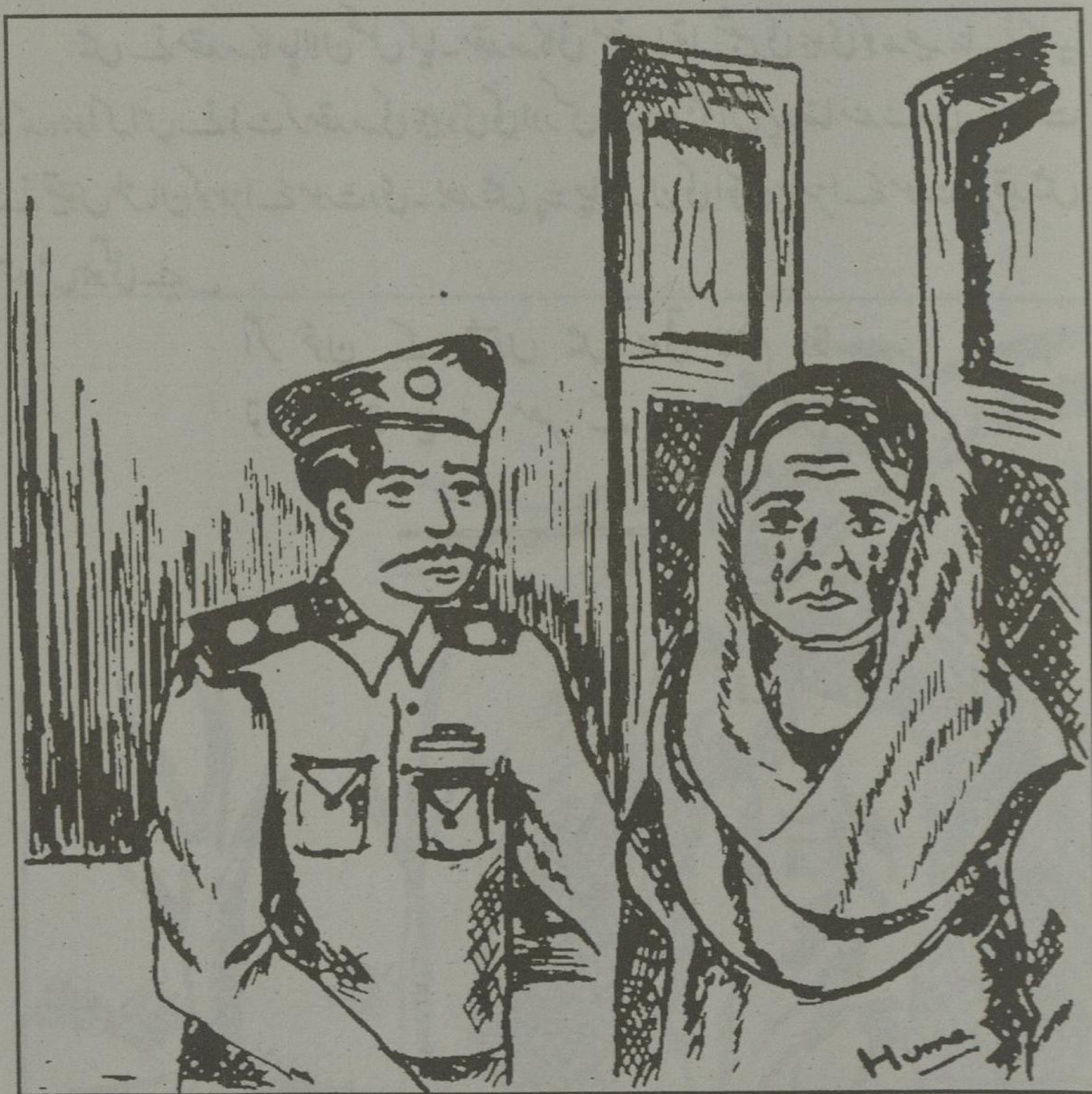
دینا اور گامی کی باتیں سن کر منیر لالچ میں آ گیا۔اس نے ان دونوں سے کہا کہ اس کام کو اس قدر جلدی اور عمدہ طریقہ سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو۔چنانچہ وہ تینوں موقع کی تاک میں رہنے لگے۔ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شبیر کا بیل کے معاملے پر اپنے بھائی سے جھگڑا ہو گیا۔اس نے نہ صرف منیر کو سخت برا بھلا کہا بلکہ منیر کو ایک تھپڑ بھی مار دیا۔اس کے بعد وہ اسے غلیظ گالیاں دیتا ہوا ڈیرہ سے باہر چلا گیا۔ڈیرہ سے غربی جانب کچھ فاصلہ پر اس نے رفع حاجت کی۔نزدیکی پانی کے کھال سے ہاتھ دھوئے اور پھر واپس ڈیرہ کی طرف چل پڑا۔اس دوران منیر نے دینا اور گامی کے ساتھ مل کر فیصلہ کر لیا کہ وہ آج شبیر کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں گے۔جب شبیر ڈیرہ پر آیا تو گامی نے کہا ”بھائی شبیر! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔آپ کمرہ میں آ جائیں۔“ جب وہ ڈیوڑھی میں آیا تو اچانک تینوں نے اسے قابو کر لیا اور مفلر کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔جب وہ مر گیا تو اس کی نعش چارہ کے نیچے چھپا دی۔شام کو دونوں نوکر ڈیرہ پر رہے اور منیر ان کی روٹی لینے گھر چلا گیا۔ماں نے پوچھا کہ منیر بیٹے! تمہارا بڑا بھائی اب تک گھر کیوں نہیں آیا تو اس نے کہا کہ شاید وہ بہن کو ملنے اس کے گاؤں نہ چلا گیا ہو۔ماں بے چاری کو کیا خبر تھی کہ اس کا بیٹا اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔

گامی نے مزید کہا کہ وہ اس جگہ کی نشاندہی کرنے کو تیار ہے جہاں لاش دفن ہے۔اور مزید انکشاف یہ کیا کہ جس مفلر سے انہوں نے شبیر کو ہلاک کیا وہ بیٹھک کی چھت پر موجود ہے۔اب میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔رات بھر کی محنت کے بعد میں کامیاب ہو چکا تھا۔میں نے ملازمین کو کہا اب دینا کو لاؤ۔گامی کو میں نے باہر بھجوا دیا۔دینا آیا تو میں نے دینا کو اسی طرح کہا کہ تمہارے ساتھیوں نے سچ سچ بتا دیا ہے۔تم بھی مجھے صحیح بات بتا دو وہ قدرے پختہ کار تھا۔اس نے کہا کہ جی اگر انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے، تو یہ کام انہوں نے ہی کیا ہوگا، مجھے تو کچھ علم نہیں

ہے۔ میں نے سوچا کہ اب اس کے ساتھ زیادہ مغز کھپانے کی ضرورت نہیں، کیوں نہ اس کو تھوڑا سا لقمہ دے کر بات اگلوائی جائے۔ میں نے اسے کہا کہ جس مفلر سے تم نے شبیر کو قتل کیا ہے وہ تو اس بیٹھک کی چھت پر موجود ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا ہمیں چھت پر جانا چاہیے؟ اس پر اس نے اپنا کان کھجانا شروع کر دیا۔ میں تاڑ گیا کہ وہ اب بریک ہونے والا ہے۔ میں نے اس پر مزید دباؤ ڈالا تو اس نے کہا کہ گامی نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے؟ میں نے کہا ''ہاں''۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ''تھانیدار صاحب منیر نے بھی کچھ بتایا ہے''۔ میں نے کہا کہ اس نے تو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر کہنے لگا ''جی انہوں نے کیا بتایا ہے''؟ میں نے کہا کہ جس طرح تم نے کیا ہے۔ اس نے سوال کیا ''جی! وہ کیا بتاتے ہیں۔ شبیر کو پھندا کس نے دیا؟'' میں نے کہا وہ کہتے ہیں پھندا دینا نے لگایا ہے۔ اس پر وہ بری طرح لرزنے لگا ''نہیں صاحب جی! وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے شبیر کے بازو پکڑے تھے۔ پھندا گامی اور منیر نے لگایا تھا''۔ اس کے بعد اس نے از خود سارا واقعہ سنا دیا۔

اسے بھی ایک طرف بھیج کر اب میں نے مقتول شبیر کے بھائی منیر کو بلایا۔ میں نے اسے کہا ''او ظالم انسان! تو نے اپنے بھائی کو نوکروں سے قتل کرا دیا۔ تو کتنا بدبخت ہے''۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی لعنت برس رہی تھی۔ اس کو احساس ہو گیا کہ اب حقیقت سامنے آ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کہہ رہا تھا ''جائیداد کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔ اگر دینا اور گامی مجھے نہ ورغلاتے تو شاید مجھ سے یہ جرم سرزد نہ ہوتا۔ میں لالچ اور عشق میں اندھا ہو گیا۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا۔ میں نے یہ تک نہ سوچا کہ میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے بھائی کو قتل کر رہا ہوں۔ اب گاؤں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اپنی ماں اور بیوہ بھابی کو کیا جواب دوں گا''؟ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں نے گاؤں کے نمبردار اور چند دیگر معززین کو بلوایا۔ تینوں نے ان کی موجودگی میں اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ بعد ازاں میں نے میڈیکل آفیسر سول ہسپتال گوجرہ اور علاقہ مجسٹریٹ کو بذریعہ درخواست موقع پر بلوایا۔ تینوں ملزمان نے ان کی اور معززین علاقہ کی موجودگی میں اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں انہوں نے لاش دفن کی تھی۔ جگہ کھدوائی گئی۔ اندر سے شبیر کی لاش برآمد ہوئی۔ شبیر کی والدہ اور اس کی جوان بیوہ بھی بین کرتی ہوئی موقع پر آ گئیں۔ ماں روتے ہوئے کہنے لگی ''ایک پتر قتل ہو گیا دوسرا پھانسی چڑھ جائے گا۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی''۔ شبیر کی جوان


Huma

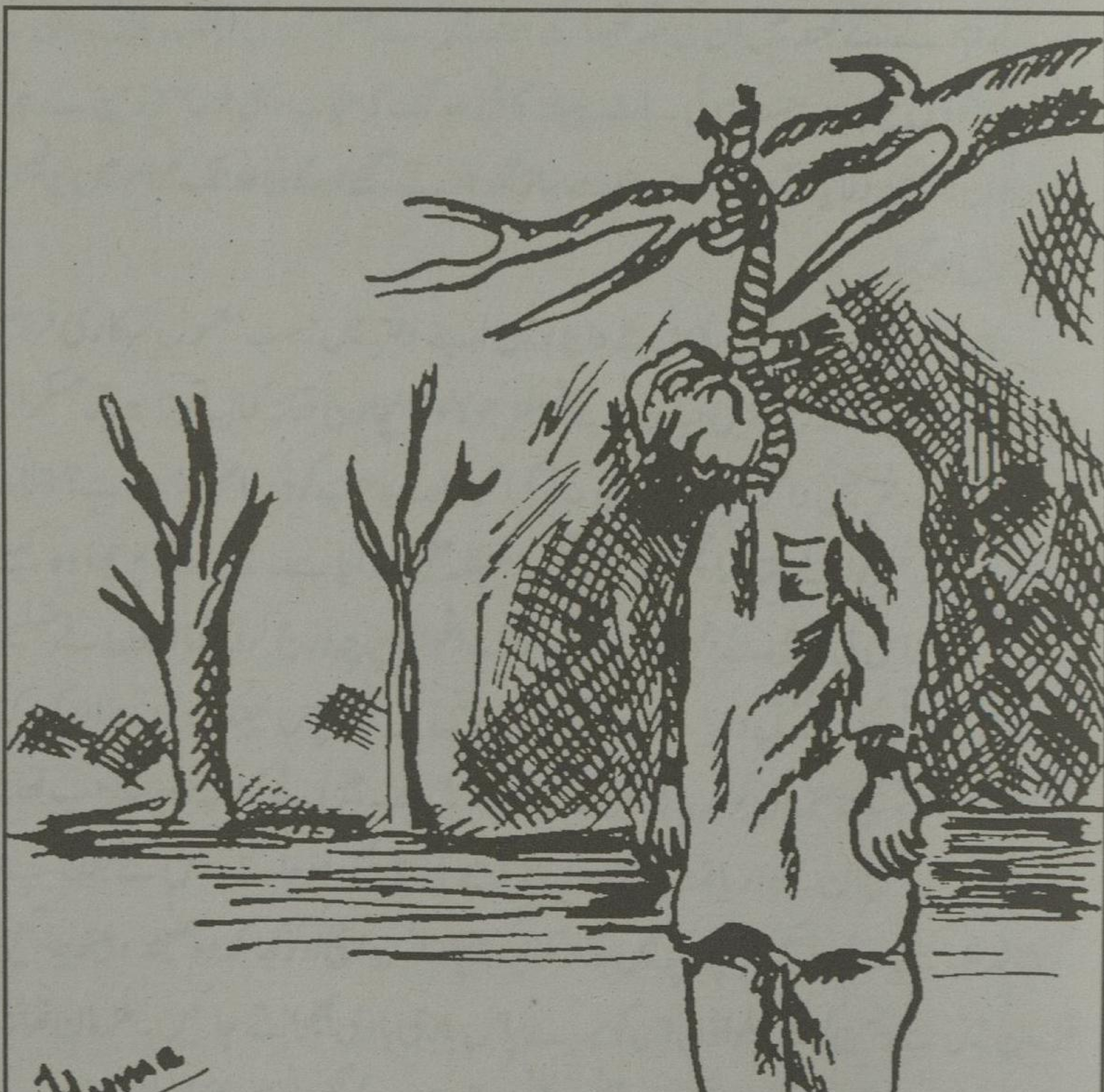
بیوہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی'' ظالموں نے میرا سہاگ اجاڑ دیا۔اب میں کس کے سہارے جیوں گی''؟اس کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔اسے دیکھ کر ہر آنکھ پرنم تھی۔میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

نعش کا موقع پر پوسٹ مارٹم ہوا۔بعدازاں اسے تجہیز و تکفین کیلئے اس کی والدہ کے سپرد کر دیا گیا۔

میں نے مقدمہ کا چالان مکمل کیا۔مقدمہ کافی مضبوط تھا۔شبیر کی بیوی کو مدعیہ بنانے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس نے ڈٹ کر مقدمہ کی پیروی کی اور کسی قیمت پر بھی صلح پر رضامند نہ ہوئی۔عدالت نے تینوں ملزمان کو سزائے موت دی۔بعد میں پتہ چلا کہ ان کی اپیل پر سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اگر خون کے رشتوں میں ہوتی لازم وفا
تو نہ بکتے یوسف مصر کے بازاروں میں

جنگل میں پھانسی



1978ء

قصبہ کمالیہ 1978ء میں ضلع فیصل آباد کی سب تحصیل تھی اور آج کل ضلعی تقسیم کی وجہ سے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کا تحصیل ہیڈکوارٹر ہے۔ چیچہ وطنی ٹوبہ ٹیک سنگھ روڈ پر واقع ہے اور انتہائی اہم قصبہ ہے۔ اس قصبہ کے باسیوں میں کھرل، راجپوت اور گوجر اقوام قابل ذکر ہیں۔

اکثریت کے دلوں میں پولیس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو چکی تھی اور ماحول میں انتہائی کشیدگی تھی۔ یہ سب کچھ مشہور کمالیہ نکیل کیس کا نتیجہ تھا جس میں عوام کو شکایت تھی کہ پولیس اور علاقہ کے مجسٹریٹ نے ایک شخص کو ناک میں نکیل ڈال کر شہر میں پھرایا ہے۔ سب ڈویژنل پولیس افسر کے تبادلے کے بعد میں ان کی جگہ تعینات ہوا۔ میں نے معززین کی میٹنگ بلائی۔ ان سے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوئی۔ بات چیت کافی حد تک کامیاب رہی اور معززین نے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ آہستہ آہستہ حالات سازگار ہوتے گئے اور کافی حد تک عوام میں پولیس کا اعتماد بحال ہو گیا۔

مارچ 1978ء میں تقریباً 10 بجے دن، میں اپنے دفتر میں حسب معمول سرکاری فرائض سرانجام دے رہا تھا کہ راجہ مزمل حیات سب انسپکٹر جو بطور انچارج تھانہ کمالیہ تعینات تھا مسکراتے ہوئے میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ میں نے کہا کہ راجہ صاحب کوئی خاص بات ہے؟ بتلانے لگے کہ موضع جھگڑ والے ستار ماچھی کی گمشدگی کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے تو بتلانے لگے کہ اس کی بیوی نے جن ملزمان کے خلاف اغوا کا پرچہ درج کرایا تھا انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ اسے قتل کر کے نعش دریائے راوی میں چیچہ وطنی پل کے پاس پھینک دی ہے اور کہا کہ وہ نشاندہی کرانے کیلئے ملزمان کو دریا کی طرف لے جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ راجہ صاحب تھانے چلتے ہیں۔ میں بھی ان سے دریافت کر لیتا ہوں تا کہ میری تسلی بھی ہو جائے۔ اس کے بعد آپ ان کو نشاندہی کیلئے لے جائیں۔ چنانچہ میں تھانہ کمالیہ پہنچا۔ ایس ایچ او کو کہا کہ وہ علیحدہ بیٹھ جائیں۔ ملزمان میں سے جس کو میں بلواؤں اس کو میرے پاس باری باری بھجواتے جائیں۔ ملزمان تھانہ کی حوالات میں بند تھے۔ ان کو باہر نکلوایا اور علیحدہ علیحدہ ملازموں کی نگرانی میں بٹھا دیا۔

پہلا ملزم جس کو میرے سامنے پیش کیا گیا اس کا نام خانوں تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی

تھیں۔30/32 سال اس کی عمر تھی اور اس کے چہرہ پر غربت کے آثار نمایاں تھے۔ میرے سامنے آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ جناب مجھے نہ مارنا میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس طرح قتل کیا ہے۔ اس نے بتلایا کہ رقم کے لین دین پر اس کا ایک دن ستار سے جھگڑا ہوا تھا۔ ستار نے اس کو سوٹیوں سے زدوکوب کیا اور گالیاں دیں۔ اس کے دل میں رنج تھا۔ 4 یوم قبل ستار کو 10 بجے رات کے قریب گاؤں سے آدھ میل دور گاؤں کی طرف آتے دیکھا۔ میرے ساتھ میرا چچازاد بھائی میرو بھی تھا۔ ہم دونوں نے کلہاڑی سے اسے قتل کیا اور گدھی پر لاد کر چیچہ وطنی پل کے قریب دریا میں پھینک دیا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ اس پر سوالات کیے کہ پہلی ضرب کس نے ماری، گدھی پر کیسے لادا، گدھی کو آگے سے کس نے پکڑا اور نعش کو کس نے قابو کیا، دریا میں کس مقام پر پھینکا، راستہ میں کسی دیگر آدمی سے ٹکراؤ وغیرہ ہوا یا نہیں۔ مقتول نے اس وقت کپڑے کون سے پہن رکھے تھے۔ جب مقتول سے ملاقات ہوئی تو سب سے پہلے کیا بات ہوئی۔ مقتول کے جوتے موقع پر رہ گئے تھے یا ساتھ لے گئے تھے۔ مقتول نے جان بچانے کیلئے اگر تمہاری منت سماجت کی تو کیا الفاظ استعمال کیے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس کا تمام بیان نوٹ کرتا گیا۔ اس کے بعد میں نے میرو کو بلوایا۔ اس سے واقعہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ جناب بات تو کوئی نہیں ہے۔ غلطی ہوگئی ہے ستار کو قتل ہم دونوں نے ہی کیا تھا۔ آپ مہربانی کر کے ہمیں جلدی جلدی جیل بھجوادیں۔ میں نے اسے کہا کہ جس طرح تم نے قتل کیا ہے وہ سارا واقعہ سناؤ۔ اس نے جو واقعہ سنایا وہ بالکل اس طرح تھا جس طرح خانوں نے بتلایا تھا۔ لیکن جب میں نے اس پر سوالات کیے جو خانوں پر کیے تھے تو ان سوالات کے جوابات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ان دونوں کا ستار کے قتل سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے اور دونوں بے قصور ہیں۔ ان کی حالت سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ ان دونوں پر بے پناہ تشدد ہوا ہے اور وہ دونوں مارے خوف کے قتل جیسی سنگین واردات کو تسلیم کر رہے ہیں۔

میں نے اسے علیحدہ بٹھوا کر پھر خانوں کو بلوایا اور اسے پاس بٹھا کر تسلی دی کہ اب اسے کوئی مارے گا نہیں۔ وہ سچ سچ بتا دے تو اس نے کہا کہ جی اگر سچ بتا دیا تو پھر آپ ان کو تھانہ والوں کے حوالے کریں گے یا چھوڑ دیں گے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اب انہیں کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر وہ زاروقطار رونے لگا اور بتلایا کہ جناب تشدد کے خوف سے سب کچھ بتا رہے ہیں۔ ہم دونوں بے گناہ ہیں۔ ہمیں علم تک نہیں کہ ستار کہاں ہے۔ ہم

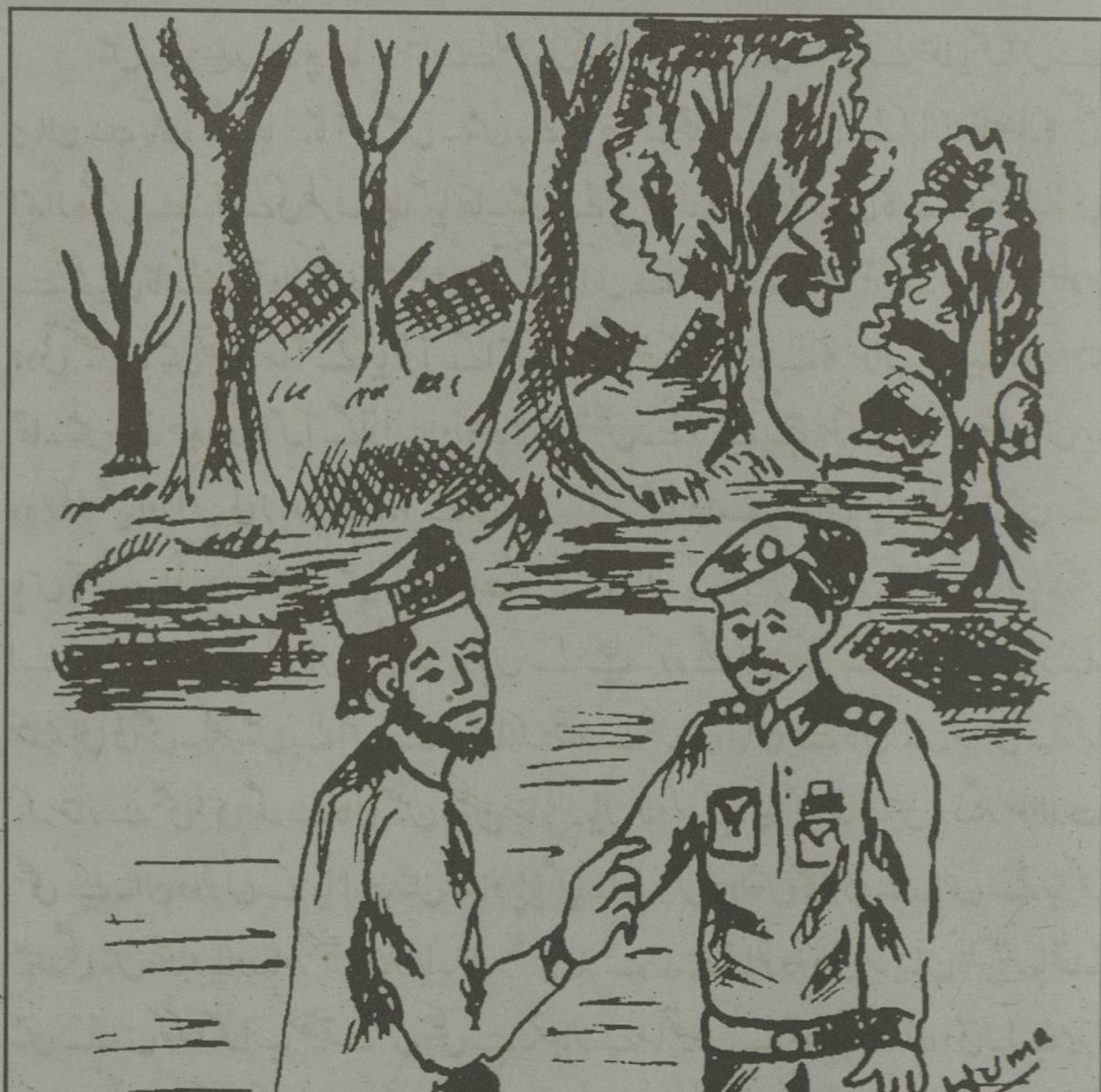
مسجد میں حلف دینے کو تیار ہیں۔اس کے بعد پھر دوسرے الزام علیہ میرو نے بھی میرے سمجھانے پر اصلیت بتادی۔ یہاں میں یہ بات واضح کردوں کہ جب پولیس نے ان پر تشدد کیا تو ان میں سے خانوں نے تشدد کی وجہ سے قتل تسلیم کرلیا۔اصل میں وہ بے گناہ تھا۔لیکن زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہ کرسکا۔اس نے پولیس کو ایک من گھڑت کہانی بنا کر بتلایا کہ ستار کو اس نے میرو کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔میرو تشدد برداشت کرتا رہا۔تفتیشی آفیسر نے ان کی روبرو بات کروائی۔ جب میرو نے دیکھا کہ خانوں مار کے خوف کی وجہ سے قتل تسلیم کررہا ہے تو اس نے سوچا کہ اب اسے زیادہ دیر مار پڑتی رہے گی اس سے بہتر ہے کہ وہ بھی قتل کرنا تسلیم کرے۔اس پر وہ بھی مان گیا۔تفتیشی آفیسر نے رہی سہی کسران کو انٹیروگیشن کے دوران لقمے دے دے کر پوری کردی اور مکمل تیار کر کے ایس ایچ او کے پیش کر دیا۔ایس ایچ او صاحب نے سرسری دریافت کی تو وہ بلاحجت اس کے سامنے بھی مان گئے۔

اب میں نے ایس ایچ او کو بلایا اور پوچھا کہ ان کی مکمل طور پر تسلی ہوگئی کہ یہ دونوں قاتل ہیں تو وہ کہنے لگے جناب اب شبہ والی کون سی بات رہ گئی ہے۔وہ تو خود اپنی زبانی سب کچھ بتلا رہے ہیں۔میں نے کہا راجہ صاحب یہ دونوں قاتل نہیں ہیں بلکہ ان کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔آپ میرے ساتھ گاؤں جھکڑ چلیں وہاں موقع پر جا کر تفتیش شروع کرتے ہیں۔اس واقعہ کے متعلق 3 یوم قبل جرم 364 تعزیزات پاکستان میں مقدمہ درج ہو چکا تھا جس میں خانوں اور میرو FIR میں نامزد ملزم تھے۔دونوں کو محرر کے حوالے کیا اور ہدایت کی کہ ان کو آرام سے بٹھانا ہے کوئی ملازم ان کے ساتھ سختی یا تشدد نہ کرے۔

میں موضع جھکڑ پہنچا۔ایس ایچ او صاحب اور کچھ ملازمین ہمراہ تھے۔ہم سیدھے ستار ماچھی کے گھر گئے۔گاؤں کا نمبردار اور چوکیدار بھی آ گئے۔مسمی ستار ماچھی کی بیوی نے دریافت کرنے پر بتلایا کہ چار یوم ہوئے ہیں کہ میرا خاوند ستار چھاہ ویلہ کی روٹی کھا کر اپنی گدھی پر بیٹھ کر جھکڑ کے جنگل سے تنور کیلئے لکڑیاں لینے گیا تھا جو آج تک واپس نہیں آیا اور نہ ہی گدھی کا پتہ چلا ہے۔ خانوں کے ساتھ اس کی مخالفت تھی اس لیے اسے شبہ ہے کہ خانوں اور میرو نے مل کر اسے قتل کر دیا ہے۔میں نے اس سے پوچھا کہ کون سے راستہ سے گیا تھا۔اس نے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر اشارہ سے بتلایا کہ گھر کے ساتھ والی گلی سے باہر نکلا تھا اور سیدھا سڑک پختہ پر جا کر آگے جھکڑ جنگل کی طرف جانا تھا۔ان کے گھر سے سڑک پختہ تقریباً 14 ایکٹر کے فاصلہ پر تھی۔میں راستہ پر

چل کر سیدھا سڑک پر پہنچا۔ ایس ایچ او میرے ساتھ ساتھ تھا۔ آگے سڑک پر سگریٹوں کا ایک کھوکھا تھا۔ کھوکھے کے مالک کو علیحدہ لے جا کر میں نے پوچھا کہ 4 روز قبل اس نے ستار ماچھی کو گدھی پر سوار جاتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس نے کہا کہ 4 روز قبل تقریباً 9 بجے دن کا وقت تھا کہ ستار ماچھی گدھی میں سوار ہو کر آیا۔ اس کے پاس کلہاڑی بھی تھی۔ اس نے مجھ سے سگریٹ کی ڈبیا لی۔ اسی اثنا میں گاؤں کی طرف سے حیدر، حیات اور قادر بخش ماچھی بھی آ گئے۔ وہ بھی اپنی اپنی گدھیوں پر سوار تھے۔ ستار بھی ان کے ہمراہ شامل ہو گیا اور چاروں جنگل کی طرف چلے گئے۔ یہ بات سن کر تفتیش کیلئے ایک اہم راستہ میرے سامنے آ گیا۔ چونکہ Blind Cases میں Lost Seen تفتیشی نقطہ نگاہ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے حیدر، حیات اور قادر بخش ماچھی کو فوراً اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ کھوکھا والے نے مزید بتایا کہ حیدر، حیات اور قادر بخش تھوڑی دیر پہلے تانگہ پر سوار ہو کر کمالیہ کی طرف گئے ہیں۔ میں نے فوراً اپنی سرکاری جیپ پیچھے لگائی۔ تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر وہ تینوں تانگہ میں جاتے ہوئے مل گئے جن کو ہمراہ لیا۔ وہاں سے ایک سوزوکی پک اپ کرایہ پر لی۔ حیدر کو اپنی جیپ میں بٹھا لیا اور باقی دونوں کو سوزوکی پک اپ میں بٹھایا اور ملازمین کو ہدایت کی کہ وہ سوزوکی میں ان کو علیحدہ علیحدہ بٹھائیں۔ آپس میں نہ تو کوئی بات کرنے دیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو دیکھنے دینا ہے۔ میں نے حیدر سے پوچھا کہ 4 روز پہلے تم جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گئے تھے۔ ستار ماچھی بھی تمہارے ساتھ گیا تھا۔ وہ کہاں ہے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ مجھے ساری بات کا پتہ چل گیا ہے اب سچ بتانا ہی بہتر ہے۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ اور قدرے سوچ کر بولا کہ جناب وہ تو لکڑیاں گدھی پر لاد کر ہم سے کافی پہلے چلا گیا تھا۔

میں نے اس کو وہ جگہ دکھانے کو کہا جہاں سے لکڑیاں جنگل سے کاٹی تھیں۔ ہم اس کے بتائے ہوئے راستہ پر جنگل میں گئے۔ دوسری پارٹی بھی سوزوکی پک اپ پر ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ جھکڑ جنگل کافی وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ایک سائیڈ سے نہر گزرتی ہے۔ نہر کی طرف سے اندر سڑک جو جنگل میں جاتی ہے اس پر تقریباً ایک فرلانگ اندر جنگل میں گئے تو حیدر نے کہا کہ جناب یہاں گاڑی روک لیں۔ گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ دوسری پارٹی بھی پک اپ سے اتر آئی۔ حیدر کے دونوں ساتھیوں کو علیحدہ علیحدہ دور فاصلہ پر بٹھا کر ملازمین ان کی نگرانی پر مامور کر دیئے۔ حیدر ہمیں لے کر جنگل کے اندر چل پڑا۔ جہاں گاڑی کھڑی تھی وہاں سے


Huma

تقریباً 200 گز اندر گئے تو آگے گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ اس نے نشاندہی کی کہ اس جگہ سے لکڑیاں کاٹی تھیں۔ وہاں پر واقعی لکڑیاں کاٹنے کے نشانات تھے۔ نشانات سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں سے لکڑیاں 3/4 روز پہلے کاٹی گئی تھیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تیرے دونوں ساتھیوں نے لکڑیاں کہاں سے کاٹی تھیں۔ اس نے قریب ہی وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سے اس کے دونوں ساتھیوں نے لکڑیاں کاٹی تھیں۔

میں نے حیدر سے پوچھا کہ ستار نے لکڑیاں کہاں سے کاٹی تھیں۔ اس نے بتلایا کہ اس نے یہاں سے کچھ آگے جا کر کاٹیں تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کتنا آگے۔ اس نے کہا کہ فاصلہ کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ آگے کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ جب وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹنے کی آواز کتنی دور معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتلایا کہ 3/4 ایکٹر کے فاصلے پر معلوم ہوتی تھیں۔ میں تھوڑا سا آگے گیا تو آگے اتنا گھنا جنگل تھا کہ ادھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے حیدر کو کہا کہ آگے تو انسان کا جانا ہی مشکل ہے تم کیسے کہتے ہو کہ آگے گیا تھا۔ اس پر وہ بوکھلا گیا اور اس کی زبان خشک ہونے لگی۔ میں واپس گاڑی کے پاس آیا۔ اس کو ملازمین کے پاس چھوڑ کر باقی دو ساتھیوں میں سے حیات کو علیٰحدہ بلایا اور کچھ دیر اس سے دریافت کرتا رہا۔ پھر اسے کہا کہ جہاں سے لکڑیاں کاٹی تھیں وہاں لے چلے۔ وہ مجھے اس جگہ لے گیا جہاں حیدر نے نشاندہی کی تھی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ ستار نے لکڑیاں کہاں سے کاٹی تھیں تو اس نے کہا کہ ستار نے بھی اسی جگہ سے کاٹی تھیں، لیکن ستار لکڑیاں لاد کر پہلے چلا گیا تھا۔ اس پر دیگر سوالات بھی کیے۔ ان دونوں کے بیانات میں تضاد پایا گیا۔ اب اس کو واپس گاڑی کے پاس لے جا کر علیحدگی میں بٹھا دیا اور قادر بخش کو بلوایا۔ قادر بخش میرے سامنے آیا تو وہ کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ اب حقیقت کھل چکی ہے۔ تمہارے ساتھیوں نے تمام بات بتلا دی۔ اب میرا وقت ضائع مت کرو سچی بات بتلانی ہے تو جلدی بتلاؤ ورنہ ذلیل وخوار ہو گے۔

یہاں یہ بات بتلاتا چلوں کہ جس جگہ سے ان لوگوں نے لکڑیاں کاٹی تھیں اس جگہ رسی سے پھاہ دے کر ان تینوں نے ستار کو قتل کیا تھا۔ جب قادر بخش نے دیکھا کہ حیدر اور حیات دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ انسپکٹر کو اس جگہ لے گئے ہیں تو اس نے سمجھا کہ ان دونوں نے سچ سچ بتلا دیا ہے اور اس جگہ کی نشاندہی کر دی ہے۔

میری بات ختم ہوتے ہی قادر بخش جس نے سر جھکا کر آنکھیں نیچی کر رکھی تھیں نظر بھر کر

میری طرف دیکھا اور کہا کہ جناب جو بات ان دونوں نے آپ کو بتلادی ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اب یہ سب کچھ اگلنے والا ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک تو ہے اب تو شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے لیکن تم سب کچھ اپنی زبانی بتلاؤ۔ اس نے کہا کہ عرصہ تقریباً ایک ماہ ہوا ہے کہ حیدر کی ہمشیرہ جو کہ میری بھانجی لگتی ہے۔ جس کی عمر 10/11 سال ہے گھر میں اکیلی تھی۔ دوپہر کے وقت یہ وحشی انسان ان کے گھر آ گیا۔ وہاں زبردستی اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اس کی والدہ جب گھر آئی تو لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد صحیح ہوش میں آئی تو اس نے سارا واقعہ اپنی والدہ کو سنایا۔ ہم عزت کے مارے خاموش رہے اور گھر میں ہی لڑکی کا علاج معالجہ کروایا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ ستار کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ستار کو کوئی گلہ شکوہ بھی نہ کیا۔ ہم موقع کی تلاش میں تھے۔ وقوعہ والے دن ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کیلئے جا رہے تھے۔ ستار بھی گاؤں کے نزدیک سڑک پختہ سے ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ ہم چاروں جنگل میں اس جگہ پر آئے۔ ہم تینوں نے رسی کے ساتھ پھاہ دے کر قتل کر دیا۔ نعش پر سرکنڈے وغیرہ رکھ کر اپنی اپنی گدھیوں پر لکڑیاں لاد کر گاؤں چلے گئے۔ شام کا کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم گدھیوں پر سوار ہو کر پھر آدھی رات کے وقت جنگل میں آئے۔ وہاں سے ستار کی نعش کو ایک گدھی پر رکھ لیا اور دربار پیر شہابل شاہ کے قریب دریائے راوی میں نعش پھینک دی۔ اس کے بعد میں نے حیدر اور حیات سے علیحدہ علیحدہ پوچھا وہ بھی جان چکے تھے کہ اب راز فاش ہو گیا ہے۔ انہوں نے بھی قادر بخش کی بات کی تائید کر دی اور بتلایا کہ نعش دربار پیر شہابل شاہ کے نزدیک دریائے روای میں پھینک دی تھی۔ ستار مقتول کی گدھی کے متعلق انہوں نے بتلایا کہ چیچہ وطنی پل کے قریب لاوارث چھوڑ دی تھی۔

ہم سیدھے انکی نشاندہی پر دریائے راوی پر پہنچے اور دربار پیر شہابل شاہ سے دو ایکڑ مشرق کی طرف انہوں نے علیحدہ علیحدہ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں نعش دریا میں پھینکی تھی۔ وہاں گدھی کے قدموں کے نشانات بھی زمین پر لگے ہوئے تھے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ ان کی بات درست ہے۔ قریب ہی دریا کے بالکل کنارے پیر شہابل شاہ کا دربار کچی دیواروں کا بنا ہوا تھا۔ وہاں پیر صاحب کا معجزہ یہ دیکھا کہ دریا راوی کا رخ پیچھے سے سیدھا دربار کی طرف ہے لیکن دربار سے تقریباً 400 گز کے فاصلے پر دریا اپنا رخ تبدیل کر دیتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب دریا میں طغیانی آتی ہے تو دربار بالکل محفوظ رہتا ہے اور پانی کی لہریں پیچھے سے اپنا رخ تبدیل کر لیتی ہیں۔

دربار کی دیوار میں سے دریا کی طرف ایک کھڑکی نما سوراخ ہے۔ایک بزرگ نے بتایا کہ ایک دفعہ حضرت خضرؑ اور پیر شہابل شاہ کا آپس میں کرامات کا مقابلہ ہوا تھا۔حضرت خضرؑ کی کشتی دریا میں تیرتی آ رہی تھی۔ پیر شہابل شاہ دیوار کے سوراخ میں سے سر نکال کر دریا کی طرف دیکھ رہے تھے۔انہوں نے جب حضرت خضرؑ کو کشتی میں سوار دیکھا تو ازراہ مذاق اپنی کرامات کے ذریعہ کشتی کو دریا کے وسط میں روک دیا۔ جب کشتی دریا میں رک گئی تو حضرت خضرؑ کو تجسس ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ پیر شہابل شاہ دیوار کے اندر سوراخ سے سر باہر نکال کر دیکھ رہے ہیں۔حضرت خضرؑ بھانپ گئے کہ یہ پیر شہابل شاہ کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔انہوں نے زوردار آواز سے پیر شہابل شاہ کو مخاطب ہو کر کہا کہ پیر صاحب کشتی کو چلنے دو ورنہ آپ کا سر بھی پیچھے نہیں جائے گا۔اور اچانک پیر شہابل شاہ کے سر میں دو بڑے بڑے سینگ لگ گئے۔ جب وہ اپنا سر پیچھے کھینچنے لگے تو سینگ دیوار میں پھنس گئے۔ کافی کوشش کے باوجود سر کو پیچھے نہ کھینچ سکے۔اس کے بعد دونوں بزرگوں نے آپس میں صلح کر لی۔حضرت خضرؑ کی کشتی رواں دواں ہوگئی اور پیر شہابل شاہ کے سر سے سینگ بھی غائب ہوگئے۔ یہ روایت اس علاقہ میں عام مشہور ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں سے نعش دریا میں پھینکی گئی وہاں گدھی کے قدموں کے نشانات موجود تھے۔اب سورج غروب ہو رہا تھا۔رات کو دریا سے نعش تلاش کرنی ممکن نہ تھی۔میں نے نمبردار کے ذریعہ چار گھوڑسواروں کا انتظام کرایا جن کو ہدایت کی کہ علی الصبح دو ایک طرف اور دو دریا کی دوسری طرف نعش کی تلاش کیلئے دریا کے کنارے کنارے جائیں۔

علی الصبح گھوڑسوار نعش کی تلاش کیلئے چلے گئے۔2 بجے دن ایک گھوڑا سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا جس نے بتلایا کہ یہاں سے 4 میل دور نعش دریا میں پڑی ہوئی ہے۔ہم سب وہاں پہنچے تو نعش پانی کے کنارے پڑی تھی۔ ٹانگیں پانی کے اندر اور سر باہر تھا۔نعش کو پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوایا گیا۔ حیدر، حیات اور قادر بخش کو ضروری کارروائی کے بعد جیل بھجوایا گیا جن کی نشاندہی پر ستار کی گدھی بھی مل گئی اور تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

عشق میں بیوی کا قتل



1979ء

1979ء میں جب کہ میں بطور سب ڈویژنل پولیس آفیسر کمالیہ تعینات تھا اور راجہ مزمل حیات سب انسپکٹر تھانہ کمالیہ کا انچارج تھا تو محمد دین نامی شخص جو کہ چڑھ محلہ کمالیہ کا رہنے والا تھا نے تھانے میں اطلاع دی کہ اس کی بیوی اغوا ہوگئی ہے۔ انچارج تھانہ نے اس کے بیان پر اغوا کا مقدمہ درج کیا اور تفتیش شروع کی۔ دوسرے دن محمد دین کا سُسر میرے پاس آیا اور بتلایا کہ اس کے داماد نے جو مقدمہ اپنی بیوی کے اغوا کا درج کروایا ہے وہ بالکل غلط ہے، بلکہ اس کے داماد کا تعلقِ ناجائز محلہ کی ایک لڑکی گامی کے ساتھ ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت اپنی بیوی سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ وہ نہایت سگھڑ اور شریف عورت تھی۔ اس سے 2 لڑکے اور ایک چھوٹی بچی بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی کے ساتھ اغوا ہوگئی ہو کیونکہ وہ فطرتاً نیک اور شریف ہے۔ اس کے کسی کے ساتھ اغوا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے شبہ ہے کہ اس کے داماد نے کوئی چکر چلایا ہے۔ میں نے تھانہ کمالیہ ٹیلی فون کر کے ایس ایچ او کو کہا کہ مدعی مقدمہ کو میرے پیش کریں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اے ایس آئی اس کو میرے پاس لے آیا۔ میں نے اس کی Face Reading کی اور چند سوالات کر کے نفسیاتی طور پر جائزہ لیا تو وہ مجھے مشکوک نظر آیا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں تقریباً تین گھنٹے مسلسل پوچھ گچھ جاری رکھی تو آخر میں اس نے سر نیچے کر لیا اور بالکل خاموش ہو گیا اور تنکا اٹھا کر زمین میں لکیریں نکالنی شروع کر دیں۔ میں نے پوچھ گچھ جاری رکھی۔ بالآخر وہ حقیقت بتلانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک عورت سے معاشقہ ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ معاشقہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس کو اپنی بیوی ضرور بنائے گا۔ چونکہ پہلی بیوی شادی کے راستہ میں رکاوٹ تھی اس لئے پروگرام بنایا کہ کیوں نہ اسے قتل کر دیا جائے۔ بروز وقوعہ کوٹھہ کے اندر دونوں سوئے ہوئے تھے کہ دو بجے رات کے قریب اس نے اپنی بیوی کا گلا دبا کر قتل کر دیا اور کوٹھہ کے اندر ہی گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا۔ اوپر سے فرش کی لپائی کر دی اور نعش والی جگہ کے اوپر چارپائیاں جوڑ دیں۔ میں نے ایس ایچ او کو بلایا اور ملزم کا بیان ریکارڈ کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ملزم کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے ساتھ لے کر اس کے گھر گئے۔ اس نے اپنے کوٹھہ کے اندر اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اپنی بیوی کو قتل کر کے نعش کو دفن

کیا تھا۔

علاقہ مجسٹریٹ صاحب اور معززین علاقہ کی موجودگی میں جگہ کھدوائی گئی تو وہاں سے اس کی بیوی کی نعش برآمد ہوئی۔ نعش کا پوسٹ مارٹم وغیرہ کرا کر ضروری کارروائی کے بعد وارثان کے حوالہ کردی اور میاں مجنوں جس کے سر پر عشق لیلیٰ جنون کی حد تک سوار تھا کو جیل بھجوا دیا گیا۔ بعد میں ملزم عدالت سے عمر قید سزایاب ہوا۔

نیکی کا بدلہ برائی



1980ء

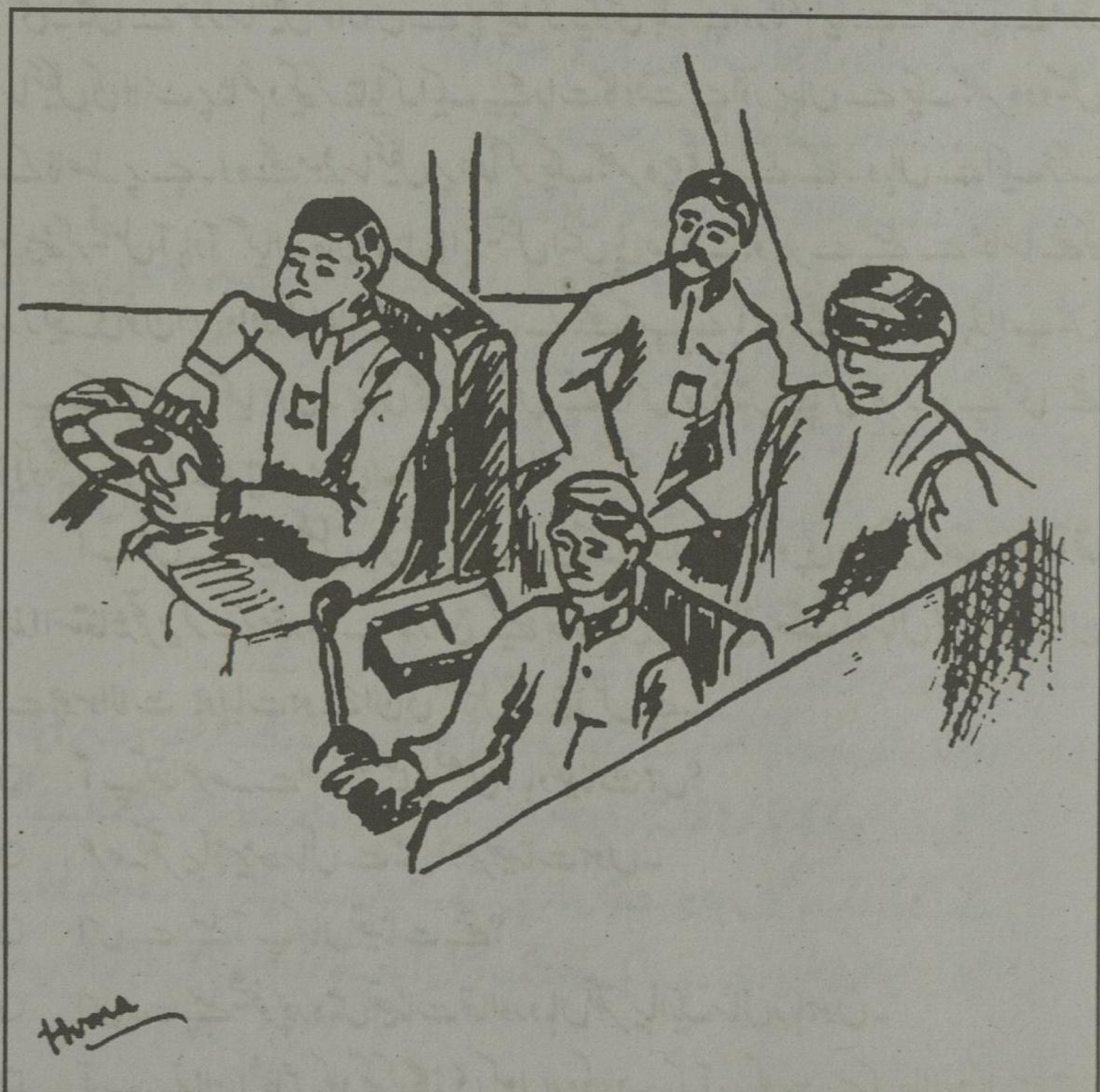
1980ء میں میں بطور انچارج تھانہ پیپلز کالونی اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ ماہ فروری کی ایک رات میں علاقہ میں گشت ختم کرنے کے بعد تقریباً 3 بجے رات اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر بستر پر لیٹا ہی تھا کہ جناب تاج محمد خان ایڈیشنل ایس پی فیصل آباد کا ٹیلی فون آیا کہ ''امان اللہ نامی شخص جو کہ محکمہ انہار میں بطور ایکسین فیصل آباد تعینات ہے اور جھنگ شہر کا رہائشی ہے وہ فیصل آباد سے جھنگ جا رہا تھا کہ تھانہ موچی والا ضلع جھنگ کے علاقہ میں چند نامعلوم مجرمان نے اس سے اس کی نئی گاڑی چھین لی ہے۔ اس کو آپ کی طرف بھیج دیا گیا ہے۔ آپ اس کی بات سن کر مجرمان کو ٹریس کریں اور گاڑی برآمد کریں''۔ بظاہر تو اس واردات کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ یہ میرا علاقہ نہ تھا۔ چونکہ سینئر افسران اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھ پر اعتماد کرتے تھے، اس لئے ایکسین صاحب کے وقوعہ کا فرض مجھے سونپ دیا گیا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ بستر ابھی گرم ہو رہا تھا کہ میں نے اسے الوداع کہا اور سکوٹر پر بیٹھ کر فوری طور پر تھانہ پہنچ گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد 4 بجے صبح ایکسین صاحب میرے دفتر تشریف لائے۔ ان کی حالت ناقابل دید تھی ۔ پریشان حال اور انتہائی سہمے ہوئے تھے اور واقعات بتلانے کیلئے بمشکل سے ان کی زبان کھل رہی تھی۔ میں نے ان کو تسلی دی اور اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کے لئے چائے منگوائی۔ جب ان سے واقعات کے متعلق دریافت کرتا تو وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھتے اور پھر رک رک کر ٹھہرائی ہوئی زبان کھولتے۔

چائے پینے کے بعد قدرے ان کی حالت سنبھلی اور میری بار بار تسلی کے بعد انہوں نے بتلایا کہ ''میں محکمہ انہار فیصل آباد میں بطور ایکسین تعینات ہوں ۔ جھنگ شہر کا رہائشی ہوں اور آرائیں قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ گزشتہ روز فیصل آباد سے جھنگ اپنی کار ٹیوٹا کرولا برنگ سرخ ماڈل 1980ء میں سوار ہو کر جا رہا تھا۔ جب 5 بجے شام پل چمرانوالی علاقہ تھانہ موچی والا ضلع جھنگ پہنچا تو دیکھا ایک سفید رنگ کی کار سڑک کی بائیں سائیڈ پر کھڑی تھی جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ دو اشخاص کار کے پاس کھڑے تھے اور ایک کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے رکنے کا

اشارہ کیا۔ میں نے سمجھا کہ ان کی گاڑی خراب ہوگئی ہوگی۔ ازراہ ہمدردی میں نے گاڑی ان کے پاس روک لی۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پیچ کس کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے ہاں میں جواب دیا اور ڈائس بورڈ سے پیچ کس نکال کر ان کے حوالے کیا اور خود تھوڑا آگے پیشاب کیلئے بیٹھ گیا۔ جب پیشاب سے فارغ ہو کر گاڑی کے پاس آیا تو ان میں سے ایک نوجوان نے اچانک پستول نکالا اور میرے ماتھے پر رکھ کر کہا کہ گاڑی کی چابی اس کے حوالے کرو۔ میں نے خوف زدہ ہو کر فوراً ہی اپنی جیب سے چابی نکال کر ان کے حوالے کی۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کہا کہ کیش بھی نکالو۔ میں نے جیب سے پرس نکال کر ان کے حوالے کیا۔ پرس میں تین ہزار ہزار والے نوٹ اور ایک پچاس والا نوٹ تھا۔ انہوں نے پچاس والا نوٹ پرس میں ڈال کر واپس مجھے دے دیا اور مجھے ان کی گاڑی میں بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں ان کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دونوں گاڑیاں جھنگ کی طرف روانہ ہوئیں۔ میرے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس نے ایک چادر سے میرے بازو پیچھے کی طرف باندھ دیئے اور آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی۔

میں نے ایسا محسوس کیا کہ 3/4 میل کا فاصلہ طے کر کے گاڑیاں پھر واپس فیصل آباد کی طرف ٹرن ہوگئیں۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی اچانک بند ہوگئی۔ ڈرائیور نے بار بار سیلف مارے لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کہا کہ گاڑی خراب ہوگئی ہے اس کو ادھر ہی چھوڑ دو دوسری گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ دوسری گاڑی قریب ہی کھڑی تھی۔ مجھے اتار کر اس گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ ایک شخص پھر اسی طرح میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی چلانے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گاڑی چلتی رہی۔ پھر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی ادھر روک لیں۔ چنانچہ ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ مجھے گاڑی سے اتارا اور سڑک کے قریب ہی جھاڑیوں میں بٹھا دیا اور دھمکی دی کہ اگر یہاں سے ادھر اُدھر ہوئے یا شور کیا تو گولی مار دیں گے۔ میں سہم کر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر اس کے چلنے کی آواز آئی۔ جب میں نے سمجھا کہ گاڑی دور نکل گئی ہے تو میں سڑک پر آ گیا۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سڑک پختہ تھی مجھے یہ علم نہ ہوسکا کہ کونسی جگہ ہے۔ خوف کے مارے میرا جسم کانپ رہا تھا یہ بھی ڈر تھا۔ کہ وہ پھر واپس آ کر مجھے گولی نہ مار دیں۔ میں نے اپنے ہاتھ کھولنے کی کافی کوشش کی۔ لیکن سختی کے ساتھ بندھے ہونے کی وجہ سے کھولنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ آنکھوں



سے پٹی اتارنے کیلئے سر کو ادھر اُدھر گھماتا رہا۔ لیکن ان ظالموں نے پٹی اتنی کس کر باندھی تھی کہ ذرا بھی نہ سرک سکی۔ میں دل ہی دل میں آیت کریمہ کا ورد کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد موٹر سائیکل پر دو نوجوانوں نے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تو موٹر سائیکل روک کر مجھ سے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ کیوں بندھے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ ڈاکو میری گاڑی چھین کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ کھولے اور آنکھوں سے پٹی بھی کھولی۔ میری گھڑی تو ڈاکوؤں نے پہلے ہی اتار لی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سواروں سے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور ٹائم کیا ہے۔ انہوں نے موٹر سائیکل کی لائٹ پر ٹائم دیکھ کر بتایا کہ ایک بجے رات کا وقت ہے اور یہاں سے چک جھمرہ دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر چک جھمرہ چونگی پر لے گئے۔ وہاں سے ایک ٹرک پر بیٹھ کر فیصل آباد آ گیا اور خان محمد تاج ایڈیشنل ایس پی صاحب جو میرے پہلے سے شناسا تھے کو بذریعہ ٹیلی فون اس واقعہ کی اطلاع دی جنہوں نے مجھے آپ کے پاس پہنچنے کیلئے کہا۔ لہٰذا اب میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ میری گاڑی جس کے ڈائس بورڈ میں پچاس ہزار روپے بھی تھے ڈاکو چھین کر لے گئے ہیں۔ میری امداد کی جائے"۔

اب میں نے ان کا مکمل بیان تحریر کیا۔ اور چونکہ وہ علاقہ تھانہ موچی والا ضلع جھنگ کا بنتا تھا لہٰذا استغاثہ تحریر کر کے مقدمہ کے اندراج کیلئے تھانہ موچی والا ضلع جھنگ ارسال کر دیا۔ اور ان سے جو سوالات جوابات ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

- ☐ آپ کتنا عرصہ سے ایکسین فیصل آباد تعینات ہیں؟
- ○ عرصہ تقریباً ڈیڑھ سال سے میں ادھر تعینات ہوں۔
- ☐ اس سے پہلے آپ کہاں تعینات تھے؟
- ○ اس سے پہلے شیخوپورہ میں تعینات تھا اور وہاں تقریباً ایک سال رہا ہوں۔
- ☐ آپ نے ان اشخاص کو دیکھ کر گاڑی کیوں روکی جب کہ آپ کو پتہ ہے کہ حالات ایسے ہیں کہ کسی شخص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا؟
- ○ انسانی ہمدردی کے تحت میں نے سمجھا کہ ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہو گی اور راستہ میں پریشان کھڑے دیکھ کر ان کے اشارہ پر گاڑی روک لی۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔
- ☐ ان کے علیحدہ علیحدہ حلیے بتائیں؟
- ○ تینوں ڈاکوؤں کے حلیہ کی تفصیل بتلائی۔

□ کونسی زبان بولتے تھے؟

○ پنجابی۔

□ کون سے علاقہ کی پنجابی بولتے تھے؟

○ ملی جلی پنجابی بولتے تھے۔

□ کیا ان کی زبان میں کوئی جنگلی زبان کی ملاوٹ تھی؟

○ تینوں میں سے ایک کی زبان میں جنگلی ملاوٹ تھی۔

□ کونسا ایسا لفظ بولا جو آپ کو جنگلی زبان کا معلوم ہوا؟

○ ایک نے دوسرے کو کہا تھا کہ ''ایدھا بوجھا پھول''

□ دوسرے کے الفاظ میں سے کوئی خاص لفظ بتائیں؟

○ ایک ملزم اپنی زبان میں ''ہے گا'' کا استعمال کرتا تھا۔ تیسرا ملزم زیادہ تر خاموش رہا۔ ایک دفعہ اس نے بات کی تھی جو فیصل آباد کے علاقہ کی زبان لگتی تھی۔

□ تینوں اشخاص کا علیحدہ علیحدہ لباس بتائیں؟

○ دو ملزمان نے سفید رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور تیسرے نے جس کی بول چال میں جنگلی زبان کی ملاوٹ تھی اس نے خاکی رنگ کا شلوار کرتہ پہنا ہوا تھا۔

□ دوران سفر وہ کس قسم کی گفتگو آپس میں یا آپ کے ساتھ کرتے تھے؟

○ وہ آپس میں بہت کم گفتگو کرتے تھے اور آہستہ آواز میں کرتے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ڈرائیور کو گائیڈ کرتا تھا۔ گاڑی ادھر موڑو، ادھر موڑو۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے کہا کہ وہ تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔ انہوں نے اپنے دشمن سے بدلہ لینا ہے، گاڑی کی سخت ضرورت ہے۔ ایک ہفتہ تک فیصل آباد کے گردونواح میں گاڑی آپ کو مل جائے گی۔

□ راستہ میں کہیں رکے تھے؟

○ ہاں گاڑی چلنے کے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ایک جگہ فرنٹ سیٹ والے شخص نے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی روکو سگریٹ لینے ہیں۔ ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ فرنٹ سیٹ والے شخص کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سگریٹ لے کر واپس آیا۔ ڈرائیور نے اسے کہا کہ ''یار اک کش مینوں وی لگوائیں''۔ دو مرتبہ دیا سلائی کے جلنے کی آواز آئی

اور اس کے بعد دھوئیں نے میری ناک کو چھوا اور بُو سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب یہ سگریٹ پی رہے ہیں۔

❑ راستہ میں کوئی شہر کراس کیا تھا؟

○ جی ہاں جہاں سے ان لوگوں نے سگریٹ لیے تھے وہ شہر تھا۔

❑ آپ کو کیسے پتہ چلا وہ شہر ہے؟

○ وہاں گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور رکشوں کی کافی آوازیں آ رہی تھیں۔

❑ کتنا بڑا شہر ہوگا؟ کتنی دیر تک گاڑیوں کی آوازیں آپ کو سنائی دیتی رہیں؟

○ تقریباً بیس منٹ تک گاڑی کے چلنے کے دوران گاڑیوں کی اور رکشوں کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد آوازیں کم ہوتی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اکادکا گاڑی کراس کرتی رہی۔ اس سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اب ہم شہر کراس کر کے باہر کسی سڑک پر جا رہے ہیں، ایک مرتبہ میں نے ساتھ والے شخص سے کہا کہ میرے ہاتھ زیادہ سخت بندھے ہوئے ہیں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے، کپڑا تھوڑا سا ڈھیلا کر دیں۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا کہ ”بکواس بند کرو خاموش بیٹھے رہو“۔ میں پہلے ہی مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا معافی چاہتا ہوں۔ تقریباً پون گھنٹہ گاڑی چلی کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی روک لو۔ چنانچہ ڈرائیور نے گاڑی روک کر مجھے اتارا اور سڑک کے قریب ہی جھاڑیوں میں بٹھا دیا اور شور نہ کرنے کی ہدایت کی۔

❑ جہاں ملزمان کی گاڑی خراب ہوئی تھی اور آپ کو دوسری گاڑی میں بٹھالیا تھا وہاں سے چلنے کے کتنی دیر بعد شہر آ گیا تھا جہاں سے سگریٹ لیے تھے؟

○ تقریباً آدھ یا پون گھنٹہ چلنے کے بعد وہ جگہ آ گئی تھی۔

❑ جب ملزمان گاڑی چھین کر 3/4 میل آگے جا کر واپس مڑے وہاں سے شہر تک سیدھے آئے تھے یا دائیں، بائیں کوئی ٹرن لیا تھا؟

○ دائیں بائیں کوئی ٹرن نہیں لیا تھا، بالکل سیدھے آئے تھے۔

❑ آپ کی گاڑی میں پٹرول کتنا تھا؟

○ میں نے فیصل آباد سے جھنگ جاتے ہوئے گاڑی کی ٹینکی فل کروائی تھی۔

ان جملہ سوالات وجوابات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزمان کی جو گاڑی خراب ہوئی

ہے وہ فیصل آباد سے جھنگ روڈ پر بیس کلومیٹر کے اندر موجود ہونی چاہیے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ملزمان کی گاڑی تلاش کرنی چاہیے جو راستہ میں خراب ہوگئی تھی۔ ممکن ہے اس میں سے ملزمان کی کوئی واگزاشتہ چیز مل جائے جو ملزمان کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہوسکے۔

چنانچہ ملازمین کو تیار کیا اور ایکسین صاحب کو ہمراہ بٹھا کر ساڑھے پانچ بجے بذریعہ سوزوکی پک اپ جھنگ روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب فیصل آباد سے تقریباً 16 کلومیٹر دور گئے تو سلور رنگ کی مزدا کار نمبر FD487 جو بعد میں جعلی نمبر ثابت ہوا جو ملزمان چھوڑ گئے تھے کھڑی موجود پائی۔ کار کے سٹیرنگ، ڈائس بورڈ، اور دروازہ پر لگے ہوئے ملزمان کے انگلیوں کے نشانات کو محفوظ کر کے نہایت احتیاط کے ساتھ گاڑی کی تلاشی لی۔ گاڑی کے ایش ٹرے میں گولڈ لیف سگریٹ کے آٹھ ٹوٹے ملے جن میں سے پانچ ٹوٹے ایسے تھے جو تقریباً آدھا سگریٹ پیا ہوا تھا اور تین ٹوٹے سگریٹ فلٹر کے نشان تک پیئے ہوئے تھے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ تین ملزمان میں سے دو سگریٹ پیتے ہیں۔ ایک طبعاً امیر آدمی ہے اور دوسرا کنجوس فطرت کا ہے۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ کے سامنے سے ایک باریک سا کاغذ کا ٹکڑا ملا جو اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ملزم نے کوئی خط پھاڑ کر اس کے باریک باریک پرزے کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہو اور ایک باریک سا ٹکڑا پھینکتے وقت اندر گر گیا ہو۔ اس باریک سے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا ''یانہ سے آ''۔ اب ان ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ یانہ لفظ کا ابتدائی حصہ پھٹا ہوا تھا۔ اور اس سے آگے بھی پھٹا ہوا تھا میں نے کافی غور و خوض کے بعد یانہ کو ستیانہ پڑھا۔ ستیانہ سے آیا، آرہا یا ستیانہ سے آگے ہوسکتا تھا۔ ستیانہ سے آرہا کے متعلق بہت سوچا لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ پھر ستیانہ سے آگے پر کافی دماغ سوزی کی۔ ستیانہ سے آگے ایک طرف فیصل آباد شہر اور دوسری طرف تاندلیانوالہ شہر ہے۔ اگر خط میں ان شہروں کے متعلقہ کوئی بات ہوتی تو پھر چونکہ یہ دونوں شہر مشہور تھے ان کا نام خط میں لکھا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ستیانہ سے آگے اگر فیصل آباد کی طرف جائیں تو فیصل آباد سے پہلے وہ جگہ ہونی چاہیے۔ یا اگر تاندلیانوالہ کی طرف جائیں تو تاندلیانوالہ سے پہلے وہ جگہ ہونی چاہئے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا تو میری ایک حس جو ہمیشہ میری صحیح رہنمائی کرتی ہے اور اللہ تعالی کی طرف سے خاص طور پر ودیعت کردہ ہے نے میری راہنمائی کی کہ ستیانہ سے آگے ایک موضع کترووال ہے جہاں کا رہائشی ایک شخص سعید گوجر ہے جو کہ کاریں چھیننے اور چوری کرنے کی وارداتوں میں خاصا بدنام تھا۔ اب میں فوری طور پر واپس اپنے تھانہ

پیپلز کالونی کی طرف روانہ ہوا اور ملزمان کی واگزاشتہ کار بھی قبضہ میں لے کر ہمراہ لے لی۔ تھانہ پیپلز کالونی پہنچ کر میں نے پرانے سمجھدار اور مجرمان سے واقفیت رکھنے والے ملازمین کو اکٹھا کیا اور ان سے سعید گوجر کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کہاں مل سکے گا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتلایا کہ سعید گوجر نے کچھ عرصہ سے بٹالہ کالونی کے نزدیک ایک مکان کرایہ پر لیا ہوا ہے اور اگر فیصل آباد آئے تو اس مکان میں رہتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مزید بتایا کہ اس نے وہ مکان دیکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ سفید کپڑوں میں جائے اور خفیہ طور پر پتہ لگائے کہ سعید گوجر مکان میں موجود ہے یا نہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہیڈ کانسٹیبل نے واپس آ کر بتلایا کہ سعید گوجر کے متعلق اس نے اس کے مکان کے قریب ایک کھوکھا والے سے دریافت کیا ہے۔ اس نے بتلایا ہے کہ وہ اس وقت اپنے گھر موجود ہے۔ میں نے فوری طور پر اس کے ہمراہ نثار علی شاہ سب انسپکٹر اور 4 کانسٹیبلان کو بھیجا کہ وہ سعید گوجر کو لا کر میرے سامنے پیش کریں۔

ملزمان کی واگزاشتہ کار میں نے تھانہ کے سامنے پورچ میں کھڑی کرا دی اور میں بڑی بے تابی کے ساتھ کار کے پاس کھڑا ہو کر نثار علی شاہ سب انسپکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد نثار علی شاہ سب انسپکٹر مسمی سعید گوجر کو ہمراہ لے کر پہنچ گیا۔ سعید گوجر تھانہ کے گیٹ کے اندر داخل ہوا تو میں نے اسے بغور دیکھنا شروع کر دیا۔ میں دراصل تھانہ میں داخل ہونے کے بعد اس کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس کی نظر اچانک کار پر پڑی تو اس نے کار اور اس کی نمبر پلیٹ کو ایک خاص انداز اور خاص نظر سے دیکھا۔ اس کی یہ حرکت بحیثیت تفتیشی میری تفتیش میں مددگار و معاون ہونے کیلئے کافی وزن رکھتی تھی۔ میں سعید گوجر کو پہلے ہی جانتا تھا کیونکہ میں نے ایک مرتبہ اسے ایک کار چوری کے کیس میں پکڑا تھا اور وہ بھی میرے طریقہ تفتیش سے واقف تھا۔ کار کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کار اس نے پہلے دیکھی ہوئی ہے۔

اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ میں سامنے دفتر میں بیٹھ گیا اور اسے اندر بلوا کر مندرجہ ذیل چند سوالات کیے۔

□ سعید تمہارا کیا حال ہے؟

○ سر جی! بس وقت کو دھکا دے رہے ہیں۔

□ تمہارے سابقہ مقدمات کا کیا فیصلہ ہوا ہے؟

○ سر جی! تین مقدمات میں بری ہو گیا ہوں اور دو مقدمات ابھی زیر سماعت عدالت ہیں۔

□ سعید اب میں تم پر ایک ایسا سوال کر رہا ہوں جس کے جواب میں اگر سچ بولو گے تو تمہاری عزت ہوگی اور اگر جھوٹ بولو گے تو پھر ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

○ سر جی! آپ پوچھیں میں آپ کو بالکل سچ سچ بتاؤں گا۔

اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی چمک سے مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی انکشاف کرنے کیلئے بہت بے تاب ہے۔ اب جو سوال میں نے کرنا تھا وہ انتہائی اہم تھا اور سوچ سمجھ کر کرنے کی ضرورت تھی۔

□ سعید گاڑی سلور کلر جو سامنے کھڑی ہے اس کے متعلق یہ بات میرے علم میں آچکی ہے کہ آپ کو اس گاڑی کے متعلق سب کچھ علم ہے۔ آپ بتائیں کہ آپ نے اس گاڑی کو اس سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ سچ سچ بتائیں۔

○ سر جی! یہ گاڑی کل دوپہر کے وقت دیکھی تھی۔

□ شاباش مجھے یقین ہے کہ آپ سچ بولیں گے۔ کس کے پاس اور کہاں دیکھی تھی؟

○ سر جی! کل دوپہر کے وقت میں اپنے گاؤں کترووال اپنے ڈیرہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اس گاڑی میں سعادت بلوچ، نوری کمیانہ ساکن تاندلیانوالہ اور ایک تیسرا شخص جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی میں اسے جانتا ہوں میرے پاس آئے تھے۔

□ تیسرے شخص کے متعلق تم نے دریافت نہیں کیا تھا کہ وہ کون ہے؟

○ میں نے سعادت بلوچ سے اس کے متعلق پوچھا تھا اس نے بتلایا کہ اس کا نام الیاس ہے اور شیخوپورہ کا رہائشی ہے۔ مزید میں نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

□ وہ کس حلیہ کا تھا اور کون سی زبان بولتا تھا؟

○ اس کا چہرہ گول، سر موٹا اور رنگ سانولا تھا اور شیخوپورہ سائیڈ کی زبان بولتا تھا۔

□ اس کا قد کتنا تھا؟

○ قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری تھا۔

□ آپ کے پاس کتنی دیر رہے اور کیا گفتگو ہوئی تھی؟

○ میں نے انہیں چائے پلائی تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھے رہے۔ عام باتیں ہوتی رہیں تھیں۔ روانگی کے وقت سعادت بلوچ نے بتلایا تھا کہ وہ فیصل آباد جا رہے ہیں۔

□ سعادت بلوچ اور نور کمیانہ کو تم کیسے جانتے ہو؟

○ سعادت بلوچ اور میں اکٹھے ملتان جیل میں رہے ہیں۔ اور نوری کمیانہ ہمارے علاقہ کا ہے۔ اس کو میں کافی عرصہ سے جانتا ہوں۔ سعادت بلوچ کو میں پہلے سے جانتا تھا کیونکہ وہ ملتان جیل سے ایک سال قبل فرار ہوا تھا اور فراری کے بعد اس نے پنجاب بھر میں سنگین وارداتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ صوبہ بھر کی پولیس اس کی گرفتاری کیلئے کوشاں تھی۔ میں نے سعادت بلوچ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے سعید گوجر کو مزید اعتماد میں لے لیا اور جس طرح سے ایکسین کی کار چھینی گئی تھی سارا واقعہ اسے بتلایا۔ اس نے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھ کر مجھے کہا کہ سر جی! میں نے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ میں نے دفتر کا دروازہ بند کر دیا اور ساتھ پڑے ہوئے بنچ پر اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا اور بولا کہ ”سر جی! میں نے ساری بات سن لی ہے۔ پہلے بھی میں نے آپ کو سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔ اب بھی میں کوئی بات آپ سے نہیں چھپاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ سعادت بلوچ کی گہری دوستی شفقت ربیرہ ساکن گوگیرہ سے ہے۔ اس پر وہ مکمل اعتماد کرتا ہے۔ کبھی کبھار اس کے پاس جا رہا ہو تو مجھے بھی ملنے کیلئے آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ دیر اور کسی کے پاس نہیں ٹھہرتا۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار آدمی ہے۔ اس نے چک جھمرہ سائیڈ کا رخ کیا ہے تو وہ لازمی طور پر شفقت ربیرہ کے پاس گیا ہوگا۔ اسکے سوا اس علاقہ میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ چک جھمرہ سائیڈ کا اس نے صرف جھانسہ دیا ہے۔ شفقت ربیرہ کے مسکن پر فوری چھاپہ ماریں تو سعادت بلوچ لازمی پکڑا جائے گا۔ اس نے مزید بتلایا کہ شفقت ربیرہ کا جو رہائشی ڈیرہ ہے وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ پر اس کے مزارع کا ڈیرہ ہے۔ اس قسم کے مہمانوں کو وہ عام طور پر اس مزارع کے ڈیرہ پر ٹھہراتا ہے“۔

چوہدری محمد عرفان محمود صاحب ہمارے ایس ایس پی تھے جو انتہائی دلیر، نڈر اور پرعزم پولیس افسر تھے۔ میں نے بذریعہ ٹیلی فون ان کو تمام حالات بتلائے۔ انہوں نے شفقت ربیرہ کے ڈیرہ پر فوری طور پر ریڈ کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ ایک ٹیم کی خود نگرانی کی اور دوسری ٹیم کا انچارج نثار علی شاہ سب انسپکٹر کو بنایا۔ ہم گاڑیوں کے ذریعے 9 بجے رات تھانہ بابلک ضلع فیصل آباد جس کی حدود تھانہ گوگیرہ ضلع اوکاڑہ کے ساتھ ملتی ہیں پہنچ گئے۔ وہاں بیٹھ کر ایک خاص مخبر کے ذریعہ شفقت ربیرہ اور اس کے مزارع کے ڈیرہ کی ریکی کروائی۔ مخبر نے بتلایا

کہ شفقت ربیرہ کے مزارع کے ڈیرہ پر سرخ رنگ کی نئی گاڑی حویلی کے اندر کھڑی ہے اور یہ بھی بتلایا کہ کچھ مہمان بھی ان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ گیارہ بجے رات ہم نے دونوں مقامات پر ریڈ کیے۔ ایکسین سے چھینی ہوئی کار وہاں مزارع کی حویلی میں کھڑی موجود پائی اور نوری کمیانہ اور الیاس دونوں ملزمان بھی مل گئے جن کو قابو کر لیا گیا۔ سعادت بلوچ کے متعلق پتہ چلا کہ وہ شام کو شفقت ربیرہ کے ہمراہ کہیں چلا گیا ہے۔ یہ علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔

کار کے اندر سے ایک ٹیچی کیس ملا جس میں سعادت بلوچ کے چھ جوڑے کپڑے تھے اور شیونگ کا سامان وغیرہ تھا۔ گاڑی اور ٹیچی کیس قبضہ میں لے کر واپس پانچ بجے صبح تھانہ پیپلز کالونی فیصل آباد پہنچ گئے۔ دونوں ملزمان نے تفتیش کے دوران گاڑی سعادت بلوچ کے ہمراہ چھیننی تسلیم کی۔ ان کے خلاف ضابطہ کے تحت کارروائی کی۔ سعادت بلوچ کو مجرم اشتہاری قرار دیا گیا جو بعد میں شیخوپورہ شہر میں پولیس کے ساتھ مقابلہ کے دوران ہلاک ہو گیا تھا۔

موٹی ویشن (Motivation)

1980ء

میں ایک ایسا واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اگر انسان نیک نیتی کے ساتھ دوسرے انسان کو نیک کام کی ترغیب دے تو اس پر کس قدر مثبت اثرات پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ معاشرہ کے اندر کتنا اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

1980ء کی بات ہے کہ میں بطور انسپکٹر انچارج تھانہ پیپلز کالونی فیصل آباد تعینات تھا۔ عدالت عالیہ لاہور کی جانب سے شام کو مجھے ایک حکم ملا کہ رٹ پٹیشن کے سلسلہ میں عدالت عالیہ میں پیش ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ راستہ میں، میں نے ڈرائیور سے اس کا نام و پتہ دریافت کیا اور اس سے گفتگو اس انداز میں شروع کی کہ پاکستان جو بہت بڑی قربانیوں کے بعد ہمیں ملا ہے ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی بقاء اور سلامتی کیلئے اور اس کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے ہم سب خواہ کسی بھی پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں دیانتداری اور نیک نیتی سے محنت کریں اور جہاں بھی پیارے وطن کو بدنام کرنے والے جرائم پیشہ اور بدکردار عناصر کا پتہ چلے ان کی نشاندہی کی جائے۔ میں نے اسے اپنا ہم خیال بناتے ہوئے مزید کہا کہ ٹیکسی ڈرائیور برائی کی نشاندہی کرنے میں اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اس کا واسطہ اکثر جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رہتا ہے کیونکہ جرائم پیشہ افراد جرائم کے ارتکاب کیلئے زیادہ تر ٹیکسی کاریں استعمال کرتے ہیں۔ لاہور پہنچنے تک ہماری اسی موضوع پر گفتگو جاری رہی۔ عدالت عالیہ لاہور سے فارغ ہو کر واپس فیصل آباد جاتے ہوئے ہمارا موضوع گفتگو پھر وہی تھا۔ جب ہم واپس فیصل آباد پہنچے اور ڈرائیور کو فارغ کیا تو اس نے مجھے کہا کہ ”صاحب جی جتنا عرصہ آپ کے ساتھ سفر کیا ہے آپ نے برائی کے خاتمہ کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی اور مجھے بھی اس بات کی ترغیب دیتے رہے۔ میں آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آج کے بعد مجھے اپنا ایک ورکر سمجھیں اور آئندہ نہ صرف برائی سامنے آنے پر بلکہ اس کی ٹوہ لگا کر فوراً اطلاع کروں گا“۔ مجھے اس کی گفتگو اور چہرے کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ اس پر میری باتوں کا بہت گہرا اثر ہوا ہے اور اس کے اندر کا انسان جاگ گیا ہے۔

تقریباً دس روز گزرے ہوں گے کہ وہ ڈرائیور میرے پاس چھ بجے شام تھانہ میں آیا اور

مجھے علیٰحدگی میں بات کرنے کو کہا۔اس نے بتایا کہ آپ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرنے آیا ہوں۔ایک شخص محبوب عرف بوبی وسیع پیمانے پر منشیات کا کاروبار کرتا ہے۔اس نے مجھے اعتماد میں لے کر بتلایا کہ اس نے لاہور سے چرس لانی ہے اور کرایہ طے کر کے میں گھر سے کپڑے لینے کے بہانہ آیا ہوں۔وہ پل خالصہ کالج پر میرا انتظار کر رہا ہے۔آپ کار کا نمبر اور رنگ وغیرہ دیکھ لیں ہم مال لے کر آج ہی 11 بجے رات اور 3 بجے رات کے درمیان واپس آئیں گے۔آپ ہمارا انتظار کھڑیانوالہ اڈا پر کریں۔جب ہم وہاں سے گزریں تو ہمارا تعاقب کریں۔اگر گاڑی میں مال ہوگا تو میں پچھلے دونوں اشارے دو تین مرتبہ جلاؤں گا۔جب میں نے محبوب عرف بوبی کا نام سنا تو چونک اٹھا کیونکہ اس شخص سے ہمارے سٹاف نے چھ ماہ قبل ایک من چرس پکڑی تھی۔ضمانت کروانے کے بعد یہ ملزم روپوش ہو گیا تھا۔کافی عرصہ سے ہم اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے،لیکن یہ قابو نہیں آ رہا تھا۔

اطلاع دے کر ڈرائیور چلا گیا۔میں نے پرائیویٹ کار کا انتظام کیا اور اپنے ساتھ ملازمین کو لے کر کھڑیانوالہ اڈا پر 11 بجے رات پہنچ گئے۔سخت سردی تھی ہم گاڑی کے شیشے بند کر کے سڑک کے کنارے گاڑی کا رخ فیصل آباد کی طرف کر کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔4 بجے رات تک جب اس کی گاڑی نہ آئی تو ہم مایوس ہو گئے لیکن ہم نے انتظار جاری رکھی اور اسی طرح گاڑی میں بیٹھے رہے۔7 بجے صبح اچانک وہ ڈرائیور کار لے کر آ گیا۔اس نے کار ہماری کار کے آگے کھڑی کر دی۔وہ اکیلا تھا۔اس نے میرے پاس آ کر علیٰحدگی میں بتلایا کہ محبوب عرف بوبی کو لاہور سے مال نہیں مل سکا۔وہ مال لینے کیلئے گجرات چلا گیا ہے۔میں صرف لاہور سے آپ کو اطلاع دینے کیلئے آیا ہوں کہ آپ انتظار نہ کرتے رہیں۔آج رات انشاءاللہ 10 بجے سے 2 بجے رات کے درمیان گزریں گے،آپ اسی جگہ ناکہ بندی کر لیں۔میں نے ملازمین کو ہمراہ لے کر پروگرام کے مطابق پھر کھڑیانوالہ اڈا پر ناکہ بندی لگالی۔ٹھیک ساڑھے بارہ بجے رات وہ کار ہمارے پاس سے گزری۔ہم نے اپنی گاڑی فوراً اس کے عقب میں روانہ کر لی۔ڈرائیور نے پچھلے اشارے جلا کر ہماری یقین دہانی کرادی کہ گاڑی میں سامان موجود ہے۔ہم تعاقب کرتے ہوئے محلہ عبداللہ پور کے موڑ پر پہنچے تو ہم نے اوورٹیک کر کے اپنی گاڑی ان کی گاڑی کے آگے کھڑی کر دی اور ان کو روک کر قابو کر لیا۔محبوب عرف بوبی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔اس کو قابو کر لیا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے تین من چرس برآمد ہوئی۔چرس قبضہ میں لے کر محبوب عرف بوبی کے

خلاف مقدمہ درج کر کے گرفتار کرلیا۔

اب آپ اس واقعہ سے اندازلگائیں کہ اگر کسی شخص کو نیک نیتی اور پُر خلوص طریقہ سے نیکی کے راستہ پر لگانے کی کوشش کی جائے تو لوگ کس حد تک تعاون کرتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک اور انسان ہوتا ہے۔ اس کو صرف جگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ڈرائیور پر میری باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے اپنے وقت اور مال کا ضیاع کر کے اس بدکردار اور معاشرہ کے ناسور کو گرفتار کرا دیا۔ پولیس افسران اگر لوگوں کو پیار محبت اور اخلاص کے ساتھ اعتماد میں لینے کی کوشش کریں تو کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور جو پولیس افسران عوام سے دوری اختیار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بداخلاقی اور غیر شائستہ انداز میں پیش آتے ہیں عوام ان سے دلی طور پر نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے اور ناکام زندگی گزارتے ہیں۔ Motivation سے انسانی سوچ کو کافی حد تک تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

چناب ایکسپریس سے فراری



1978ء

1978ء میں چک نمبر 290 تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں عاشق جٹ، بشیر، اقبال اور مالک ملزمان نے ایک نوجوان لڑکی ننھی کو دیرینہ دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا۔ اس سے پہلے ننھی کے والد بشیر احمد اور چچا ڈاکٹر مقصود بھی دیرینہ دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ ننھی کے قتل کیس میں عاشق جٹ وغیرہ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ کی سماعت سپیشل ملٹری کورٹ میں شروع ہوئی۔ ملزمان نے پولیس کی حراست سے فراری کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ 24 جون 1980ء کو جب پولیس انہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر کے بذریعہ چناب ایکسپریس واپس فیصل آباد لا رہی تھی تو ملزمان کے ساتھی بھی اسی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ جب گاڑی نور پور ریلوے اسٹیشن سے تھوڑا آگے نکلی تو عاشق جٹ کے ساتھیوں نے پولیس کانسٹیبل سیف اللہ کو خنجروں سے زخمی کر کے اس سے سرکاری رائفل چھین لی اور باقی ملازمین کو قابو کر لیا۔ پیشگی منصوبہ کے تحت ان کے دو ساتھیوں مشتاق اور نذیر نے ریلوے انجن کے کیبن کا شیشہ توڑا اور اندر داخل ہو کر ڈرائیور یوسف اور فائرمین افتخار کو پستول دکھا کر خوف زدہ کر کے ٹرین رکوالی اور ہتھکڑیوں سمیت عاشق جٹ اور اس کے ساتھی پولیس کی حراست سے چھڑا کر ٹرین سے اتر کر فرار ہو گئے۔

اس سنسنی خیز واقعہ کے بعد علاقہ میں خوف و ہراس پھیل گیا اور پولیس کیلئے یہ کیس چیلنج بن گیا۔ ان دنوں فیصل آباد ضلع کے ایس ایس پی چوہدری عرفان محمود خان تھے جو جسمانی طور پر پتلے دبلے تھے لیکن ان کے اندر شیر کا دل تھا۔ وہ انتہائی خود دار اور دلیر آفیسر تھے۔ میں ان دنوں تھانہ پیپلز کالونی فیصل آباد کا بطور انسپکٹر انچارج تھا۔ ایس ایس پی صاحب نے مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا کہ آپ تھانہ گوجرہ کے ایس ایچ او رہ چکے ہیں جس سے علاقہ میں واقفیت ہے۔ عاشق جٹ اور اس کے ہمراہی ملزمان کی گرفتاری کی کوشش کریں۔ چنانچہ میں ایس ایس پی کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا اپنے چیدہ چیدہ قابل اعتماد ملازمین کو ہمراہ لے کر گوجرہ چلا گیا۔ وہاں اطلاعات فراہم کر کے عاشق جٹ کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

پوچھ گچھ کے دوران گاؤں کے ایک شخص ولایت نے مجھ سے علیحدگی میں خفیہ ملاقات کی اور انتہائی رازداری میں کہا کہ اگر اسے کرایہ کیلئے کچھ رقم دی جائے وہ چند دنوں میں عاشق جٹ اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کر کے پکڑوا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے کچھ رقم دے دی۔ دوسرے

تیسرے روز آ کر وہ ساری کارروائی بتاتا اور کرایہ کیلئے مزید کچھ رقم لے کر چلا جاتا۔

ایک دن میرے ایک خاص واقف کار شخص نے بتلایا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ عاشق جٹ کے گھر والوں نے ایک شخص محمد دین کو عاشق جٹ کے پاس اسے خرچہ کیلئے کچھ رقم دینے کیلئے کہیں دور دراز علاقہ میں بھیجا ہے جو کہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں نے اس شخص کے ساتھ ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبل سفید کپڑوں میں لگا کر ہدایت کی کہ اس کے گاؤں کو جو راستے آتے ہیں ان پر خفیہ طور پر پتہ جوئی رکھیں اور محمد دین کو راستہ میں ہی اٹھا کر لے آئیں۔

دوسرے روز محمد دین مذکور جانی والا ریلوے اسٹیشن سے ٹرین سے اتر کر اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ ہماری پارٹی نے اسے اٹھا لیا اور میرے پاس لائے۔ میں نے محمد دین سے دریافت کیا کہ وہ چند دنوں سے کہاں گیا ہوا تھا۔ اس نے بتلایا کہ وہ ملتان گیا ہوا تھا۔ ''ملتان کیوں گیا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔ بتلایا کہ اس کا ایک عزیز نشتر ہسپتال میں داخل ہے، اس کی بیمار پرسی کیلئے گیا تھا۔ کون عزیز اس کا نام بتائیں۔ میں نے پوچھا۔ چونکہ وہ جھوٹ بول رہا تھا، ہسپتال میں اس کا کوئی عزیز داخل نہیں تھا وہ گھبرا گیا اور اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ عاشق جٹ کے گھر والوں نے مجھے سب کچھ بتلا دیا ہے کہ تم اسے رقم دینے گئے تھے۔ بتاؤ کتنی رقم دے آئے ہو''؟ میں نے اسے مخاطب ہو کر کہا ''بتاؤ بتاؤ مجھے سب علم ہے تم بات کو کیوں چھپا رہے ہو''؟ میں نے پھر اسے کہا۔ ''جناب میں زمین پر بیٹھ جاؤں''؟ اس نے کہا ''ہاں بیٹھ جائیں''۔ میرے کہنے پر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور بتلایا کہ جناب چار ہزار روپے عاشق جٹ کے گھر والوں نے اسے پہنچانے کیلئے دئے تھا جو اسے پہنچا کر واپس آ رہا ہوں۔ ''کہاں پہنچا کر آ رہے ہو؟ میں نے جلدی سے پوچھا۔ جواب ملا کہ حاصل پور۔

قارئین حضرات آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اتنے اہم انکشاف ہونے پر ایک ذمہ دار پولیس افسر کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔ میں نے اسے فوری طور پر گاڑی میں بٹھایا اور تھانہ رجانہ پہنچ کر ایس ایس پی صاحب کو ٹیلی فون پر بتلایا کہ عاشق جٹ کا سراغ مل گیا ہے اور حاصل پور ریڈ کرنا ہے۔ انہوں نے حمید اللہ قریشی ایس ایچ او تھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کو بمعہ گارڈ فوری طور پر میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے بھی اپنے ساتھ نفری کو الرٹ کر لیا۔

محمد دین نے دریافت پر مزید بتلایا کہ حاصل پور میں ایک وکیل کی کوٹھی کے اندر ایک کمرہ میں عاشق جٹ اور اس کے دو ساتھی رہتے ہیں۔ آج صبح سویرے میں وہاں ان کے پاس سے روانہ ہوا ہوں۔ وہ کوٹھی کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

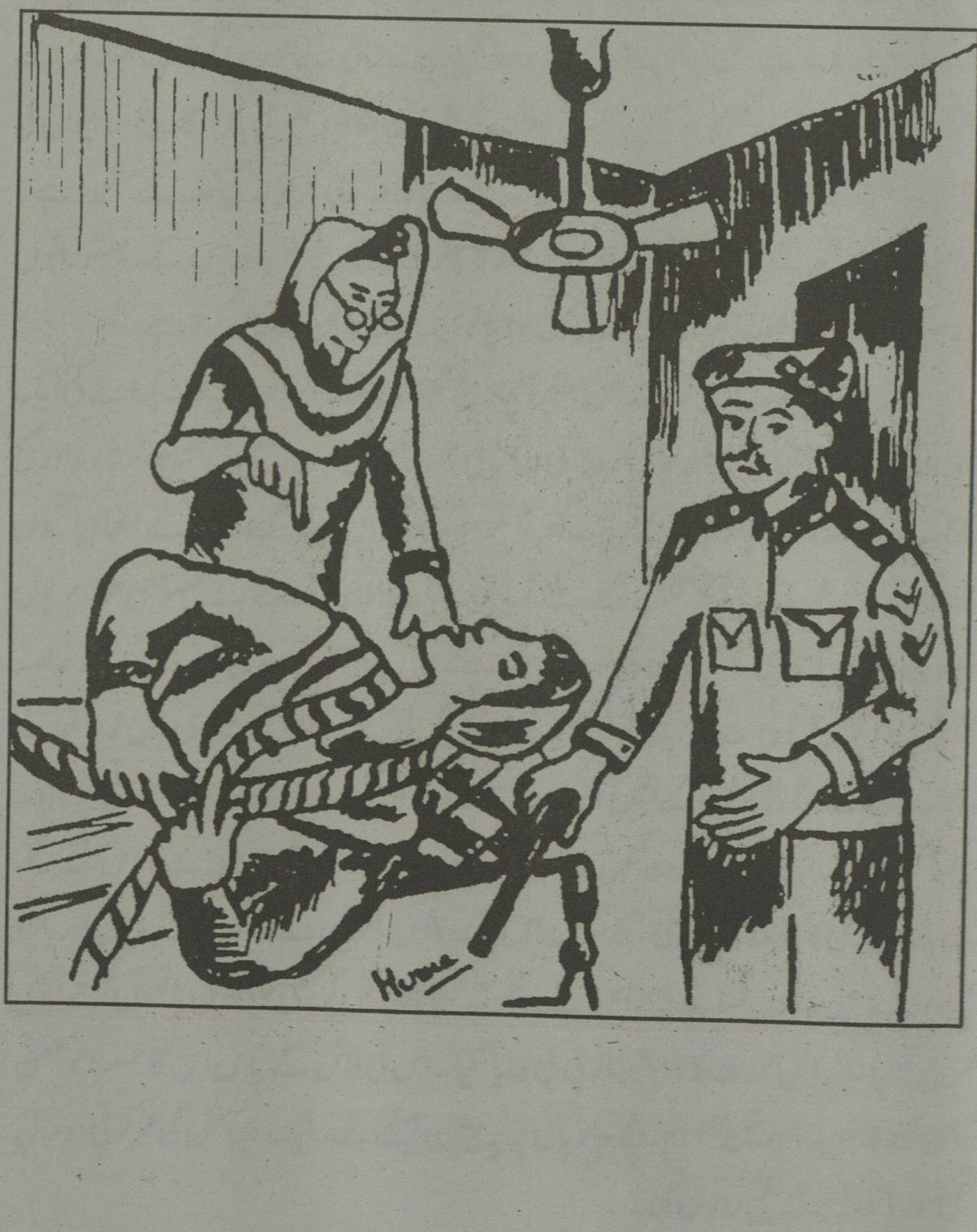

302
909
Huma

نو بجے رات ہم تین گاڑیوں میں تھانہ رجانہ سے روانہ ہوئے۔ محمد دین کو نشاندہی کیلئے ہمراہ لے لیا۔ چار بجے صبح حاصل پور پہنچ کر متعلقہ تھانہ سے امداد حاصل کی۔ تھانہ سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر کوٹھی تھی۔ گاڑیاں تھانہ کے سامنے کھڑی کر دیں اور خود پیدل روانہ ہوئے۔

جب کوٹھی سے تقریباً 100 گز کے فاصلہ پر پہنچے۔ وہاں سڑک پر درختوں کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا۔ اچانک سامنے سے تین اشخاص آتے دکھائی دیئے۔ ہم نے سمجھا کہ عاشق جٹ اور اس کے ساتھی آرہے ہیں۔ ہم نے فوری طور پر ان کو گھیرے میں لے کر پکڑ لیا۔ وہ عاشق جٹ اور اس کے مفرور ساتھی تو نہیں تھے البتہ قارئین یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ان میں سے ایک شخص ولایت تھا جو مجھ سے کئی مرتبہ کرایہ کے بہانے رقم لے چکا تھا۔ اور اس کے دو ساتھیوں میں ایک عاشق جٹ کا بھائی اور دوسرا اس کا قریبی عزیز تھا۔ ہم نے ان کو قابو کر لیا۔ یہ اس وقت عاشق جٹ کو مل کر آرہے تھے۔ ان کے نکلنے کی وجہ سے کوٹھی کا مین گیٹ کھلا تھا۔ ہم کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے اور محمد دین کی نشاندہی پر اس کمرہ میں اچانک تیزی سے داخل ہو گئے جہاں عاشق جٹ اور اس کے دونوں ساتھی چارپائیوں پر موجود تھے۔ ان کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور قابو کر لیا۔ جب عاشق جٹ قابو آ گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ اس زمانہ کا انتہائی خطرناک اور بدنام مجرم اشتہاری تھا۔ اور چناب ایکسپریس کو روک کر فراری کے واقعہ کی نہ صرف ملکی پریس میں تشہیر ہوئی بلکہ انٹرنیشنل پریس نے بھی اس واقعہ کو بہت اچھالا تھا اور پولیس کیلئے ان کی گرفتاری ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ملزمان کو گرفتار کر کے فیصل آباد لائے۔ اس سارے واقعہ میں جو قابل ذکر بات ہے وہ مسمی ولایت کا کردار ہے جس کے متعلق انکشاف ہوا۔ اس کا عاشق جٹ کے ساتھ پہلے دن سے رابطہ تھا۔ وہ پولیس کی تمام نقل و حرکت سے اسے آگاہ رکھتا تھا۔ ادھر ہمارا Informer بنا ہوا تھا اور کرایہ کے بہانے ہم سے رقم بٹورتا رہا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا میرا مقصد صرف مسمی ولایت کے کردار کو اجاگر کرنا ہے تاکہ قارئین پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ اس قسم کے چالاک، گھٹیا کردار والے لوگ بھی ہمارے معاشرہ میں موجود ہیں جو ڈبل گیم کھیلتے ہیں۔

عاشق جٹ اور اس کے ساتھیوں کو ضروری کارروائی کے بعد جیل بھیج دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قتل کے مقدمہ میں سزائے موت ہوا اور پھانسی کے پھندے میں جھول گیا۔

قاتل نرس



1981ء

فیصل آباد جس کا پرانا نام لائل پور تھا کپڑے کی صنعت اور گھنٹہ گھر کی وجہ سے مشہور ہے۔ پرانے شہر کا نقشہ اس خوبصورت انداز سے بنایا گیا ہے کہ اگر آپ کسی بھی بازار کے دوسرے سرے پر کھڑے ہو کر شہر کے وسط کی جانب دیکھیں تو آپ کے سامنے گھنٹہ گھر نظر آئے گا۔ گھنٹہ گھر سے متصل مختلف بازاروں کے نام مختلف شہروں یا علاقوں پر رکھے گئے ہیں۔ ہر بازار کا رخ اسی شہر یا علاقے کی طرف ہے جس پر اس بازار کا نام رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ گھنٹہ گھر سے جھنگ بازار کی طرف دیکھیں تو آپ کا رخ جھنگ کی طرف ہوگا اور منٹگمری بازار کا رخ ساہیوال کی جانب۔ پیپلز کالونی فیصل آباد کا ایک اہم تھانہ ہے۔ یہ علاقہ ڈی گراؤنڈ کی وجہ سے مشہور ہے۔ شام کے وقت شہر کے لوگ اکثر تفریحاً ڈی گراؤنڈ کا چکر لگانے آتے ہیں اور اس کے ریستورانوں اور سنیک باروں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر کوئی بوٹا پانوں والا سے پان لینا پسند کرتا ہے۔

میں 1981ء میں اسی تھانے میں بطور انچارج تعینات تھا۔ ان دنوں یہ تھانہ کرائے کی ایک عمارت میں واقع تھا۔ تین اور چار مارچ کی درمیانی رات کو میں حسب معمول گشت کرتا رہا اور صبح کاذب کے وقت کوئی چار بجے کے قریب گھر آ کر سو گیا۔ صبح دس بجے مجھے ملازم نے اٹھا دیا کیوں کہ تھانے سے محمد نذیر ہیڈ کانسٹیبل مجھے ملنے آیا تھا۔ ایک ملازم کا تھانے سے خصوصی طور پر یوں انچارج کے گھر آنا کسی خاص بات کی وجہ ہی ہوتا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ محلّہ خالصہ کالج سے اطلاع آئی ہے کہ ایک عورت نے خودکشی کر لی ہے۔ اطلاع ملتے ہی میں فوراً تھانے پہنچا۔ وہاں سے نثار علی شاہ اے ایس آئی اور چند حوالداروں کو ساتھ لے کر سیدھا موقع پر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک جوان عورت کمرے میں چارپائی پر مردہ حالت میں پڑی ہے۔ اس کے گلے میں باریک رسی کا پھندا ہے۔ رسی کے سرے اس کے دونوں ہاتھوں کے ساتھ بندھے ہیں اور بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے گلے میں پھندا ڈال کر رسی کو دونوں ہاتھوں سے اچھی طرح کھینچا ہو۔ اس عورت کا نام شہناز بی بی بتایا گیا۔ اس کی لاش کے پاس اس کا سسر احمد حسن ساس مسماۃ سعیدہ اور تین معصوم بچے چارپائی پر پریشان بیٹھے تھے۔ ایک بچہ جس کی عمر کوئی دو سال تھی سو رہا تھا۔ بڑی بچی رو رہی تھی۔

احمد حسن اور اس کی بیوی نے بتایا کہ شہناز بی بی نے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ میرے پوچھنے پر احمد حسن نے بتایا کہ اس نے رسی اپنے گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ اسے کیسے علم ہوا کہ شہناز بی بی نے خودکشی ہی کی ہے۔ اس پر احمد حسن نے جواب دیا کہ شہناز بی بی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ بچے ساتھ والی چارپائی پر سو رہے تھے۔ میں اور میری بیوی برآمدے میں سو رہے تھے۔ رات کے تین بجے کا وقت ہو گا جب میں نے چارپائی کے ہلنے کی آواز سنی۔ اٹھ کر اندر گیا تو دیکھا کہ شہناز بی بی نے اپنے گلے میں رسی ڈالی ہوئی ہے اور پورے زور سے رسی کو کھینچ کر پھندا ڈال رہی ہے۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو جگایا اور ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ رسی کو اتنے زور سے کھینچ چکی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے اس کی جان نکل گئی۔

میں نے لاش کا بغور معائنہ کیا۔ احمد حسن کی باتیں میرے دل کو مطمئن نہ کر سکیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی بہو نے خودکشی کیوں کی ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ شہناز کا شوہر دو سال سے نوکری کرنے کیلئے قطر گیا ہوا ہے۔ شہناز اکثر اس بات پر پریشان رہتی تھی کہ وہ اسے بہت کم پیسے بھیجتا ہے جس سے وہ اپنے بچوں کو نہیں پال سکتی۔

میں نے اس کے خاندان کے باقی افراد کی تفصیلات معلوم کیں تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ایک بیٹی جو ابھی تک کنواری ہے سول ہسپتال جھنگ میں نرس ہے۔ اس کا نام نصرت پروین ہے۔ میں نے احمد حسن سے اس کی بیوی سے علیحدہ کر کے مزید سوالات کیے۔

''جب آپ کو رات تین بجے اپنی بہو کی خودکشی کا پتہ چل گیا تھا تو آپ نے تھانے میں بروقت اطلاع کیوں نہیں کی؟ سات گھنٹے تاخیر کیوں کی''؟ میں نے پوچھا۔

''میں شہناز بی بی کے والدین اور بھائیوں کی آمد کا منتظر رہا''؟ اس نے جواب دیا۔

وہ کہاں رہتے ہیں؟ ''نگہبان پورہ فیصل آباد میں''۔

''ان کو آپ نے کس وقت اطلاع دی''؟ ''شہناز کے مرنے کے بعد میں نے ان کو اطلاع بھجوا دی تھی''۔

اطلاع کیسے بھجوائی؟ وہ اس سوال کے جواب میں خاموش رہا۔ میں نے سوال دہرایا۔ اطلاع کون لے کر گیا تھا؟

''ایک لڑکے کو بھیجا تھا''۔ کس کو وہ کون ہے؟ ''اس کا نام ارشد ہے۔ ساتھ والی گلی میں رہتا

ہے'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نے اپنی بیٹی نصرت پروین کو اطلاع دی ہے؟'' جی ہاں میں نے اپنی بیٹی کو اطلاع بھجوادی ہے۔''

کب؟ ''صبح کی اذان کے وقت اپنے پڑوسی محمد علی کے گھر سے ٹیلیفون کر کے''۔

وہ اب تک کیوں نہیں آئی؟ جھنگ یہاں سے صرف سینتالیس میل دور ہے میں نے پوچھا۔

''میں خود پریشان ہوں کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچی''۔ احمد حسن نے کہا۔

شہناز کا چھوٹا بچہ جس کی عمر دو سال ہے ماں کے پاس نہیں سوتا؟

''روزانہ ماں کے پاس ہی سوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آج کیوں ماں سے علیحدہ چارپائی پر سویا۔''

''آپ نے اپنے پڑوسیوں کو اس واقعے کی اطلاع نہیں دی''؟ ''میں نے بہت شور کیا تھا مگر محلے سے کوئی شخص بھی نہیں آیا''۔

اس کے بعد میں نے نثار علی اے ایس آئی سے کہا کہ وہ بھی احمد حسن سے پوچھ گچھ کرے اور خود ان کے پڑوسی محمد علی سے ٹیلیفون کی تصدیق کرنے کیلئے اُن کے گھر چلا گیا۔ محمد علی نے مجھے بتایا کہ احمد حسن نے جھنگ کوئی ٹیلیفون نہیں کیا۔ البتہ صبح آٹھ بجے جھنگ سے اس کی بیٹی نصرت پروین کا ٹیلیفون آیا تھا۔ وہ اپنی ماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔ جب وہ اس کی والدہ کو ٹیلیفون کے لیے بلانے ان کے گھر پہنچا تو وہ اسے دیکھ کر رونے لگی کہ شہناز نے خودکشی کرلی ہے۔ پھر اس نے اپنی بیٹی سے ٹیلیفون پر بات کی اور روتی ہوئی گھر چلی گئی۔

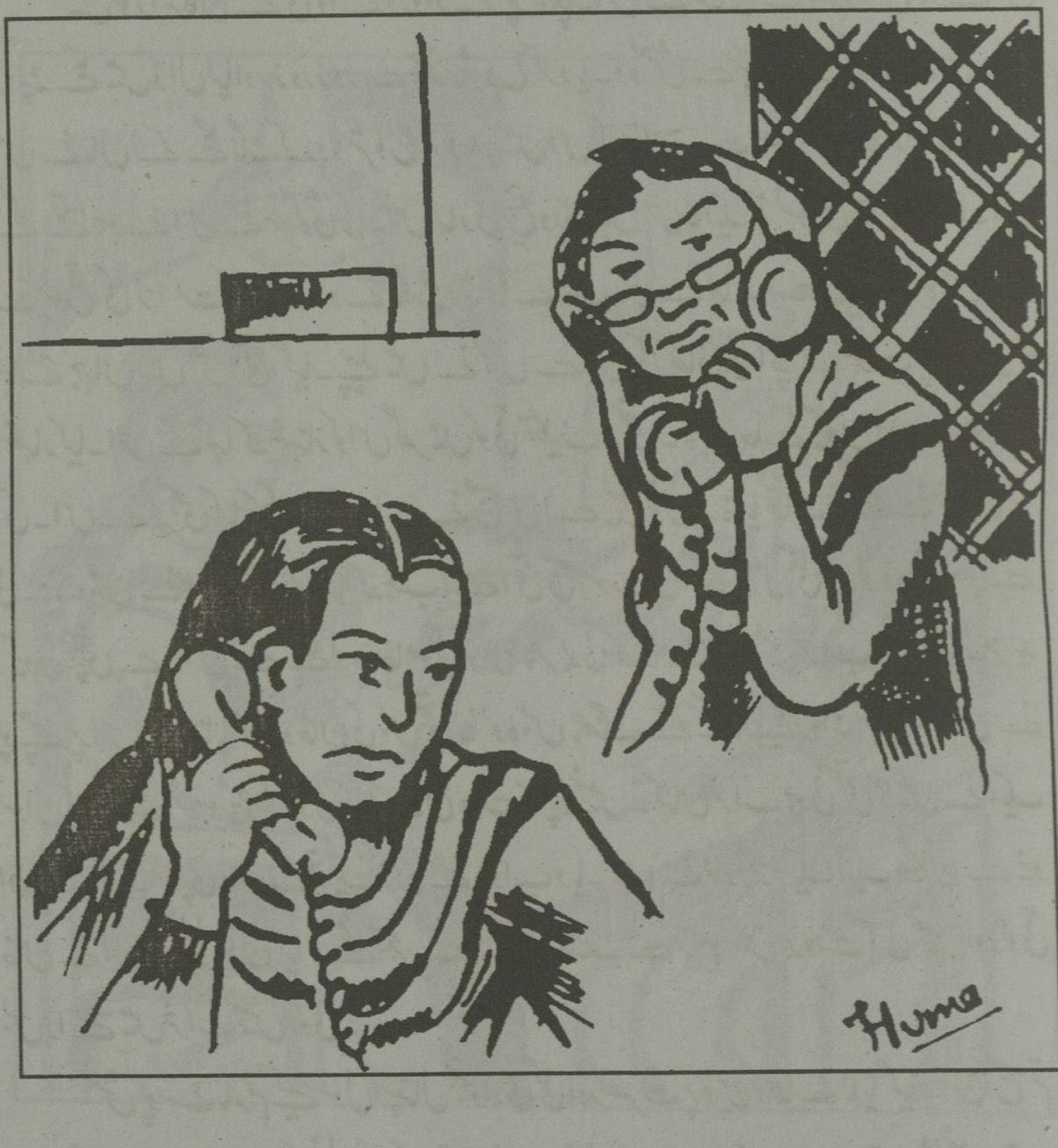
محمد علی سے گفتگو کر کے میں ارشد کے گھر گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کو کسی نے شہناز کے والدین کو اس واقعے کی اطلاع دینے کو نہیں کہا۔ میں پھر احمد حسن کے گھر آ گیا تو وہاں ایک شخص نعش سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ وہ شہناز کا حقیقی بھائی تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں اس نے مجھے بتایا کہ شہناز کی شادی دس سال ہوئے احمد حسن کے بیٹے سعید کے ساتھ ہوئی تھی۔ دو سال ہوئے شہناز کا خاوند روزگار ڈھونڈنے قطر چلا گیا تھا۔ شہناز کی ساس اور نند نصرت پروین اکثر اس سے لڑتی جھگڑتی تھیں۔ تنگ آ کر شہناز میکے آ گئی مگر گزشتہ جمعہ کو وہ اسے واپس سسرال چھوڑ گیا۔ آج پونے دس بجے انہوں نے اسے اطلاع دی کہ شہناز نے خودکشی کرلی ہے۔ مگر شہناز ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ اسے ان دونوں سے خطرہ ہے کہ وہ اسے قتل کروادیں گی۔ یہ دونوں عورتیں اکثر اسے اس بات کا طعنہ دیتی تھیں کہ وہ اپنے خاوند کی ساری کمائی اپنے پاس رکھ لیتی ہے

اور گھر کے راز دوسروں کو بتاتی ہے۔ اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ شہناز نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے شہناز کے بھائی کے بیان پر قتل کا مقدمہ درج کر لیا۔

میں نے نثار علی شاہ اے ایس آئی کو مکان کے دروازے پر چھوڑا تا کہ جوں ہی نصرت پروین گھر پہنچے مجھے اس کے آنے کی فوری اطلاع دے اور خود شہناز کے بچوں کو ساتھ لے آیا۔ میں نے انہیں ناشتہ کروایا۔ جس بچے کی عمر چھ سال تھی اسے پیار کیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا ''بیٹا بتائیں آپ کی اماں کو کس نے مارا ہے۔''؟

میرے سوال پر وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ میں نے اسے پھر پیار سے کہا ''بیٹا ڈرو نہیں مجھے سب بتا دو کوئی کچھ نہیں کہے گا''۔

بچہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا ''میرا چھوٹا بھائی اماں کے پاس سویا ہوا تھا۔ ہم تین بہن بھائی ساتھ والی چارپائی پر سوئے ہوئے تھے۔ رات کو کسی وقت چارپائی کے ہلنے کی آواز آئی تو میری جاگ کھل گئی۔ اُٹھ کر دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی جو اماں کے پاس سوتا تھا ہماری چارپائی پر لیٹا تھا۔ میں نے اماں کو آواز دی۔ اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے ایک موٹے آدمی اور ایک عورت کو بھاگ کر گلی والے دروازے سے نکلتے دیکھا۔ میں اپنی چارپائی سے اٹھ کر اماں کی چارپائی پر گیا۔ اماں کو آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ میں اماں سے لپٹ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں رسی بندھی ہوئی ہے۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ اور برآمدے میں سوئے ہوئے دادا، دادی کو آواز دی۔ وہ میری آواز پر فوراً ہی بول پڑے جیسے پہلے ہی سے جاگ رہے ہوں۔ میں نے رو رو کر انہیں بتایا کہ اماں کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میری آوازوں کے جواب میں بالکل نہیں بول رہی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے ایک آدمی اور عورت کو گلی والے دروازے سے نکلتے دیکھا ہے۔ دادی نے کہا بیٹے تم نے اندھیرے میں جن بھوت کا سایہ دیکھا ہوگا۔ آؤ میرے پاس آ کر سو جاؤ۔ میں نے کہا کہ میری اماں کو جگائیں۔ ان کی خیریت معلوم کریں۔ دادی نے جواب دیا کہ نہیں بیٹا تمہاری اماں پر جن بھوت کا سایہ ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔ میں نے بتی جلانے کی کوشش کی مگر بتی نہ جلی تو میں سمجھا کہ بجلی چلی گئی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مین سوئچ آف کیا ہوا تھا۔ مجھے نیند کہاں آنی تھی میں دادی کے پاس جا کر لیٹ گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ دن کی روشنی میں میں نے اماں کو جگانے کی پھر کوشش کی لیکن اماں نہیں جاگی۔ دادا، دادی پر اماں کو اٹھانے کے لئے اصرار کیا تو وہ اس کی چارپائی پر


Huma

آئے اور کہا کہ اس نے خودکشی کرلی ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر کہا نہیں اماں خودکشی نہیں کرسکتی۔ اس نے رات کو ہمارے ساتھ پروگرام بنایا تھا کہ بیٹے تمہیں کل نئے کپڑے اور چھوٹی سائیکل لے کر دوں گی"۔ ابھی میں بچے سے باتیں کررہا تھا کہ ساڑھے بارہ بجے نثار علی شاہ اے ایس آئی نے اطلاع دی کہ نصرت پروین جھنگ سے آگئی ہے۔

میں فوراً مکان کے گلی والے دروازے پر پہنچا۔ اس نے مکان کے اندر داخل ہوتے ہی دوپٹہ گلے میں ڈال لیا اور زور زور سے چیخنا شروع کردیا۔ وہ نعش سے لپٹ کر بین کرنے لگی۔ پھر اس نے ماں کے گلے لگ کر رونا شروع کردیا۔ میں اس کی تمام حرکات بغور دیکھ رہا تھا۔ ماں سے گلے لگتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔ اس ساری چیخ وپکار میں اس کا ایک آنسو بھی نہیں ڈھلکا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نثار علی شاہ اے ایس آئی سے کہا کہ اسے علیحدہ کمرہ میں لے جائے جہاں میں بھی پہنچ گیا۔ پہلے میں نے اس سے اس کی بھابی کی اچانک موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ شہناز کو اس گھر میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اس نے خودکشی کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے باپ نے صبح ہی اسے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ شہناز نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب اسے اتنی صبح موت کی اطلاع مل گئی تھی تو وہ اتنی دیر سے کیوں پہنچی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ خاموش رہی پھر بولی کہ راستے میں بس خراب ہوگئی تھی۔ مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ نیو خان کی بس تھی۔ "وہ بس جھنگ سے کتنے بجے روانہ ہوئی"؟ میں نے سوال کیا۔ کچھ دیر سوچ کر بولی کہ اسے صحیح وقت کا پتہ نہیں۔ کہاں خراب ہوئی تھی؟ میں نے ایک اور سوال کیا۔ موچی والا کے قریب اس نے جواب دیا۔ میں نے فوراً نزدیک ایک مکان سے نیو خان کے اڈے ٹیلی فون کیا تو مجھے مینجر نے بتایا کہ جھنگ سے تمام بسیں بروقت آئی تھیں اور کوئی بس راستے میں خراب نہیں ہوئی۔

نعش پوسٹ مارٹم کیلئے سول ہسپتال بھجوادی گئی اور نصرت پروین کو تھانے لایا گیا۔ آج صبح تم نے جھنگ سے اپنی والدہ کو ٹیلی فون کیا تھا؟ میں نے نصرت پروین نرس سے پوچھا۔ "نہیں میں نے ٹیلی فون نہیں کیا، بلکہ میرے والد نے مجھے شہناز کی خودکشی کی اطلاع دینے کیلئے ٹیلی فون کیا تھا۔" اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ٹیلی فون تمہارے والد نے نہیں کیا بلکہ تم نے کیا تھا تو؟ "تو پھر میں مجرم ہوں"۔

میں نے محمد نذیر ہیڈ کانسٹیبل کو ان کے پڑوسی محمد علی کو بلانے بھیجا۔ محمد علی جب آیا تو میں نے


Hume

اسے علیحدہ لے جا کر کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتائے کہ نصرت پروین کا جھنگ سے ٹیلی فون آیا تھا یا نہیں۔ اس پر وہ قدرے غصہ سے کہنے لگا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نصرت پروین نے اپنی والدہ کو جھنگ سے ٹیلی فون کیا۔ اب میں محمد علی کو اس نرس کے سامنے لے آیا۔ محمد علی کو دیکھ کر اس نے سر جھکا دیا اور مان گئی کہ اس نے ٹیلی فون کیا تھا۔

چونکہ احمد حسن اس کی بیوی اور بیٹی کے جھوٹ واضح طور پر سامنے آ چکے تھے، میں نے ان تینوں کی علیحدہ علیحدہ انٹیروگیشن شروع کر دی۔ اس پر نصرت پروین نے کہا کہ میں سچ بول دوں تو کیا آپ میرے ماں باپ کو چھوڑ دیں گے۔ ''میں نے کہا کہ اگر وہ بے قصور ہیں تو'' اس پر اس نے قتل کی ساری روداد سنائی۔

کہنے لگی ''میرے بھائی احمد سعید ناصر کی شادی دس سال قبل شہناز بی بی سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے چار بچے پیدا ہوئے۔ دو سال ہوئے میرا بھائی روزگار کیلئے قطر چلا گیا۔ وہ جو رقم بھی بھیجتا وہ میری بھابی اپنے بھائیوں کو دے دیتی اور میرے والدین کو ایک پیسہ بھی نہ دیتی۔ جب میں جھنگ سے چھٹی پر گھر آتی تو وہ مجھ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتی اور میرے بھائی کو خط لکھتی کہ تمہاری بہن خراب ہو چکی ہے۔ وہ اکثر مجھ سے اور میرے والدین سے لڑتی رہتی اور کہتی کہ تم گھر سے نکل جاؤ۔ جب اس نے ہمارا ناک میں دم کر دیا تو میں نے اپنے والدین سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں اس کا مزاج درست کر دوں۔ والدین نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے اسے ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ سول ہسپتال جھنگ کے جس وارڈ میں میں ڈیوٹی کرتی ہوں اس میں نذیر مسیح خاکروب بھی کام کرتا ہے۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ اعتماد میں لیا۔ روزانہ اسے پانچ دس روپے چائے کیلئے دے دیتی۔ ایک روز اسے اعتماد میں لے کر اس سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میری بھابی نے میرے والدین کو تنگ کیا ہوا ہے اور مجھے سارے محلے میں بدنام کر رکھا ہے۔ میں نے اسے بھابی کو ٹھکانے لگانے پر بیس ہزار روپے بھی دینے کا وعدہ کیا۔ وہ ایک جی دار شخص ہے اس نے کام کو بغیر کسی لالچ کے کرنے کا وعدہ کیا۔ نذیر مسیح نے یہ منصوبہ بنایا کہ رات کو فیصل آباد گھر جا کر سوتے ہوئے شہناز کا گلا دبا دیتے ہیں اور پھر راتوں رات واپس جھنگ آ جاتے ہیں۔ اس طرح کوئی ہم پر شک نہیں کرے گا۔ چنانچہ کل ہم ایک بجے رات بس میں سوار ہو کر فیصل آباد آئے۔ بس سٹینڈ سے رکشے پر بیٹھ کر گھر پہنچے۔ والدہ برآمدہ میں سوئی ہوئی تھیں۔ ان کو جگا کر اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ میں اور نذیر مسیح

اندر کمرے میں گئے۔ چھوٹے بچے عامر کو ماں کے پاس سے اٹھا کر دوسری چارپائی پر ڈالا۔ شہناز گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ نذیر نے اس کا گلا دبا دیا اور میں اس کی چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ شہناز تڑپی اور چارپائی کے ہلنے سے بڑا بچہ جاگ گیا۔ اس نے ماں کو آواز دی۔ ہم نے جلدی سے اس کے بازوؤں میں رسی باندھ دی تاکہ پولیس اگر دیکھے تو خودکشی کا واقعہ بنا دے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے والدہ کو باہر بتایا کہ کام ہو گیا ہے اور میں واپس جا رہی ہوں۔ تم صبح واویلا کر دینا کہ شہناز نے خودکشی کر لی ہے۔ میں اور نذیر تھوڑی دور تک پیدل چلے پھر رکشہ مل گیا۔ بس سٹینڈ پہنچے اور بس پر سوار ہو کر جھنگ چلے گئے۔ تقریباً آٹھ بجے صبح میں نے اپنے پڑوسی محمد علی کے نمبر پر فیصل آباد ٹیلی فون کیا اور والدہ کو بلایا کہ اس سے حالات معلوم کروں۔ والدہ نے بتایا کہ ابھی تک کسی کو اطلاع نہیں دی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ خودکشی کی اطلاع دے دیں۔ اور محلے میں بھی خودکشی کا واویلا کریں۔ صاحب جی، اب میں اپنے کیے پر بہت پچھتا رہی ہوں۔ میں نے بہت ظلم کیا ہے۔ میرے بھائی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کون پالے گا میری آنکھوں پر بالکل پردہ پڑ گیا تھا۔ میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ اپنے محلے میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی'' میں نے اسے گرفتار کیا۔ اس کی نشاندہی پر سول ہسپتال جھنگ سے نذیر مسیح کو بھی گرفتار کیا۔ نذیر مسیح ایک کالا کلوٹا دیو قامت انسان تھا۔ اس نے بھی وہی واقعہ سنایا جو نصرت پروین سنا چکی تھی۔ میں نے نصرت پروین اور نذیر مسیح کو زیر دفعہ 302/34 تعزیرات پاکستان اور نصرت کے والدین کو اعانت جرم 109 تعزیرات پاکستان کے تحت مورخہ 10 مارچ 1981ء کو چالان عدالت میں بھجوا دیا۔ عدالت نے نصرت پروین نرس اور نذیر مسیح کو سزائے موت سنائی اور احمد حسن اور اس کی بیوی کو بری کر دیا۔ نصرت پروین اور نذیر مسیح کی تمام اپیلیں خارج ہو گئیں اور وہ دونوں پھانسی لگ گئے۔



احمد خان چدھڑ کے والد مرحوم حاجی مہر خان



احمد خان چدھڑ جنرل صدر ضیا الحق صدر پاکستان سے اپنے والد مرحوم کا تمغہ شجاعت وصول کر رہے ہیں

بیٹے کے فرض پر باپ قربان



1981ء

راقم الحروف اس اندوہناک اور کربناک واقعہ کو تحریر میں لانے کیلئے بار بار سوچتا رہا کیوں کہ اس واقعہ کو تحریر کرنے کیلئے نہ تو دماغ ساتھ دے رہا ہے اور نہ قلم میں طاقت ہے۔ بہر حال ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کیا ہے اور قلم اٹھانے کی ہمت کی ہے۔ یہ ایک ایسا دلخراش واقعہ ہے جس کے نقوش ان مٹ ہیں۔

نومبر 1981ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں گوجرانوالہ میں سی آئی اے انسپکٹر کے عہدہ پر تعینات تھا۔ میجر مشتاق احمد صاحب گوجرانوالہ کے ایس ایس پی تھے۔ مجھے انہوں نے دفتر میں طلب کر کے بتایا کہ تحصیل حافظ آباد کے کچھ معززین کا ایک وفد انسپکٹر جنرل آف پولیس پنجاب لاہور کے پیش ہوا کہ ان کے علاقہ میں حسینو کھرل جو کہ بدنام قسم کا سینہ زور، سرکش، اجرتی قاتل اور ڈاکو ہے، قتل اور ڈکیتی کے لاتعداد مقدمات میں اشتہاری مجرم قرار دیا جا چکا ہے۔ اس کو گوجرانوالہ پولیس گرفتار نہیں کرتی۔ علاقہ کے لوگ اس سے اتنے خوفزدہ ہو چکے ہیں کہ اس کی دہشت سے ان کی رات کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ مقامی پولیس کے افسر اس سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ اس کو ہاتھ ڈالنے کی جرات نہیں کرتے۔ چنانچہ اس خطرناک اور درندہ صفت مجرم اشتہاری کی گرفتاری پر آپ کو مامور کرتے ہیں۔

ایس ایس پی صاحب گوجرانوالہ نے کہا کہ پولیس کیلئے یہ بات باعث شرم اور باعث بدنامی ہے۔ لہٰذا آپ اسکو چیلنج سمجھ کر اس مجرم کی گرفتاری کیلئے دن رات ایک کر دیں۔ چونکہ میں فیصل آباد سے تبدیل ہو کر تھوڑا ہی عرصہ پہلے گوجرانوالہ تعینات ہوا تھا۔ اس لئے گوجرانوالہ میں کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ پولیس کے ملازمین کا بھی ابھی تک مکمل اعتماد حاصل نہ تھا۔ تاہم میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور ایس ایس پی صاحب سے کہا کہ "آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اس قابل سمجھا ہے، میں انشاء اللہ آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا"۔

میں سیدھا سی آئی اے ہیڈ کوارٹر راہوالی گیا۔ ان دنوں راہوالی میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر تھا اور اس کی ایک شاخ حافظ آباد میں بھی تھی۔ جو ملازمین میری نظر میں کچھ قابل اعتماد تھے ان کو ہمراہ لے کر میں سیدھا حافظ آباد پہنچا۔ نماز ظہر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے نصرت و کامرانی کی دعا کی۔ حافظ

آبادسی آئی اے کے ملازمین میں سے چند ملازمین کا انتخاب کیا۔ وہاں ایک ہیڈ کانسٹیبل محمد اسلم نامی تعینات تھا جو انتہائی محنتی، سمجھدار، اور قابل اعتماد تھا۔ اس کا علاقہ میں بھی کافی اثر ورسوخ تھا۔ اس سے میں نے حسینو ملزم کی گرفتاری کیلئے مشورہ کیا۔ اس نے ایک بڑی اچھی تجویز پیش کی کہ اس مجرم کا ایک شخص مخالف ہے جو میرا واقف کار ہے۔ اس کے باپ کو اس نے تھوڑا عرصہ پہلے قتل کیا ہے۔ اس مقدمہ میں بھی یہ مفرور ہے۔ اس سے اس کی موجودگی کا صحیح پتہ چل جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد محمد اسلم ہیڈ کانسٹیبل اس کو ساتھ لے آیا۔ اس نے اپنا نام رائے شفیع بتایا اور انتہائی غم زدہ لہجہ میں اس نے بتایا کہ صرف دو ماہ ہوئے ہیں کہ اس ظالم شخص نے اس کے بوڑھے باپ کو بندوق کا فائر کر کے قتل کر دیا تھا۔ اب اسے بھی ہر وقت خوف طاری رہتا ہے کہ کہیں وہ اسے بھی قتل نہ کر دے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ ہر ذی روح نے اس کا مزہ چکھنا ہے۔ وہ خوف کو دور کر کے میرا ساتھ دے تو انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے ہاتھ اس ظالم کی گردن تک پہنچ جائیں گے۔ میرے تسلی اور حوصلہ دینے پر اس کے چہرے اور آنکھوں میں نئی چمک آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ میرے اعتماد میں آ گیا ہے۔

''آپ کے ضلع کی آدھی پولیس تو اس کی دوست ہے آپ اس کو خاک پکڑیں گے'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ میں نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ پر مکمل یقین ہے۔ ہم نیک نیتی کے ساتھ محنت کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ضرور ہماری امداد کرے گا اور وہ ظالم ہماری گرفت میں آ جائے گا۔

رائے نے مجھے انتہائی راز داری سے اس خطرناک مجرم کے چند عزیز دوستوں کے نام بتائے کہ اگر ان پر صحیح دباؤ ڈالیں گے تو وہ ضرور اسے پکڑوا دیں گے۔ میں نے سب سے پہلے جلال پور بھٹیاں کے قریب ایک ڈیرہ سے نورا کھرل کو پکڑا جو کہ اس کا قریبی عزیز کا تھا۔ اسے دھمکیاں دیں کہ خطرناک مجرم اشتہاری حسینو کو پناہ دینے کے سلسلہ میں، میں اس کے خلاف مقدمہ درج کرتا ہوں وگرنہ اس کی موجودگی کا انکشاف کرے۔ میں یہ سن کر حیران ہو گیا اس نے کہا کہ ''جناب وہ کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ وہ علانیہ رائفل اٹھائے اِدھر اُدھر پھرتا رہتا ہے۔ کوئی پولیس افسر خوف کے مارے اس کے نزدیک نہیں جاتا، اور اس نے اپنے علاقہ کے تھانہ کے انچارج کو بھینس دودھ کیلئے دی ہوئی ہے اور وہ بھی چوری کی ہے''۔

میں نے اسے کہا کہ وہ صحیح ٹھکانہ بتائے۔ ''موضع سکدے میں گامی رانجھہ کی لڑکی کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ہے۔ وہ ہر وقت ان کے گھر رہتا ہے۔'' اس نے بتایا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس

کے پاس ہر وقت رائفل لوڈ ہوتی ہے۔ وہ گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ محتاط انداز میں اس پر چھاپہ مارنا ہے"۔ میرے پاس سرکاری ٹیوٹا وین تھی۔ موضع سکدے دریائے چناب کے عین کنارے پر واقعہ ہے۔ طالب والا پتن سے قریب چار میل کے فاصلہ پر شمال کی طرف واقع ہے۔ نو بجے رات میں نے اپنے ساتھی ملازمین کی مدد سے گامی رانجھہ کے گھر موضع سکدے چھاپہ مارا۔ گامی خود گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک جوان عمر لڑکا امیر گھر میں موجود تھا۔ اس سے حسینو کے متعلق پوچھا تو اس نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ اس کو ساتھ لے کر جانے لگے تو اس کی والدہ نے کہا جناب میرے بیٹے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس حسینو بے غیرت کی بندوق اندر پڑی ہے۔ شام کو وہ ادھر موجود تھا کھانا کھا کر موضع بدین میں مجلس سننے چلا گیا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ موضع بدین پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔

موضع بدین کی نشاندہی کیلئے امیر رانجھ کو ہمراہ لیا۔ حسینو کی دونالی بندوق بھی قبضہ میں لے لی اور موضع بدین کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں گاڑی خراب ہوگئی۔ دو بجے رات ہم بدین پہنچے تو مجلس ختم ہو چکی تھی۔ محرم الحرام کے دن تھے۔ وہاں سے اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ صبح پانچ بجے پھر گامی رانجھہ کے گھر چھاپہ مارا۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ رات کو واپس نہیں آیا۔ شاید وہ ان کے مویشیوں والے ڈیرے پر سو گیا ہو۔ ان کا ڈیرہ گاؤں سے آدھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ امیر کی نشاندہی پر وہاں چھاپہ مارا۔ ان کے ملازم خان مسلم شیخ نے بتایا کہ شام کو حسینو آیا تھا، اس کے پاس کاربین تھی۔ وہ بدین کی طرف چلا گیا پھر واپس نہیں آیا۔ اب ہم نے امیر سے پوچھا کہ اس کا اور ٹھکانہ کونسا ہوسکتا ہے تو اس نے بتایا کہ کڑانہ پہاڑی کے قریب چک 7 جنوبی میں آلواعوان اس کا دوست ہے۔ اس کے پاس بھی وہ اکثر چلا جاتا ہے۔ ہم سیدھے آلواعوان کے ڈیرہ پر گئے۔ آلواعوان کا ملازم ملا جس نے بتایا کہ آلواعوان سرگودھا گیا ہے۔ حسینو چار یا پانچ دن پہلے آیا تھا۔ ایک رات ادھر ٹھہر کر چلا گیا تھا۔ اس نے جاتی دفعہ بتایا تھا کہ وہ چک 90 شمالی ملک دوست محمد کو مل کر واپس چلا جائے گا۔

ہم سیدھے چک 90 شمالی پہنچے۔ ملک دوست محمد ملا۔ آٹھ بجے رات کا وقت ہوگا۔ اس سے حسینو کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ آج دوپہر کو وہ آیا تھا ایک گھنٹہ ٹھہر کر چلا گیا ہے۔ یہ نہیں علم کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ہم نے ملک دوست محمد کے باہر والے ڈیرے کی تلاشی لی۔ دو بجے رات تک خفیہ طور پر ادھر ادھر پتہ کروایا لیکن کوئی پتہ نہ چل سکا۔ بظاہر تو وہ دوست محمد ہماری معاونت کر رہا تھا

لیکن اس کی نیت کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہاں سے 2 بجے رات ہم روانہ ہوئے اور چھ بجے صبح پھر گامی رانجھ کے گھر سکدے پہنچے۔

کیونکہ ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ گامی رانجھ کے گھر دو تین روز میں ایک چکر ضرور لگاتا ہے۔ وہاں گامی رانجھ کی بیوی نے بتلایا کہ آپ کے جانے کے بعد وہ ''کنجر'' آیا تھا۔ لیکن پولیس کے آنے کی خبر سن کر وہ فوراً ہی چلا گیا۔ اس سوال کے جواب میں کہ تم نے اسے اندر بند کر لینا تھا تو اس نے جواب دیا کہ جناب اس کے خوف سے تو پولیس اس کے نزدیک نہیں جاتی ہم غریب اسے کیسے بند کر سکتے ہیں۔ اس نے خاکی رنگ کی چادر قمیض پہنی ہوئی تھی اوپر کالا کمبل لیا ہوا تھا۔'' دن کو ادھر ادھر تلاش کیا۔ چار روز سے مسلسل رات دن اس کی تلاش میں تھے۔ وردیاں گرد و غبار سے خراب ہو چکی تھیں اور مسلسل جاگنے کی وجہ سے آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔

آٹھ بجے رات ہم طالب والا پتن کے قریب ایک واقف کار کے ڈیرہ پر آئے۔ تھکاوٹ سے حالت غیر ہو چکی تھی۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور سو گئے۔ صبح آٹھ بجے تیاری کر کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وائرلیس سیٹ آن کیا تو وائرلیس چل رہی تھی کہ ''ہم رات سے احمد خان انسپکٹر سی آئی اے گوجرانولہ کو تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن اس کی موجودگی کا کوئی پتہ نہیں چل رہا''۔ میں وائرلیس سن کر پریشان ہو گیا اور کنٹرول سے رابطہ کر کے پوچھا'' ہم رات سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کے والد حاجی مہر خان کو مسجد کے اندر کسی نے فائر کر کے شہید کر دیا ہے۔ فوراً گاؤں پہنچیں'' وائرلیس آپریٹر نے پنڈی بھٹیاں کنٹرول سے جواب دیا۔

اس روز نومبر کی 11 تاریخ تھی۔ اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ ایسے حالات میں ایک انسان کی کیا کیفیت ہو گی۔ یہاں سے ہمارا گاؤں تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہم سیدھے گاؤں پہنچے۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ والد صاحب کی میت پوسٹ مارٹم کیلئے سول ہسپتال سرگودھا بھجوائی جا چکی تھی۔ تھانہ سلانوالی کا انچارج انسپکٹر بمعہ اپنی فورس کے پہنچ چکا تھا۔

میرے بھانجے محمد اسلم نے بتایا کہ کل عصر کے قریب ایک شخص جس نے خاکی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی اور اوپر کالا کمبل اوڑھا ہوا تھا، ہمارے ڈیرہ پر آیا۔ اس نے کہا اس کے سر میں شدید درد ہے جس پر اس نے اسے اسپرو کی گولی لا کر دی اور دودھ بھی پلایا۔ دودھ پینے کے بعد اس نے پوچھا کہ چوہدری احمد خان انسپکٹر سی آئی اے گوجرانوالہ کے والد صاحب کو ملنا ہے۔ حاجی صاحب اس وقت دوسرے گاؤں میں کچھ لوگوں کی صلح کروانے گئے ہوئے تھے۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ شام



تک آ جائیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو حاجی صاحب آ گئے۔ مغرب کی نماز انہوں نے ملحقہ مسجد جو کہ انہوں نے خود بنوائی تھی میں ادا کی۔ وہاں حاجی اللہ بخش دھوبی نے بھی نماز ادا کی۔ حاجی اللہ بخش نے بتایا کہ حاجی صاحب نے اور اس نے مسجد میں اکٹھے نماز مغرب پڑھی۔ باقی نمازی چلے گئے۔ حاجی صاحب تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص جس نے خاکی رنگ کی قمیض پہنی ہوئی تھی اور اوپر کالا کمبل اوڑھا ہوا تھا حاجی صاحب کے پاس مسجد کے اندر بیٹھ گیا اور حاجی صاحب کو کہا کہ آپ کا بیٹا احمد خان انسپکٹر مجھے تنگ کر رہا ہے۔ اس کے نام رقعہ سفارشی لکھ کر دیں۔ حاجی صاحب اسے کہہ رہے تھے کہ وہ ڈیرے پر چلے وہ وہاں آ کر اس کی تفصیل کے ساتھ بات سنتے ہیں۔ لیکن وہ مسجد کے اندر ہی رقعہ لینے پر بضد تھا۔ حاجی اللہ بخش نے مزید بتایا کہ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ حاجی صاحب اور وہ شخص مسجد کے اندر ہی موجود تھے۔ قریب سو گز مسجد سے دور گیا ہوگا کہ مسجد کی طرف سے فائر کی آواز سنی۔ لوگ دوڑ کر گئے تو معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کو کوئی شخص فائر کر کے زخمی کر گیا ہے۔ ہم نے حاجی صاحب کو مسجد سے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ اس وقت وہ بالکل ہوش و حواس میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جو شخص رقعہ لینے آیا تھا اس نے ان پر فائر کیا ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد حاجی صاحب فوت ہو گئے۔

پتہ چلا کہ گاؤں کے کچھ لوگوں نے اُسے دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ لوگوں نے اس کا کھوج روانہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں سے پانچ میل دور جہانیاں شاہ کے قریب سرگودھا جھنگ روڈ پر پہنچا اور سرگودھا کی طرف جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

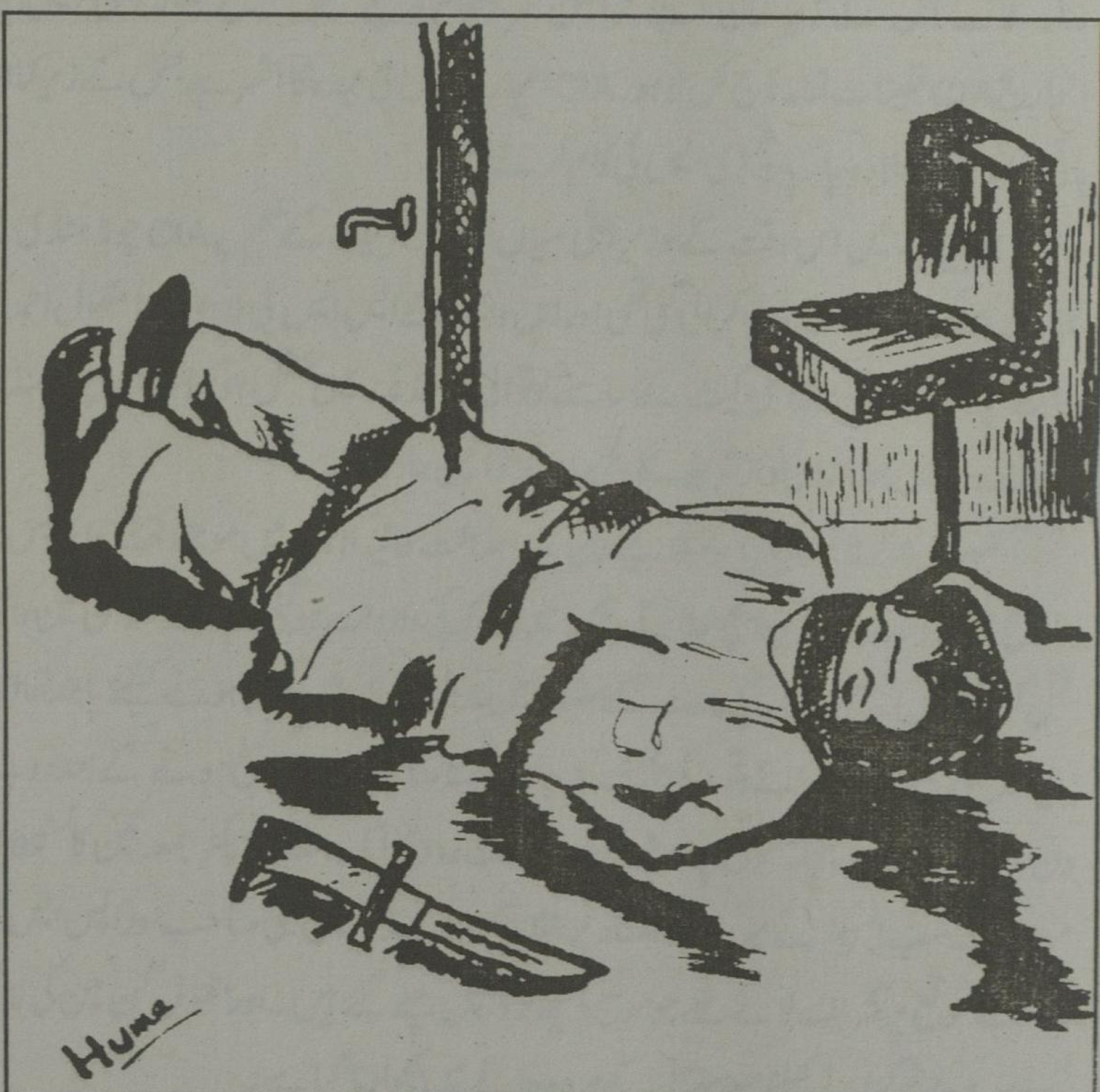
میں نے جب یہ سارا واقعہ سنا تو مجھے یقین ہو گیا کہ حسینو کھرل ہی ہو سکتا ہے جس کی گرفتاری کا چیلنج میں نے قبول کیا ہوا ہے۔

پولیس نے درست سمت تفتیش کی۔ حسینو کھرل کی گرفتاری کیلئے سرگودھا پولیس کی ایک سپیشل ٹیم تشکیل دی گئی۔ پولیس کی سپیشل ٹیم نے دو ماہ کی تگ و دو کے بعد اس کو کلر کہار کے علاقہ سے گرفتار کر لیا۔

مقدمہ کی سماعت سپیشل ملٹری کورٹ سرگودھا میں ہوئی۔ عدالت نے تھوڑے ہی عرصہ میں سماعت مکمل کر کے اس ملزم کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ بعد میں جب اس کی رحم کی اپیل صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے پاس پیش ہوئی تو انہوں نے بہ یک قلم اس کی رحم کی اپیل خارج کر دی اور والد صاحب حاجی مہر خان کو تمغہ شجاعت دینے کا اعلان کیا جو بعد میں 23 مارچ 1985ء کو

راقم الحروف نے پریذیڈنسی ہاؤس میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھ سے وصول کیا۔

خونیں بینک ڈاکہ



1986ء

1986ء میں CIA لاہور کا ہیڈکوارٹر چونا منڈی تھا۔ یہ ایک تاریخی بلڈنگ جو حویلی دھیان سنگھ کے نام سے مشہور تھی میں واقع تھا۔ یہ حویلی تقریباً 15 ایکڑ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی جس کا مین گیٹ شمال کی طرف تھا۔ سامنے سے ایک راستہ مستی گیٹ کی طرف اور دوسرا شیرانوالہ گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ حویلی کے اندر باقی عمارت کے علاوہ ایک تہہ خانہ بھی تھا اور حویلی کے درمیان میں کھلا صحن تھا۔ ان دنوں CIA کا انچارج ڈی ایس پی عہدہ کا پولیس افسر ہوتا تھا۔ اور باقی انسپکٹر، سب انسپکٹر اور دیگر سٹاف اس کے زیر کمان اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ میں بطور ڈی ایس پی انچارج CIA تعینات تھا۔ آج کل لاہور CIA انچارج ایس پی عہدہ کا افسر ہے جس کے زیر کمان باقی سٹاف کے علاوہ چار پانچ ڈی ایس پی کام کرتے ہیں۔

1986ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ میاں محمد نواز شریف کے حکم پر CIA چونا منڈی کی عمارت CIA سٹاف سے خالی کرالی گئی تھی اور اس وقت کے ایس ایس پی لاہور رانا مقبول احمد کی ہدایت پر CIA ہیڈکوارٹر دہلی گیٹ کے سامنے کوتوالی کی بلڈنگ میں منتقل ہوگیا تھا اور چونا منڈی والی عمارت میں بعد ازاں نواز شریف کالج برائے خواتین بنادیا گیا۔

مورخہ 4 جولائی 1986ء کو 9 بجے دن میں عدالت عالیہ لاہور میں موجود تھا۔ وائرلیس پر اطلاع ملی کہ وحدت روڈ پر واقع یونائیٹڈ بینک میں ڈاکہ کی واردات ہوگئی ہے اور ڈاکو گن مین کو بھی قتل کر گئے ہیں۔ میں چونکہ ایک رٹ کے سلسلہ میں عدالت عالیہ میں پیش ہونے کیلئے پابند تھا اس لیے میں فوری طور پر تو جائے وقوعہ کی طرف نہ جاسکا البتہ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد دو بجے دن جائے وقوعہ پر پہنچا۔ موقع پر صرف تھانہ وحدت روڈ کا ایک سب انسپکٹر بمعہ تین کانسٹیبلان موجود تھا۔ سب انسپکٹر نے میرے استفسار پر بتلایا کہ جناب ڈی آئی جی صاحب اور ایس ایس پی صاحب موقع پر تشریف لائے تھے جو موقع دیکھ کر واپس چلے گئے ہیں۔ اور مقتول گن مین کی لاش کو پوسٹ مارٹم کرانے کیلئے میو ہسپتال کے مردہ خانے میں بھجوادیا گیا ہے۔

میں نے موقع کا بغور ملاحظہ کیا جائے وقوعہ پر گرا پڑا مقتول کا خون فرش دھو کر صاف کیا جاچکا تھا۔ بینک منیجر شاہ صاحب نے بتلایا کہ تقریباً آٹھ بجے صبح بینک کا سٹاف ڈیوٹی کیلئے آیا تو دیکھا

کہ بینک کے گیٹ کو اندر سے تالا لگا ہوا ہے اور گن مین جس کی رات کو ڈیوٹی تھی غائب ہے۔ کافی آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملنے پر گیٹ کا تالا توڑ کر اندر گئے تو دیکھا کہ تہہ خانہ سٹرانگ روم میں محمد علی گن مین کی لاش پڑی ہے اور سٹرانگ روم میں پڑے ہوئے لاکرز ٹوٹے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب نے مزید بتلایا کہ مقتول کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف شلوار کے آزار بند سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ اُس کی چھاتی اور پیٹ پر تیز دھار آلہ کے متعدد زخم تھے اور لاش کے پاس خون آلود چھرا پڑا ہوا تھا۔ لاش پولیس نے پوسٹ مارٹم کرانے کیلئے ہسپتال بھجوادی ہے اور چھرا خون آلود اٹھا کر ساتھ لے گئے ہیں۔ اور ملزمان کے فنگر پرنٹس بھی پولیس نے محفوظ کر لیے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ دیوار میں سے ایک ایگزاسٹ فین باہر نکلا پڑا ہے اور ایگزاسٹ فین والی جگہ سوراخ قابل گزر انسان ہے۔ میں انتہائی باریک بینی کے ساتھ موقع دیکھ کر بینک منیجر کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے دریافت کیا کہ لاکرز سے کتنا نقصان ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ لاکرز کو چیک کرنے کے بعد ہی نقصان کی صحیح صورت حال بتلا سکیں گے۔ لیکن اندازہ ہے کہ ایک کروڑ سے زیادہ مالیت کے زیورات ہیرے اور پرائز بانڈ ملزمان لے گئے ہوں گے۔ موقع دیکھنے اور حالات سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گن مین کے قریبی واقف کار اور قابل اعتماد آدمی رات کو اس کے پاس بطور مہمان آئے ہیں اور ان لوگوں نے یہ واردات کی ہے۔

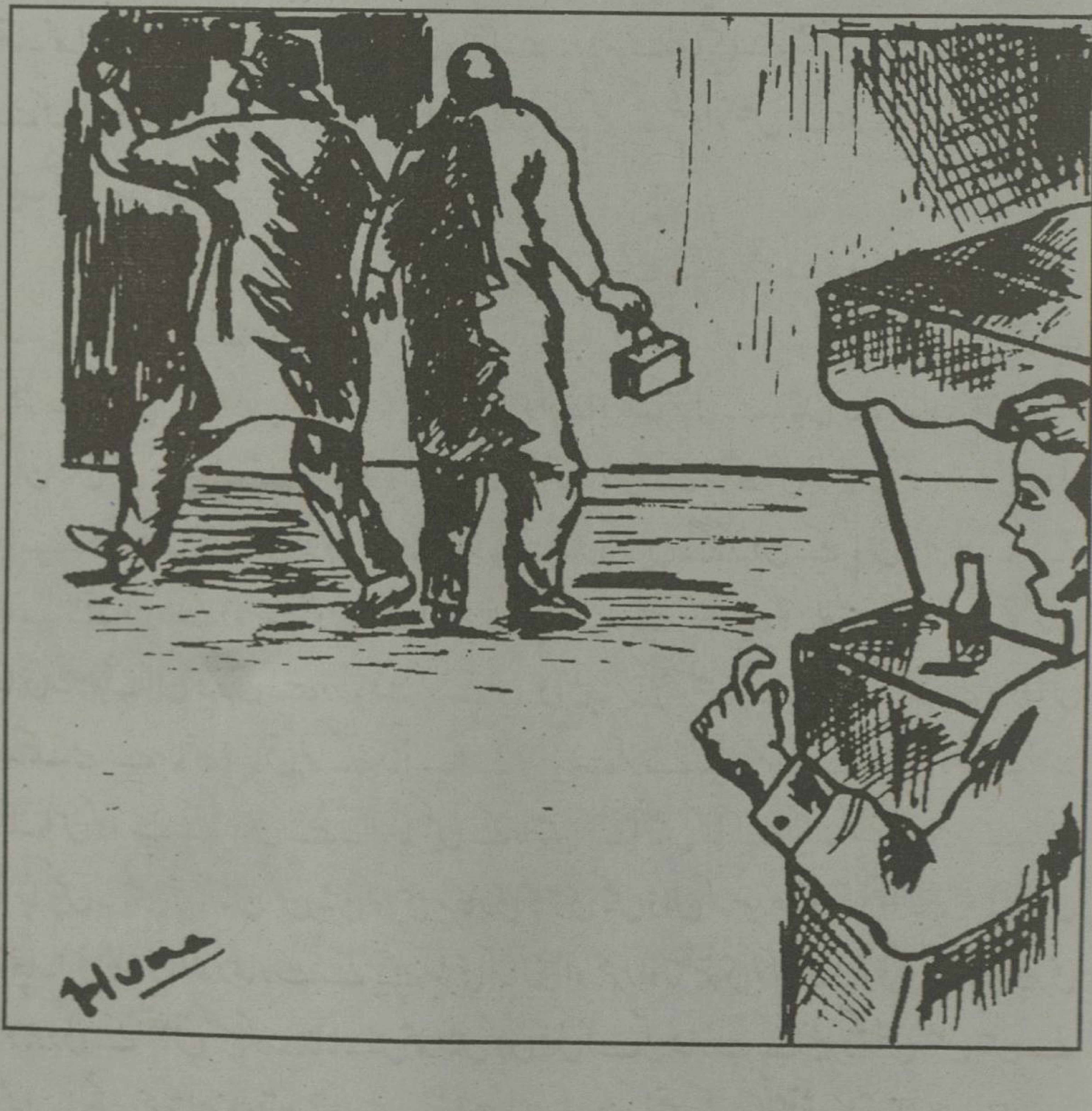
میں نے بینک منیجر شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ محمد علی مقتول کے علاوہ اور کتنے گن مین ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دو اور گن مین ہیں۔ ایک کا نام نور محمد اور دوسرے کا نام محمد امین ہے۔ باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں۔ اب بینک کا تمام عملہ حسب معمول اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام میں مصروف تھا۔ میں نے بینک منیجر شاہ صاحب سے پوچھا کہ باقی گن مین کہاں ہیں تو شاہ صاحب نے دونوں کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ نور محمد گن اٹھائے ڈیوٹی دے رہا ہے اور محمد امین وہ سامنے کیشئر کے پاس کھڑا ہے جس نے سفید رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی ہے۔ میں نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ بغور دیکھا نور محمد جو گن اٹھائے ہوئے کھڑا تھا اس کا چہرہ پر سکون تھا اور یکسوئی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔

میں نے کچھ دیر اپنی نظر اس پر فوکس رکھی لیکن میں جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اس میں کچھ نہیں۔ اب میں نے چور نظر سے گن مین محمد امین کی نگرانی شروع کر دی۔ شاہ صاحب نے چائے


Huma

منگوائی۔ میں آہستہ آہستہ چائے پینے لگا اور محمد امین کی حرکات نوٹ کرتا رہا۔ نئی اور تازی استری شدہ سفید کاٹن کی شلوار قمیض میں ملبوس سڈول جسم جوان عمر پھرتیلا جسم بے چینی کے عالم میں کبھی ایک کلرک کے پاس کبھی دوسرے کلرک کے پاس یونہی جا کر باتیں شروع کر دیتا۔ اس کی حرکات و سکنات مجھے انتہائی مشکوک لگ رہی تھیں۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کے بہانے شاہ صاحب کو کہہ کر اپنے پاس بلوایا۔ اس سے اس کا نام اور پتہ پوچھا۔ پھر سوال کیا کہ اس بینک میں کتنے عرصہ سے تعینات ہو اور اس سے پہلے کون سے بینک میں کتنے عرصہ تعینات رہے ہو۔ اب میں اس سے باتیں بھی کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی فیس ریڈنگ بھی کر رہا تھا۔ اس کے چہرہ اور آنکھوں سے شب بیداری صاف نظر آ رہی تھی اور بناوٹ اس کی ہر ادا سے واضح تھی۔ میری ایک خاص حس جو عام طور پر تفتیشوں میں میری معاون ثابت ہوتی ہے مجھے بار بار سٹرائیک کر رہی تھی کہ بینک کے تمام عملہ میں واحد یہ شخص ہے جس کو شامل تفتیش کیا جانا ضروری ہے۔ میں نے بینک منیجر شاہ صاحب کو بتایا کہ محمد امین سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس کو ہمراہ لے جا رہا ہوں۔ اپنے گن مین کو کہا کہ محمد امین کو گاڑی میں بٹھالو۔ جب محمد امین کو گاڑی میں بٹھالیا گیا تو بینک ایمپلائز یونین کا صدر اور جنرل سیکرٹری جو پہلے سے بینک میں پہنچ چکے تھے نے میرے پاس آ کر کہا کہ گن مین محمد امین سے آپ نے جو دریافت کرنا ہے ادھر ہی کر لیں کیونکہ ساتھ لے جانے سے بینک ملازمین میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ میں نے کہا کہ مقتول کی لاش کا پوسٹ مارٹم میو ہسپتال میں ہو رہا ہے۔ اس کے وارثان وہاں موجود ہوں گے۔ ان سب سے وہاں پوچھ گچھ کریں گے۔

بینک کے اردگرد کے دکانداروں سے دریافت کے دوران ایک خاص بات میرے علم میں آئی کہ 9 بجے رات محمد امین گن مین اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ دونوں بینک کے گیٹ پر آئے۔ انہوں نے بینک کا دروازہ کھٹکھٹایا مقتول گن مین نے دروازہ کھولا اور یہ دونوں اندر چلے گئے۔ جب اس کے متعلق میں نے محمد امین سے دریافت کیا کہ وہ کل شام کے بعد بینک میں آیا تھا۔ یا نہیں تو اس نے بتایا کہ کل 4 بجے شام وہ بینک سے چھٹی کر کے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر آج صبح ساڑھے نو بجے دن واپس بینک میں ڈیوٹی پر آیا ہے۔ مجھے جس دکاندار سے اطلاع ملی تھی کہ 9 بجے رات یہ اور اس کے ساتھ اور ایک ساتھی بینک میں داخل ہوئے تھے سے پھر علیحدگی میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ جناب میں قرآن شریف اٹھا کر کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے ان دونوں



کو بینک میں داخل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ گیارہ بجے رات تک یہ بینک سے باہر نہیں گئے تھے۔ اس کے بعد وہ دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔ اسے یہ علم نہیں ہے یہ پھر بینک سے باہر کس وقت گئے تھے۔

میں نے اس دکاندار کو اپنے اعتماد میں لیا اور اس سے دوسرے شخص کا حلیہ پوچھا تو اس نے بتلایا کہ رات کا وقت تھا۔ اس جگہ کا اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ سے اس نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ محمد امین کو تو وہ پہلے سے اچھی طرح جانتا ہے۔ دوسرے ساتھی کے متعلق وہ صرف اتنا بتا سکتا ہے کہ اس کا قد لمبا اور جسم پھرتیلا تھا۔ ملیشیا رنگ کے کپڑے شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔

اب میرا شک یقین میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے ہر قیمت پر اسے ہمراہ لے جانا تھا۔ بینک یونین کے صدر نے کہا کہ جناب اصل ڈاکو جو واردات کرتے ہیں وہ تو پولیس سے پکڑے نہیں جاتے اور بینک ملازمین کو پولیس خواہ مخواہ تنگ کرتی ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ جو گن مین قتل ہو گیا ہے وہ بھی تو بینک کا ملازم تھا۔ اس کے ساتھ بھی تو آپ کو ہمدردی ہونی چاہیے۔ اور جب تک ان لوگوں سے ہم دریافت نہیں کریں گے کہ ان کے پاس کون لوگ آتے جاتے تھے، ان کے دوست کون تھے، اتنے تک پولیس کو کیسے پتہ چلے گا۔ پولیس علم الغیب تو نہیں جانتی۔ صرف ان لوگوں سے دریافت کر کے ہی کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ میرے سمجھانے پر وہ اس حد تک میرے ساتھ اتفاق کر گئے کہ آپ اسے دریافت کرنے کیلئے ہمراہ لے جائیں وہ ایک گھنٹہ تک اس کو آپ کے پاس سے لے جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ ایک گھنٹہ تک میرے پاس آ جائیں۔ میں محمد امین گن مین کو اپنی سرکاری گاڑی میں ڈال کر سیدھا سی آئی اے چونا منڈی پہنچا۔ اپنی گاڑی اندر عمارت کے پیچھے کھڑی کرا دی اور محرر اور سنتری کو کہا کہ سی آئی اے میں میری موجودگی کے متعلق کسی کو نہ بتانا۔ میں محمد امین کو سی آئی اے کی عمارت کے انٹیروگیشن سیل میں لے گیا۔ پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی چند باتیں کر کے تفتیش کا آغاز اس نقطہ سے کیا کہ کل شام کو یا شام کے بعد تم بینک میں آئے تھے یا نہیں۔ اس پر محمد امین نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ یہ شخص کل 9 بجے رات بینک میں آیا تھا اور اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص دیدہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور جھوٹ بولنے کی وجہ محض یہ ہے کہ یہ واردات میں ملوث ہے۔ میں نے اپنے یقین کی تائید کیلئے فوری طور پر ٹیلی فون کے ذریعہ انچارج فنگر پرنٹ بیورو کو بلوایا۔ مجھے جائے وقوعہ پر بتایا گیا تھا کہ لاکرز پر


Huma

مجرمان کے نشانات انگشت پائے گئے تھے جو لفٹ کر کے فنگر پرنٹ بیورو کے آفس میں بھجوائے جا چکے ہیں۔ انچارج فنگر پرنٹ بیورو کو میں نے ہدایت کی کہ محمد امین کا سرچ سلپ تیار کر کے لاکرز پر سے لفٹ کیے گئے نشانات انگشت کے ساتھ موازنہ کیا جائے۔ انہوں نے سرچ سلپ تیار کیا اور مجھے کہا کہ وہ اپنے دفتر جا کر چیک کر کے رپورٹ پیش کرتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد انچارج فنگر پرنٹ بیورو میرے پاس آیا جس نے مبارک دیتے ہوئے بتایا کہ لاکرز پر سے اٹھائے گئے نشانات انگشت میں سے تین نشانات کا محمد امین کے نشانات انگشت کے ساتھ موازنہ ہو گیا ہے جو یکساں طور پر مطابقت کر رہے ہیں۔ اب میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب تک واردات تسلیم کر کے مکمل طور پر انکشاف نہ کرتا تب تک سوائے ناکامی کے اور کچھ نہ تھا۔ تقریباً 9 بجے رات اس کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اور دو کلو دودھ پلا کر اعتماد میں لینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن چونکہ کروڑ روپیہ سے زیادہ مالیت کا مال اس کے پاس تھا وہ آسانی سے کیسے تسلیم کرتا۔ میں نے اس سے انٹیروگیشن جاری رکھی۔ تمام تفتیشی حربے استعمال کیے اور تمام تفتیشی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تفتیش کے دوران جب ہر بات پر اسے جھوٹا ثابت کیا تو پانچ بجے صبح تک اسے یقین ہو گیا کہ اب ماسوائے سچ بتانے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس نے تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کی اور سوچنا شروع کر دیا۔ پھر اچانک مجھے کہنے لگا کہ صاحب جی! آپ کلمہ پڑھیں۔ میں نے کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھا۔ میں نے کلمہ ختم کیا تھا کہ اس نے دو مرتبہ کلمہ پڑھا اور ساتھ ہی کہا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا تو اس کلمہ کی اسے مار پڑے۔ آپ رعایت کریں یا نہ کریں یہ واردات اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کی ہے۔ اور واقعہ بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ میں ایک سال سے بینک میں بطور گن مین ملازم ہوں۔ میری نیت خراب ہوگئی اور سوچا کہ بینک کے لاکرز توڑ کر سب کچھ نکال کر غائب کر دوں گا اور صبح خود ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کو ضلع مانسہرہ کے گاؤں سے بلوایا اور اس کے ساتھ واردات کا پروگرام بنایا۔ واردات سے پانچ روز پیشتر اچھرہ کے علاقہ میں ایک بیوہ مائی سے مکان پانچ ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لیا۔ پروگرام یہ تھا کہ دوسرے گن مین کو قتل کر کے رات کو سارے لاکرز توڑ کر سامان نکال کر اس مکان میں رکھ دیں گے۔ اور چند دنوں کے بعد جب خاموشی ہو جائے گی تو وہاں سے مال نکال کر آئندہ ٹھکانے لگائیں گے۔ ہم نے دو جوس کے پیکٹ لیے اور ان میں خواب آور گولیاں ملائیں اور نو بجے رات بینک گئے۔ آواز دی تو محمد علی گن مین نے مجھے پہچان کر بینک کا دروازہ کھولا۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ اس سے پہلے بھی ہم اکٹھے رات کو گپ شپ لگاتے تھے۔ محمد علی کو کہا کہ گرمی بہت



زیادہ ہے تمہارے لیے جوس لائے ہیں۔ اور ساتھ ہی پیکٹ پیش کیا۔ محمد علی نے فوراً جوس غٹاغٹ پی لیا اور ساتھ ہی دوسرا پیکٹ پیش کیا تو اس نے کہا کہ یہ تم پی لو۔ ہم نے کہا کہ باہر پی کر آئے ہیں یہ صرف تمہارے لیے ہے۔ دوسرا پیکٹ بھی اس نے پی لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ میں نے چھرا کے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ بعد میں دونوں بھائیوں نے لاکرز توڑے، زیورات، نقدی اور پرائز بانڈ کی دو گٹھڑیاں باندھ کر اچھرہ والے مکان میں لے گئے۔ وہاں اذان کے وقت پہنچے۔ مکان کے ایک کمرہ کے اندر پڑی ہوئی چارپائی کے نیچے گٹھڑیاں رکھ دیں۔ بھائی کو گاؤں بھیج دیا اور خود صبح نئے کپڑے پہن کر بینک میں آ گیا۔ ملزم نے مکان کی نشاندہی کی۔ تالا کھول کر اندر گئے تو چارپائی کے نیچے دو گٹھڑیاں پڑی تھیں۔

دونوں گٹھڑیوں کو قبضہ میں لے کر گاڑی میں رکھ لیں اور خود نگرانی کر کے تمام مال سی آئی اے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ بینک کے سینئر افسران کو بھی بلا لیا۔ بینک کے افسران نے مال کی پڑتال کی تو تمام مال اصلی حالت میں موجود پایا۔ اس میں ایک انگوٹھی بھی غائب نہیں تھی۔ زیورات کی شکل میں سونا ستائیس کلو وزنی تھا۔ پندرہ لاکھ روپے کے پرائز بانڈ اور دس لاکھ نقد تھا۔ محمد امین ملزم کو چالان عدالت کیا۔ دوسرا بھائی مفرور ہو گیا۔ جو بعد میں گرفتار ہوا۔ یونائیٹڈ بینک کی انتظامیہ نے جناب انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ذریعہ مجھے دو لاکھ روپے نقد انعام دیا۔ بینک کے افسران زیادہ اس بات پر خوش تھے کہ ان کے مال میں پولیس نے رتی بھر بھی خیانت نہیں کی۔



جناب نثار احمد چیمہ انسپکٹر (جنرل پولیس) احمد خان چدھڑ ڈی ایس پی اور ان کے سٹاف کو بینک ڈکیتی ٹریس کرنے پر انعام دے رہے ہیں۔

عزتوں کے لٹیرے



1987ء

میں ڈاکوؤں کے ایسے گروہ کی تفصیل سے قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو نہ صرف مال، زیورات، نقدی لوٹتے تھے بلکہ معزز خاندانوں کی عفت اور عصمت پر بھی ڈاکے ڈالتے تھے۔ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ گاڑی میں سوار ہو کر پوش ایریا، گلبرگ، ماڈل ٹاؤن اور شادمان میں رات کو پھرتے رہتے۔ جس گھر میں شادی کا فنکشن ہوتا، وہاں لائٹنگ وغیرہ ہونے کی وجہ سے اندازہ لگا کر اس گھر کی ریکی کرتے رہتے۔ رات ڈھلے جب نوجوان لڑکیاں فنکشن سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو واپس جانے لگتیں تو یہ لٹیرے راستہ میں اپنی گاڑی ان کی گاڑی کے آگے کھڑی کر کے روک لیتے اور ان کو اپنی گاڑی میں زبردستی اسلحہ دکھا کر بٹھا لیتے۔ ان کی گاڑی اور ڈرائیور کو بھی زبردستی اپنے ہمراہ لے جاتے۔ راستہ میں لڑکیوں اور ڈرائیور کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے اور باغبانپورہ کے علاقہ میں ایک سکول کی عمارت میں لے جا کر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ باری باری زبردستی زنا کرتے۔ اس کے بعد ان کے زیورات وغیرہ اتار کر پھر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر شہر کے کسی حصہ میں لے جا کر گاڑی سے اتار دیتے۔ ان کے ڈرائیور کو علیحدہ کسی دیگر مقام پر چھوڑ کر ان کی گاڑی لاوارث چھوڑ کر خود غائب ہو جاتے۔ اس طرح سے انہوں نے کئی معزز گھرانوں کی نوجوان لڑکیوں کے زیورات اور عزتیں لوٹیں۔

سردیوں کا موسم تھا نومبر، دسمبر 1987ء اور جنوری 1988ء میں ان درندہ صفت ڈاکوؤں کے گروہ نے لاہور میں اس طرح کھلبلی مچا دی اور لوگوں میں اس قدر خوف و ہراس پھیل گیا کہ رات کو نوجوان لڑکیوں نے گھروں سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ان دنوں رانا مقبول احمد لاہور پولیس کے سربراہ تھے۔ اس قسم کی ہر واردات کے بعد فوری طور پر میٹنگ کال کرتے اور لاہور پولیس کو مناسب ہدایات دے کر الرٹ کرتے۔

جنوری 1988ء کی ایک شدید سرد رات کو اس گروہ نے شادمان کے ایک انتہائی معزز خاندان کی چار لڑکیوں کو شادی کے فنکشن سے فارغ ہو کر گھر جاتے ہوئے دو بجے رات اغوا کر لیا۔ اسلحہ دکھا کر زبردستی ان کے ساتھ زنا کیا۔ ان کے زیورات اتارنے کے بعد مغل پورہ پل کے قریب چھوڑ دیا۔ اس واردات کی خبر ملکی پریس میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ پہلے بھی اس گروہ

کی خبریں مسلسل آرہی تھیں۔ لیکن اس واقعہ کی خبر نے لاہور میں سنسنی پھیلا دی۔ لاہور شہر کے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ٹریفک بلاک کردی اور احتجاج کیا کہ ملزمان کو جلد از جلد ٹریس کر کے گرفتار کیا جائے۔ اس وقت کے انسپکٹر جنرل آف پولیس چوہدری نثار احمد چیمہ صاحب نے تھانہ سول لائن میں ایمرجنسی میٹنگ کال کی، لاہور کے تمام ایس پی اور ڈی ایس پی صاحبان میٹنگ میں شامل ہوئے۔ میں بطور ڈی ایس پی رسی آئی اے کا انچارج تھا اس لئے میں بھی میٹنگ میں شامل ہوا۔ آئی جی صاحب نے میٹنگ میں شامل افسران سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس گروہ کی وارداتوں نے گورنمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ساری بدنامی محکمہ پولیس کے کھاتے میں آرہی ہے۔ شب وروز اپنے جملہ سٹاف کو جگائیں اور اسے ایک چیلنج اور جہاد سمجھ کر ڈاکوؤں کے اس گروہ کی گرفتاری کیلئے کمر بستہ ہو جائیں۔

میٹنگ ختم ہوتے ہی میں سیدھا سی آئی اے سٹاف ہیڈ کوارٹرز پہنچا۔ طریقہ واردات کے مطابق اِس قسم کی تمام وارداتوں کی ایک فہرست مرتب کی۔ اس میں ایک اہم بات جو سامنے آئی وہ انتہائی قابل غور تھی کہ ہر واردات کے بعد ملزمان نے مغل پورہ اور باغبانپورہ کے علاقہ میں گاڑی لاوارث چھوڑی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ملزمان کا ٹھکانہ اسی علاقہ میں ہوسکتا ہے۔ اور اس علاقہ کی مکمل چھان بین کرانے سے ملزمان کو ٹریس کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ میں نے مغل پورہ اور باغبانپورہ کا علاقہ اپنے افسران کو تقسیم کر دیا اور ہدایت کی کہ اس علاقہ کے جملہ مکینوں کے کوائف حاصل کیے جائیں۔ سی آئی اے کے افسران نے اپنے اپنے علاقہ میں گھر گھر کی پڑتال شروع کردی۔ ایک ہفتہ کے بعد پڑتال کرتے کرتے ہمارا ایک افسر سب انسپکٹر عبدالمجید ایک رکشا ڈرائیور کے مکان پر پہنچا۔ رکشا ڈرائیور کے کوائف معلوم کرتے ہوئے طارق رکشا ڈرائیور نے بتلایا کہ اس کے مکان کے دو پورشن ہیں۔ ایک پورشن میں اس نے رہائش رکھی ہوئی ہے اور دوسرا پورشن اس نے کرایہ پر دے رکھا ہے۔ چار یوم ہوئے ہیں کہ کرایہ دار اس کا مکان خالی کر کے چلے گئے ہیں۔ عبدالمجید سب انسپکٹر رکشا ڈرائیور طارق کو میرے پاس سی آئی اے ہیڈ کوارٹر لایا۔ میری دریافت پر رکشا ڈرائیور طارق نے انکشاف کیا کہ عرصہ تین ماہ ہوئے ہیں کہ دو نوجوان لڑکوں نے میرے مکان کا پورشن تین ہزار روپے ماہوار کرایہ پر حاصل کیا تھا جنہوں نے بتلایا تھا کہ وہ باٹا فیکٹری میں ملازم ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے دیگر چار ساتھی بھی وہاں آگئے۔ ان کے پاس دو اٹیچی کیس تھے۔ کمرہ میں ایک دری بچھا کر وہ اس پر سو جاتے۔ اکثر ان کے پاس مہمان لڑکے آتے

رہتے تھے۔ کھانا وغیرہ ہوٹل سے منگوا کر کھاتے۔ چند یوم ہوئے کہ اس کو ان کی حرکات مشکوک لگیں۔ یہ ان سے کرایہ لینے کیلئے گیا۔ دری پر بیٹھا تو اسے نیچے کوئی سخت چیز پڑی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دری کا کونا اٹھا کر دیکھا تو نیچے دو پستول پڑے ہوئے تھے۔ ان نوجوان لڑکوں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ تم ان کی تلاشی لینے آئے ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے تلاشی لینے کی کیا ضرورت ہے مجھے نیچے کوئی سخت چیز لگی تو میں نے دری کو اٹھا کر دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ دو گھنٹہ کے بعد آ کر مکان کا کرایہ لے جائیں۔ جب یہ دو گھنٹہ کے بعد گیا تو دیکھا کہ کمرہ کا دروازہ کھلا ہے اور دونوں جوان معہ اپنے سامان کے رفو چکر ہو چکے ہیں۔ طارق نے مزید بتلایا کہ کل وہ ریگل چوک میں رکشا چلا کر جا رہا تھا کہ ان لڑکوں میں سے دو نوجوان وہاں کھڑے تھے۔ اس نے رکشا روک کر ان سے کرایہ کا مطالبہ کیا۔ وہ کہنے لگے کہ کرایہ کا فکر نہ کریں چند دنوں تک وہ اس کے گھر آ کر کرایہ ادا کریں گے۔ وہ دونوں اس کے رکشا میں سوار ہو گئے اور فردوس مارکیٹ جانے کو کہا۔ فردوس مارکیٹ کے قریب ایک پارک کے کونے پر پہنچے تو رکشا روکنے کیلئے کہا۔ اس نے وہاں رکشا روکا۔ وہ دونوں تیس روپے رکشا کا کرایہ دے کر اتر گئے۔ آج سویرے یہ اپنا رکشا لے کر فردوس مارکیٹ سے گزر رہا تھا تو ان نوجوانوں میں سے ایک کھوکھے سے سگریٹ لے رہا تھا۔ طارق سے میں نے تمام لوگوں کے حلیے تفصیل کے ساتھ پوچھے جو ہمارے مطلوبہ ملزمان کے ساتھ ملتے تھے۔ ملزمان کا دو دن کے اندر ایک ہی علاقہ میں دو مرتبہ دیکھے جانا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ملزمان اس علاقہ میں کہیں رہائش پذیر ہیں۔ دوسرے دن میں نے محمد اسحاق سندھو اور محمد اجمل قریشی انسپکٹر کو ہمراہ لیا۔ وہ باریش اور سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی اور ٹخنوں کے اوپر تک شلوار پہنے ایسے لگ رہے تھے جیسے تبلیغی جماعت کے فرد ہوں۔ میں نے بھی شلوار قمیض پہن لی اور سر پر عربی رومال باندھ لیا۔ ہم دونوں فردوس مارکیٹ کے علاقہ میں چلے گئے۔ وہاں ایک فرضی نام محمد انور چیمہ ایڈووکیٹ کی کوٹھی تلاش کرنے کے بہانے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ہر کوٹھی کے گیٹ پر جاتے، گھنٹی بجاتے، اندر سے جو شخص نکلتا اس سے دریافت کرتے کہ محمد انور چیمہ ایڈووکیٹ کی کوٹھی کس طرف ہے۔ وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔ ہم طریقے سے پوچھ لیتے کہ اس کوٹھی میں کون رہائش پذیر ہیں۔

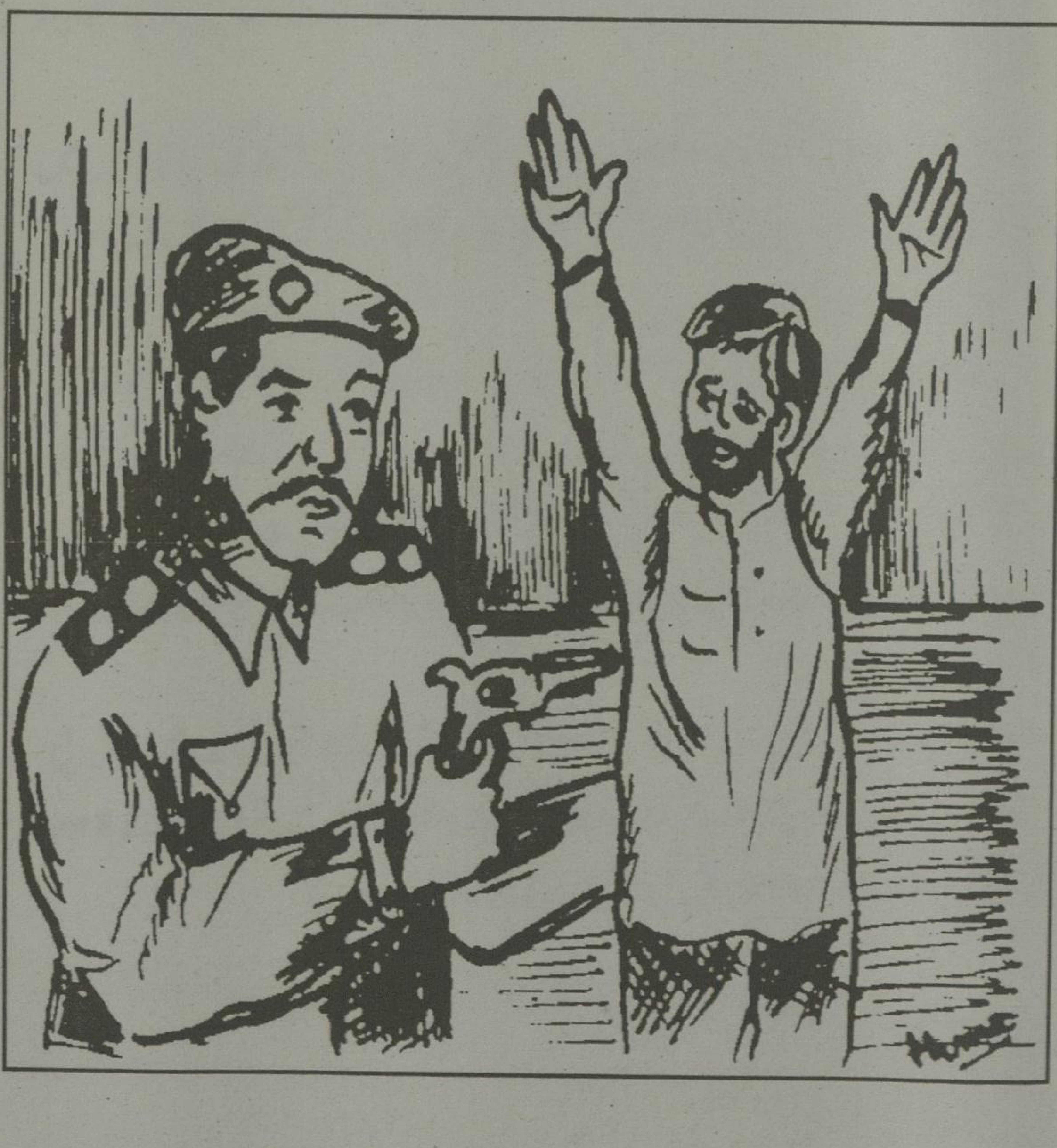
اس طریقہ سے ہم نے پہلے دن تقریباً 150 کوٹھیوں کی پڑتال کی لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح عمل شروع کر دیا۔ تقریباً تین گھنٹے پھرنے کے بعد لبرٹی مارکیٹ سے

فردوس مارکیٹ کو جانے والی سڑک پر واقع کوٹھیوں کی پڑتال کے دوران ایک کوٹھی کے گیٹ پر جا کر گھنٹی دی۔ اندر سے ایک بزرگ سفید ریش شخص باہر آئے۔ ان سے فرضی نام کے متعلق پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور دریافت پر بتلایا کہ اس کوٹھی کے دو پورشن ہیں ایک میں ہم خود رہتے ہیں اور دوسرا پورشن کرایہ پر دے رکھا ہے۔ میرے استفسار پر کہ کب سے اور کن لوگوں کو کرایہ پر دے رکھا ہے تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ تقریباً ایک ہفتہ ہوا ہے کہ اس کے بیٹے نے جو واپڈا میں ملازم ہے پورشن کرایہ پر دیا ہے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے مزید بتلایا کہ کرایہ دار نوجوان لڑکے ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔ رات دن ان کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ اس کوٹھی کے سامنے ایک پارک ہے۔ میں اور محمد اجمل قریشی انسپکٹر پارک میں علیٰحدہ علیٰحدہ بیٹھ گئے اور کوٹھی کے گیٹ کی طرف چور آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ شام کو جب اندھیرا چھا گیا تو سرخ رنگ کی ایک کار کوٹھی کے اندر داخل ہوئی اور تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ کار کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر چلی گئی۔ دو بجے رات پھر وہی کار واپس کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کار میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی تعداد کے متعلق پتہ نہ چل سکا۔ دوسرے دن ہم نے پھر ریکی شروع کر دی اور ایک گاڑی میں باوردی ملازم لبرٹی مارکیٹ کے قریب بٹھا دیئے جن کے انچارج فلک شیر سب انسپکٹر کو وائرلیس سیٹ دے کر الرٹ رہنے کی ہدایت کی۔ میں اور قریشی محمد اجمل انسپکٹر پارک میں کتاب پڑھنے کے بہانے بیٹھے تھے کہ دو بجے دن تین نوجوان لڑکے اس کوٹھی سے نکلے جن کے پاس ایک بڑا اٹیچی کیس تھا جس کو ویل لگے ہوئے تھے۔ وہ اٹیچی کیس کو سڑک پر ویلوں کے سہارے چلاتے ہوئے فردوس مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ ہمارے پاس چھوٹا وائرلیس سیٹ تھا۔ ہم دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ کچھ فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ جب فردوس مارکیٹ ویگن سٹاپ کے قریب پہنچے تو میں نے وائرلیس سیٹ پر فلک شیر سب انسپکٹر جو باوردی فورس کا انچارج تھا کو فوری طور پر فردوس مارکیٹ پہنچنے کی ہدایت کی۔ صرف تین منٹ میں وہ پہنچ گیا۔ اس اثنا میں وہ تینوں لڑکے ایک ویگن میں سوار ہونے لگے تو ہم نے انہیں قابو کر لیا۔ تینوں نے اپنے نام و پتے غلام نبی شہزادہ ساکن داروغہ والا، اظہر گوگی ساکن باغبانپورہ اور نواز عرف بارا ساکن مغل پورہ بتلائے۔ اٹیچی کیس کی تلاشی لینے پر ایک اسٹین گن اور چھ پسٹل اور سینکڑوں گولیاں برآمد ہوئیں۔ ان تینوں کو فوری طور پر سی آئی اے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ وہاں ان سے علیٰحدہ علیٰحدہ انٹیروگیشن کی گئی جنہوں نے تقریباً چالیس ڈاکوں کا انکشاف کیا۔ جن میں وہ

لڑکیوں کو جبراً اغوا کر کے لے جاتے۔ ان کے زیورات اتار کر عزتیں لوٹ لیتے۔ ان تینوں کی نشاندہی پر ان کے دیگر آٹھ ساتھی بھی پکڑے گئے۔ ان کا سرغنہ ارشد بٹ بعد میں ہماری سی آئی اے کی ٹیم کے ساتھ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ لاہور کے ڈاکوؤں کا یہ بہت بڑا گروہ تھا جن کے خاتمے پر لاہور میں امن قائم ہو گیا۔

لوٹے ہوئے زیورات ان سے برآمد کر کے مالکان کو واپس لوٹائے۔ عوام نے اور اخبارات نے سی آئی اے پولیس کی کارکردگی کو بے حد سراہا۔ اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے چیف سیکریٹری پنجاب جناب انور زاہد اور انسپکٹر جنرل آف پولیس جناب نثار احمد چیمہ صاحب کی موجودگی میں 7 کلب روڈ مجھے بلا کر شاباش دی اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد انعام دیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

دارا تے شاھنا



1987ء

قارئین حضرات دارا تے شاہنا کے الفاظ پڑھ کر چند لمحات سوچ میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ کس بلا کے نام ہیں۔ میں ابھی ان کی وضاحت کر دیتا ہوں۔ یہ دونوں ظالم، سفاک، قاتل اور درندہ صفت انسانوں کے نام ہیں جو اپنے علاقہ میں خوف اور دہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ دارا کا اصل نام سردار، شاہنا کا اصل نام شاہ محمد تھا۔ لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ سردار اور شاہ محمد کی بجائے دارا اور شاہنا کے نام سے اپنے علاقہ میں پہچانے جانے لگے۔ یہ دونوں موضع جیابگا تھانہ رائے ونڈ ضلع لاہور کے رہائشی تھے۔ قتل وغارت، ڈاکہ زنی اور ظلم و بربریت میں اپنے علاقہ میں اس قدر خوف اور دہشت کی علامت بن گئے کہ ان کا نام لے کر مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں۔

دارا نے بیس سال قبل اپنے ہی گاؤں کے ایک شخص مراتب علی شاہ کو قتل کیا تھا جس میں اسے عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ سزائے قید کاٹ کر رہائی پر واپس گاؤں میں آ کر مسمی شاہنا کے ساتھ مل کر ڈاکہ زنی اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔

مئی 1987ء میں ان دونوں نے کمشنر آفس لاہور کے ایک کلرک مشتاق کو اغوا کیا اور بعد ازاں اسے قتل کر دیا۔ اس قتل کے مقدمہ میں دونوں مجرم اشتہاری قرار دے گئے اور ان کی گرفتاری پولیس کیلئے چیلنج بن گئی۔ مفروری کے دوران روزانہ کوئی نہ کوئی سنگین واردات کرتے بلکہ اس قدر نڈر اور بے باک ہو چکے تھے کہ جب کوئی واردات کرتے تو وہاں علانیہ کہتے کہ پولیس کو بتا دینا کہ یہ واردات دارا اور شاہنا نے کی۔

ان دنوں میں بطور ڈی ایس پی CIA لاہور کا انچارج تھا اور رانا مقبول احمد ایس ایس پی لاہور تھے۔ جب ان دونوں مجرمان اشتہاری کی سرگرمیاں انتہا کو پہنچ گئیں تو انہوں نے لاہور پولیس کی میٹنگ بلائی اور ان دونوں مجرمان اشتہاری کی گرفتاری پر زور دیا۔



SSP لاہور رانا مقبول احمد پولیس مقابلے کی تفصیلات بتا رہے ہیں۔ ان کے ہمراہ احمد خان چدھڑ CIA DSP بیٹھے ہیں۔



SSP لاہور رانا مقبول احمد پولیس مقابلے میں حصہ لینے والی پولیس پارٹی سے خطاب کر رہے ہیں ہمراہ احمد خان چدھڑ DSP اور خوشنو علی خان کھڑے ہیں۔

میں نے CIA کے افسران کی میٹنگ کی اور ان دونوں مجرمان اشتہاری کا سراغ لگانے کی ہدایت کی۔

چند روز بعد محمد حسین ASI ایک شخص کو ہمراہ لایا اور کہا کہ یہ شخص کوئی ضروری اطلاع دینا چاہتا

ہے۔ میں نے اس شخص کو کرسی پر بٹھایا اور اعتماد میں لے کر کہا کہ وہ جو اطلاع دینا چاہتا ہے بتلائے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا کہ جی میں غریب آدمی ہوں۔ اگر میرے متعلق ان لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری اس یقین دہانی پر کہ اس کی بات کو خفیہ رکھا جائے گا اس نے بتلایا کہ موضع پھلروان سے ایک میل کے فاصلہ پر صدیق پھلروان کا ٹیوب ویل لگا ہوا ہے۔ وہاں رہائش کیلئے ایک کمرہ بھی اس نے بنوایا ہوا ہے۔ وہاں ایک ہفتہ سے دو نا معلوم اشخاص رہ رہے ہیں جو جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے پاس رائفلیں بھی ہوتی ہیں۔ صدیق خود یا اس کا کوئی آدمی صبح شام ان کو وہاں کھانا دے آتے ہیں۔ صدیق بھی جرائم پیشہ آدمی ہے۔ اس شخص نے مزید بتلایا کہ وہ دونوں اشخاص دن کو کمرہ کے اندر رہتے ہیں اور رات کو کمرہ کی چھت پر سوتے ہیں اور گاؤں کی طرف بھی نہیں آتے۔ میں نے اس سے ان کا حلیہ وغیرہ پوچھا تو وہ حلیہ دارا اور شاہنا کے ساتھ ملتا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر کہ ٹیوب ویل کی طرف گاڑی جانے کا راستہ ہے، مذکورہ نے بتلایا کہ ٹیوب ویل سے تقریباً 100 گز کے فاصلہ پر پکی سڑک گزرتی ہے جہاں سے آگے گاؤں میں جانے والی گاڑیاں اور ٹریکٹر گزرتے رہتے ہیں۔ پکی سڑک کے متعلق سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس علاقہ کی ریکی صحیح طریقہ سے ہو جاوے گی۔

میں نے پرائیویٹ گاڑی لی۔ سفید پارچات میں سر پر ٹوپی اور عینک لگا کر بھیس بدلا۔ محمد حسین پہلے ہی سفید کپڑوں میں تھا۔ لنڈا بازار سے ایک سیاہ برقعہ منگوا کر اس شخص کو پہنا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھالیا۔ محمد حسین کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر اور خود گاڑی چلا کر موضع پھلروان کی طرف گئے۔ پھلروان لاہور شہر سے 15/16 میل کے فاصلہ پر ہے۔ اطلاع دہندہ کی نشاندہی پر گاڑی آہستہ آہستہ چلا کر اس ٹیوب ویل کے قریب سے پکی سڑک پر گزرے۔ وہاں سے اور بھی اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ٹیوب ویل کے کمرہ کے اندر آدمی موجود ہیں۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم اس سڑک پر سیدھے آگے چلے گئے اور وہاں سے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ گیارہ بجے رات پھر میں نے محمد اجمل قریشی انسپکٹر اور محمد حسین اے ایس آئی کو پرائیویٹ گاڑی پر بھیجا کہ وہاں سے گزر کر معلوم کریں کہ اس کمرہ کی چھت پر چارپائیاں ہیں یا نہیں۔ ایک بجے رات وہ واپس آئے اور بتلایا کہ چھت پر دو چارپائیاں پڑی ہوئی نظر آئی ہیں جن پر آدمی لیٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تین بجے رات میں نے سی آئی اے کی فورس کو اکٹھا کیا۔ چار افسران کو 10/10 مسلح جوان دیئے۔ 4 ٹیمیں تشکیل دیں اور ہر ٹیم کے انچارج کو ایک

ایک واکی ٹاکی وئرالیس سیٹ دیا۔ ہر سمت یعنی مشرق، مغرب، شمال اور جنوب ایک ایک ٹیم کی ڈیوٹی لگائی اور ان کو اچھی طرح سے بریف کیا۔ یاد رہے کہ کسی بھی ریڈ پر جانے سے پہلے ملازمین کو بریف کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے جملہ ملازمین کو درج ذیل ہدایات دیں۔

1 جس جگہ ریڈ کرنا ہے وہاں سے دو میل دور گاڑیاں کھڑی کرنی ہیں اور وہاں سے پیدل جانا ہے۔

2 راستہ میں گفتگو وغیرہ ہرگز نہیں کرنی۔

3 راستہ میں دیا سلائی وغیرہ نہیں جلانی اور نہ ہی سگریٹ نوشی کرنی ہے۔

4 جس جگہ ریڈ کرنا ہے وہاں سے 300 گز کے فاصلہ پر پہنچ کر ہر افسر نے اپنی ٹیم لے کر جس سمت ڈیوٹی لگائی گئی ہے اس سمت آہستہ آہستہ دبے پاؤں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جانا ہے۔

5 ٹیم کے انچارج کی اجازت کے بغیر کسی جوان نے فائر نہیں کرنا۔

6 اگر سامنے سے مجرمان اشتہاری پولیس پارٹی پر سیدھی فائرنگ کریں تو جوابی موثر کارروائی کرنی ہے۔

7 تمام ٹیمیں اپنے اپنے پوائنٹ پر پہنچ کر اس طریقہ سے پھیل جائیں کہ دوسری ٹیم کے جوان نظر آئیں۔ یعنی چاروں ٹیموں نے کمرہ جس کی چھت پر مجرمان اشتہاری موجود ہیں اس کے اردگرد چاروں طرف پھیل کر مکمل گھیرا ڈال لینا ہے۔ فاصلہ 300 گز ہوگا۔

8 جب گھیرا مکمل ہو جائے تو آہستہ آہستہ ریڈ والے مقام کی طرف گھیرا تنگ کرنا شروع کر دینا ہے۔ جب فاصلہ 100 گز رہ جائے تو پوزیشن لے کر بیٹھ جانا ہے اور سورج طلوع ہونے کا انتظار کرنا ہے۔ مجرمان اشتہاری کو چوکنا نہیں ہونے دینا۔

9 اگر مجرمان کو پتہ چل جائے اور چوکنے ہو جائیں تو پوزیشن لے کر گھیرا کو مزید تنگ کرنا ہے۔

یہ ہدایات دے کر ساڑھے تین بجے رات ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر چل پڑے۔ میں نے اپنے ساتھ 4 جوان کمانڈو ٹائپ مسلح لے لیے۔ اس مقام سے دو میل دور گاڑیاں کھڑی کر کے پیدل چل پڑے۔ تقریباً چار بجے صبح مقام ریڈ سے 300 گز کے فاصلہ پر کھڑے ہو کر چاروں ٹیموں کو اپنی اپنی سمت روانہ کر دیا۔ 15 منٹ کے بعد ٹیموں کے انچارج افسران سے بذریعہ وائرلیس رابطہ کر کے کنفرم کیا کہ آیا وہ سب اپنے اپنے مقامات پر پہنچ گئے ہیں۔ اس پر سب نے O.K کی رپورٹ دی۔ ان کو گھیرا تنگ کرنے کا حکم دیا اور 100 گز کے فاصلہ پر رک کر پوزیشنیں لینے کی


Huma

ہدایت کی۔100 گز کے فاصلہ پر کمرہ کی چھت پر دونوں چارپائیاں نظر آ رہی تھیں جن پر وہ لوگ سوئے ہوئے تھے۔ یہاں میں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ اس وقت تک ہمیں یہ مکمل علم نہیں تھا کہ یہ دونوں اشخاص دارا اور شاہنا ہیں۔ لیکن قوی شبہ تھا کہ یہ وہی مجرمان اشتہاری ہو سکتے ہیں۔

تمام ٹیموں نے 100 گز کے فاصلہ پر پوزیشنیں سنبھال لیں اور سب کی نظر ان چارپائیوں پر تھی اور روشنی ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اندھیرے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔

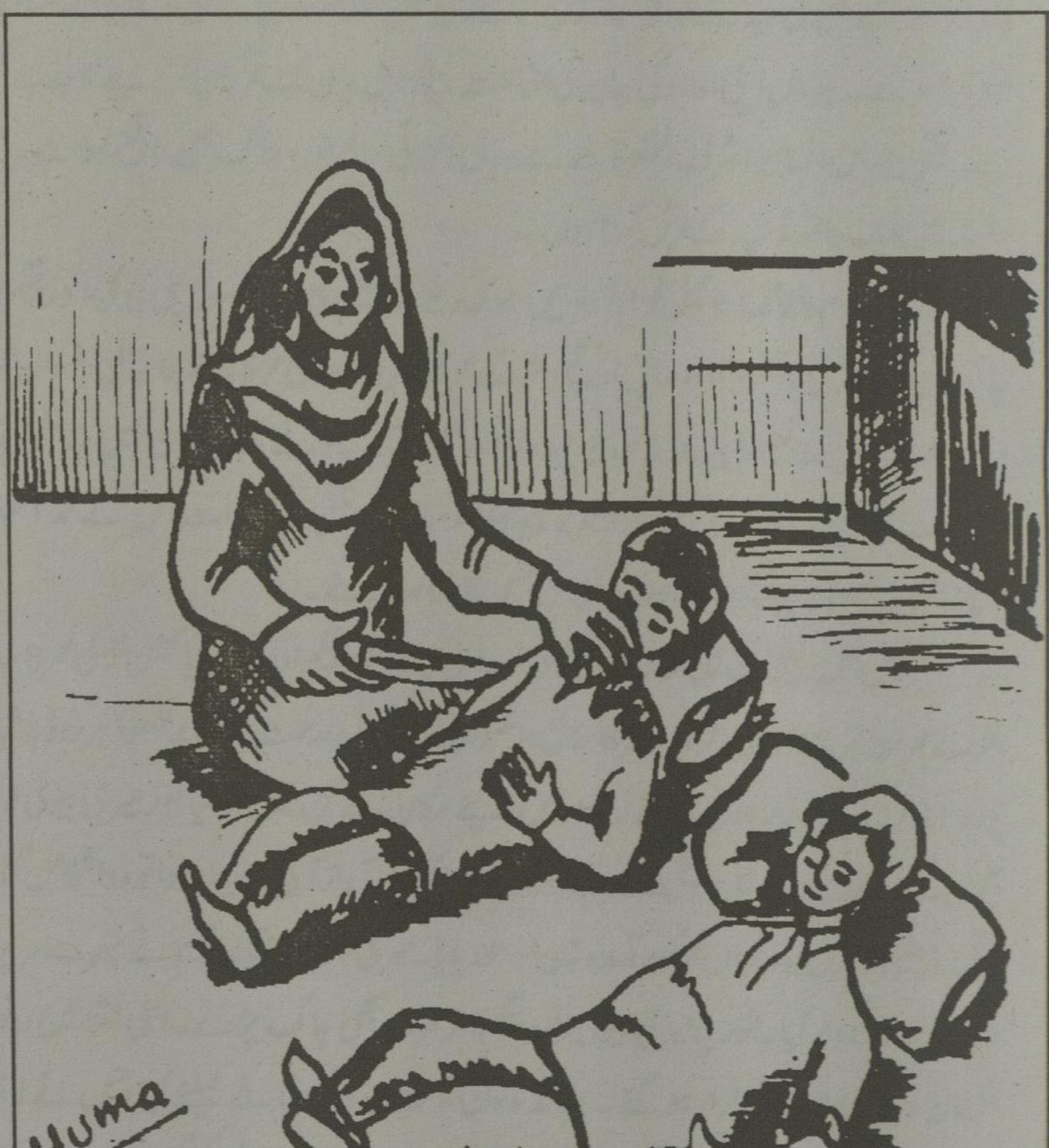
جو ٹیم مشرق کی طرف تھی اس ٹیم کا انچارج اور چار جوان ایک بڑے کیکر کے درخت کے نیچے پوزیشنیں لے کر بیٹھے تھے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ صبح کی اذان کے وقت ایک شخص جس کا نام بعد میں دارا معلوم ہوا چارپائی سے اٹھا اور چھت سے نیچے آ گیا۔ اس پر ہم چوکنا ہو گئے۔ یہ شخص ایک داتری لے کر سیدھا اس کیکر کی طرف گیا۔ کیکر کافی گھنا تھا۔ اس کے نیچے سائے میں اسے پولیس کے جوان نظر نہ آئے۔ وہ کیکر سے مسواک کاٹنا چاہتا تھا۔ جب وہ کیکر کی ٹہنی پکڑ کر داتری سے مسواک کاٹنے لگا تو ہمارے جوان جو کیکر کے نیچے پوزیشنیں لے کر بیٹھے تھے اور چوکنے تھے انہوں نے یک لخت کمانڈو ایکشن کیا اور اس شخص یعنی دارا کو ہوش سنبھلنے سے پہلے ہی گرا کر قابو کر لیا۔ اس نے چیخ و پکار کرنے کی کوشش کی لیکن جوانوں نے اسے اچھی طرح دبوچ لیا تھا اور اس کے منہ پر ہاتھ دے لیا۔ جس جگہ میں اپنے جوانوں کے ساتھ موجود تھا وہاں سے یہ کارروائی قریب ہوئی تھی اس لئے مجھے اس کا علم ہو گیا۔ اور وہاں سے ایک ملازم نے بھی آ کر مجھے بتلایا کہ سر جی! ایک شخص تو قابو آ گیا ہے۔ میں نے تمام ٹیموں کے انچارج کو وائرلیس پر بتلایا اور دوسرے ملزم کے لئے ہوشیار کیا۔ اب ہماری سب کی نظریں دوسری چارپائی پر تھیں جس پر دوسرا شخص سویا ہوا تھا۔ ہم نے گھیرا اور تنگ کر دیا۔ تقریباً 50 گز کے فاصلہ پر آ گئے تھے۔ جب اچھی طرح روشنی ہو گئی اس شخص نے انگڑائی لی اور ساتھی کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ ساتھی کو چارپائی پر موجود نہ پا کر چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ شمال کی طرف تھا۔ جب اس نے سامنے دیکھا تو پولیس کے جوان رائفلیں تانے کھڑے نظر آئے۔ اس نے یک لخت دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا تو ادھر بھی جوان اسی انداز میں رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

اسی اثنا میں، میں نے بلند آواز سے اسے کہا کہ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے چاروں طرف پولیس کا گھیرا ہے اور تمہارا ساتھی بھی پکڑا گیا ہے، بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو اسلحہ نیچے پھینک دو اور ہینڈز اپ ہو جاؤ۔ اس نے پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ گھیرا

مزید تنگ ہو چکا تھا اور جوان شیر کی طرح لپک رہے تھے۔اس نے ہینڈز اپ کرنے میں عافیت سمجھی ۔رائفل نیچے پھینک دی اور ہینڈز اپ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ہم نے اس کے مزید قریب آ کر نیچے اترنے کو کہا وہ نیچے اتر آیا۔اس کو بھی قابو کر لیا۔اس نے اپنا نام شاہنا بتلایا۔اس طرح دارا اور شاہنا دونوں خطرناک مجرم اشتہاری اچھی حکمت عملی اپنانے سے بغیر کسی خون ریزی کے قابو میں آ گئے۔

میں نے وائرلیس پر کنٹرول کو اطلاع دی۔رانا مقبول احمد ایس ایس پی لاہور کو ان دونوں خطرناک اشتہاری مجرمان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھے اور جوانوں کو وائرلیس پر مبارک باد دی اور ساتھ ہی پیغام دیا کہ وہ موقع پر پہنچ رہے ہیں۔کچھ دیر بعد جناب رانا مقبول احمد صاحب دو تین صحافیوں کو لے کر موقع پر پہنچ گئے جنہوں نے دارا، اور شاہنا مجرمان اشتہاری کی گرفتاری کے متعلق صحافیوں کو بریف کیا۔اس کے بعد ہم دارا اور شاہنا، ان کا اسلحہ دو رائفلیں اور ایک پسٹل لے کر واپس سی آئی اے ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ان دونوں کی گرفتاری کی اطلاع رائے ونڈ کے علاقہ میں پہنچ گئی جہاں لوگوں نے چاولوں کی دیگیں تقسیم کیں۔سکھ کا سانس لیا اور جشن منائے۔پولیس کی کارکردگی کو نہ صرف عوام نے سراہا بلکہ پریس نے شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں خبریں لگائیں۔اس سے محکمہ پولیس کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوا۔

سفّاک ماں



1991ء

مخلوق کائنات میں انسان کا مقام اشرف اور افضل ہے۔ جس طرح انسان اپنی اولاد سے پیار کرتا ہے اُسی طرح چرند، پرند اور دیگر حیوانات بھی اپنی اولاد کی حفاظت کیلئے اپنی جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ آپ اگر ایک مرغی کے بچے کو پکڑنے کی کوشش کریں گے تو مرغی آپ پر جھپٹ پڑے گی۔ اگر کتے کے بچے کو پکڑنا چاہیں گے تو کتیا کے حملہ سے آپ محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ حتیٰ کہ چڑیا جیسی کمزور مخلوق کے بچے کی طرف آپ ہاتھ بڑھائیں گے تو وہ اپنی کمزوری، ناتوانی اور بے بسی کی وجہ سے اور تو کچھ نہیں کر سکے گی لیکن شور ضرور مچائے گی۔ ماں کی مامتا ایک فطری امر ہے۔ ہر ماں اپنی اولاد کی جان کی حفاظت کیلئے اپنی جان تک قربان کر دینے کا جذبہ رکھتی ہے۔ لیکن جہاں انسان اشرف المخلوقات ہے وہاں انتہائی ظالم اور سفاک بھی واقع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ آپ کے پیش کرتا ہوں۔

عبدالسلام ولد محمد اسماعیل قوم آرائیں جو کہ ریلوے میں ملازم تھا معہ اپنی بیوی انور بیگم اور چار بچوں ایک لڑکی یاسمین عمر 8 سال اور تین لڑکے عمران عمر 10 سال عرفان عمر 6 سال رضوان عمر 4 سال رحمت سٹریٹ لکھوڈ ہر روڈ باغبان پورہ لاہور میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ شب درمیانی 30 اکتوبر اور 31 اکتوبر 1991ء ساڑھے تین بجے رات اس نے محمد آصف انسپکٹر انچارج تھانہ باغبان پورہ کو رپورٹ کی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

''میں محکمہ ریلوے میں ملازم ہوں اور معہ اپنی بیوی انور بیگم اور بچوں یاسمین لڑکی عمر 8 سال ،لڑکے عمران عمر 10 سال، عرفان عمر 6 سال، رضوان عمر 4 سال، رحمت سٹریٹ لکھوڈ ہر روڈ باغبان پورہ لاہور رہائش پذیر ہوں۔ آج رات میں اپنے مکان کے صحن میں سو گیا اور میری بیوی اپنے بچوں کے ساتھ برآمدہ میں سو گئی۔ 2 بجے رات کو کھڑاک کی آواز آئی۔ بیدار ہوا تو دو اشخاص گندمی رنگ، مضبوط بدن اور جوان عمر کو برآمدہ میں موجود پایا۔ میری آواز پر ایک ملزم نے میرے سر پر تیز دھار آلہ سے وار کیا۔ شور پر میری بیوی انور بیگم اور عمران بھی جاگ پڑے۔ اسی اثنا میں دونوں ملزمان دیوار پھلانگ کر فرار ہو گئے۔ برآمدہ والی لائٹ بیوی کو جلانے کیلئے کہا جس نے لائٹ جلا دی۔ دیکھا کہ میرے دو لڑکے عرفان عمر 6 سال اور رضوان عمر 4 سال کی گردنیں تیز دھار آلہ

سے کٹی ہوئی ہیں۔اور دونوں مرے پڑے ہیں۔''

اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی تحریر کروایا کہ ملزمان کو سامنے آنے پر وہ، اس کی بیوی اور عمران عمر شناخت کر سکتے ہیں۔

چنانچہ مدعی کے اس بیان پر ایس ایچ او تھانہ باغبان پورہ نے مقدمہ درج کروایا اور خود موقع پر پہنچ گیا۔سینئر افسران کو بھی اس نے اس دلخراش واقعہ کی اطلاع دے دی۔ جناب طارق مسعود کھوسہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور، زبیر محمود سپرنٹنڈنٹ پولیس کینٹ ڈویژن، حامد مختار گوندل سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی اے، الطاف حسین ڈی ایس پی مغل پورہ سرکل فوری طور پر موقع پر پہنچ گئے۔بعد میں عبدالرؤف ڈوگر ڈی ایس پی رسی آئی اے کینٹ بھی پہنچ گئے۔

تقریباً10 بجے دن سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی اے کی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ سی آئی اے کے سرکاری کھوجی کو فوری طور پر موقع پر بھجوایا جائے۔ اور میں خود بھی موقع پر پہنچ جاؤں۔ تقریباً11 بجے دن میں موقع پر پہنچا تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔علاقہ کے لوگ کافی مشتعل تھے۔اس واقعہ کو اسلام پورہ والے 13 افراد کے قتل والے واقعہ کے ساتھ ملا کر کچھ شرپسند کافی ہوا دے رہے تھے۔الطاف حسین ڈی ایس پی اور عبدالرؤف ڈوگر ڈی ایس پی وہاں موجود تھے۔انہوں نے انتہائی دانشمندی اور حکمت عملی سے مجمع کو کنٹرول کیا ہوا تھا اور جس طرف ملزمان کے کھوج کے نشانات ملنے کا امکان تھا اس ایریا کو بھی محفوظ کیا ہوا تھا۔

میں نے دونوں صاحبان سے حالات معلوم کیے اور علاقہ کے ایک معزز شخص کو ہمراہ لے کر مدعی کے مکان کے صحن میں گیا۔ وہاں انور بیگم کے ساتھ دیگر کافی مستورات آہ وزاری کر رہی تھیں۔میں نے ایک بات کو خاص طور پر نوٹ کیا کہ جس وقت میں اندر داخل ہوا تو انور بیگم آہستہ آہستہ رو رہی تھی اور جب مجھے دیکھا تو پھر زور زور سے بین کرنے شروع کر دیئے۔میں نے انور بیگم کو برآمدہ میں بلوایا۔اس نے موقع کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ اس جگہ اس کے لال ذبح کیے گئے ہیں اور بے ساختہ اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔میں نے اسے حوصلہ اور تسلی دی۔دریافت پر اس نے مزید بتلایا کہ اس کا خاوند رات کو صحن میں سو گیا اور بچے برآمدہ میں ٹیلی ویژن دیکھتے دیکھتے زمین پر سو گئے۔ تقریباً2 بجے رات عمران پیشاب کرنے کیلئے لیٹرین میں گیا کہ اچانک غربی سائیڈ سے دیوار پھلانگ کر دو اشخاص صحن میں آ گئے۔انہوں نے میرا منہ دیوار کی طرف کر کے کہا کہ پیچھے نہیں دیکھنا۔ایک شخص پستول لے کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔لیٹرین سے میرے بیٹے



عمران نے ان کو دیکھ لیا اور بھاگ کر ڈیوڑھی کی چھت پر چڑھ کر شور مچایا۔ اس پر دونوں ملزمان جہاں سے دیوار پھلانگ کر آئے تھے اسی راستے دیوار پھلانگ کر دوڑ گئے۔ میں نے دیکھا کہ میرے دونوں بچے عرفان اور رضوان ذبح ہوئے پڑے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ شور پر میرا خاوند اٹھا تو ایک ملزم نے اس کے سر پر کوئی تیز دھار چیز ماری جس سے وہ چارپائی پر گر پڑا۔ اتنے میں محلّہ دار اکٹھے ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے عمران کو بلوا کر پوچھا تو اس نے سہمی ہوئی آواز میں اس طرح واقعہ بتلایا۔ میں نے عمران سے سوال کیا کہ بیٹے لیٹرین کے دروازہ پر تو پردہ لٹکا ہوا ہے وہاں سے اسے ملزمان کیسے نظر آئے۔ اور وہ ملزمان کی موجودگی میں چھت پر کیسے چڑھ گیا تو اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے زیادہ کریدنے سے گریز کیا کہ مدعی بداعتمادی نہ کریں کیونکہ حالات ایسے تھے کہ وہاں لوگوں کو اعتماد میں رکھنا ضروری تھا۔

مکان کا حدود اربعہ کچھ اس طرح ہے کہ سامنے گلی، مشرق کی طرف مکان، عقبی طرف بھی مکان اور غربی جانب جدھر سے ملزمان اندر آئے اور پھر دیوار پھلانگ کر باہر جاتے بیان ہوئے تھے خالی پلاٹ پڑا ہے۔ زمین کچی ہونے کی وجہ سے وہاں کھوج کے نشانات آسانی سے نظر آ سکتے ہیں۔ میں نے اس دیوار کے باہر دیکھا تو وہاں کوئی کھوج کا نشان مجھے نظر نہ آیا۔ میں نے الطاف حسین اور عبدالرؤف ڈوگر ڈی ایس پی صاحبان کو علیحدگی میں بتلایا اور کہا کہ یہاں تو کھوج کے نشانات تک نہیں ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ مجرمان اس طرح سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے ہوں اور باہر نکلے ہوں۔ ان دونوں صاحبان نے بھی اس جگہ کا بغور معائنہ کیا تو انہوں نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا۔ ہم تینوں نے علیٰحدگی میں بیٹھ کر واردات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

ہمارا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ ملزمان دیوار کے ذریعہ داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی اس راستہ سے باہر نکلے ہیں۔ عمران نے لیٹرین سے ملزمان کو نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ 2 بجے رات پیشاب کیلئے لیٹرین میں گیا۔ معاملہ میاں بیوی کے درمیان ہے جو حقیقت کو چھپا رہے ہیں۔ یہاں میں اس بات کا تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ ہم نے مستورات میں لیڈیز پولیس کی دو سمجھدار خواتین کو خفیہ حالات معلوم کرنے کیلئے چھوڑا ہوا تھا۔ ہم نے ان سے رپورٹ لی تو انہوں نے بتلایا کہ پتہ چلا ہے کہ میاں بیوی میں اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ عورت بدچلن ہے۔ خاوند اسے اکثر طعنہ دیا کرتا تھا کہ دونوں بچے عرفان اور رضوان جو قتل ہو چکے ہیں یہ حرام کے ہیں۔ اس اطلاع سے ہمارے قیاس کی اور تائید ہو گئی اور یقین کی حد تک ہم نے سمجھ لیا کہ معاملہ گھر سے ہی نکلے گا۔ ہم تینوں نے جناب زبیر

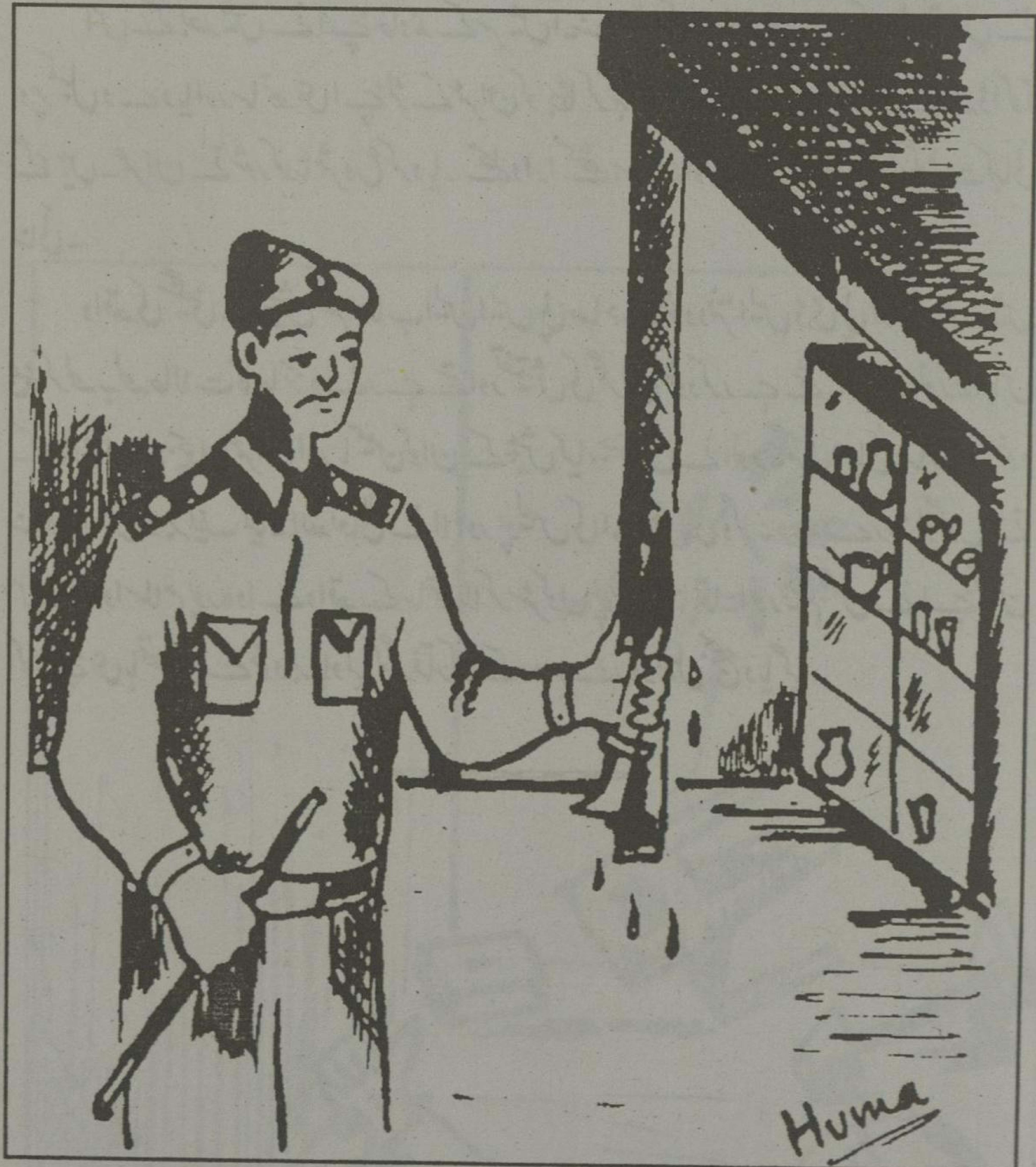

Husn

محمود ایس پی کینٹ، اور حامد مختار گوندل ایس پی رسی آئی اے کو تمام حالات بتلائے۔ انہوں نے بھی حالات کا بغور جائزہ لیا اور ہماری رائے سے اتفاق کیا۔

اب ہمارے سامنے اہم مسئلہ نعش کی تجہیز و تکفین کا تھا جو پوسٹ مارٹم کیلئے میو ہسپتال بھجوائی گئی تھیں۔ محلہ میں کافی مجمع تھا۔ امن عامہ کی صورت حال کسی بھی وقت خراب ہو سکتی تھی۔ ہم نے مصلحت کے تحت فیصلہ کیا کہ نعشوں کی تجہیز و تکفین کے بعد میاں بیوی اور ان کے بچوں سے دریافت کریں گے تا کہ اتنے تک اعتماد میں رہیں۔ دونوں بچوں کی نعشیں پوسٹ مارٹم کے بعد گھر پہنچ گئیں اور ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں جنازے قبرستان کیلئے روانہ ہوئے۔ زبیر محمود ایس پی کینٹ ڈویژن اور حامد مختار گوندل ایس پی رسی آئی اے کی زیر نگرانی ہم تینوں ڈی ایس پی معہ ضروری فورس کے جلوس کے ہمراہ ہو لیے۔ ہم اس وقت پوری طرح ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کیلئے تیار تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور محلہ کے معززین کے تعاون سے جنازے بخیریت قبرستان پہنچ گئے۔ اور اب نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین کے بعد تمام مجمع پر امن طور پر منتشر ہو گیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کہ یہ کٹھن مرحلہ گزر گیا۔

اب ہم سیدھے مدعی کے گھر پہنچے۔ ان کو علیٰحدہ علیحدہ کر کے دریافت شروع کی۔ ان کی باتوں میں کافی تضاد تھا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ مدعی کا بیان اس کی بیوی کی بتائی ہوئی من گھڑت کہانی پر مبنی تھا۔ تفتیشی ٹیم کے سوالات کی بوچھاڑ نے انور بیگم کو لاجواب کر دیا تھا۔ اور اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر تک ہم اس سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں الطاف حسین ڈی ایس پی جو انتہائی باریکی کے ساتھ گھر کی تلاشی لے رہے تھے ان کو برآمدہ کی دیوار کے ساتھ برتنوں والی لکڑی کی پھٹی کے پیچھے چھپائی ہوئی خون آلود چھری مل گئی۔ جب انور بیگم نے وہ چھری دیکھی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ہم نے پوچھا کہ یہ چھری کس کی ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا یہ چھری ان کی ہی ہے۔ اب اس کے پاس ماسوائے سچ بتانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے انکشاف کیا کہ اس نے خاوند کے طعنوں سے تنگ آ کر بچوں کو ذبح کیا ہے۔

تفصیل بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ خاوند اسے ہر وقت طعنے دیتا تھا کہ دونوں بچے حرام کے ہیں ان کی شکل کسی اور سے ملتی ہے۔ لہٰذا اس نے دل میں پروگرام بنایا کہ روز روز کی لڑائی سے بہتر ہے کہ یہ دونوں بچوں کو مار دے۔ چنانچہ اس نے اپنی چھری کو رگڑ کر تیز کر لیا۔ قریب 2 بجے رات


Huma

سب بچے سو گئے۔ عرفان اور رضوان دونوں اکٹھے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ عرفان کو مچھر نے کاٹا تو جاگ کر کہنے لگا کہ امی مجھے مچھر کاٹ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ساتھ ہی گلے پر چھری پھیر دی۔ اس کے بعد دوسرے بچے کی چھاتی پر گھٹنا رکھ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ دونوں بچے فوری طور پر ٹھنڈے ہو گئے۔

اس کے بعد میں نے اپنے خاوند کے سر میں اینٹ اٹھا کر ماری۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا تو میں نے اوپر کمبل دے دیا اور ساتھ ہی اپنے لڑکے عمران کو جگا کر کہا کہ چھت پر چڑھ کر شور کرے کہ ڈاکو آ گئے ہیں۔ عمران نے شور کرنا شروع کر دیا۔ محلے دار اکٹھے ہو گئے اور میں نے انہیں من گھڑت کہانی سنائی۔

واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر جناب ایس ایس پی صاحب خود دفتر ایس ڈی پی او مغل پورہ میں بیٹھ کر لمحہ بہ لمحہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور تفتیش کی نگرانی خود کر رہے تھے۔ وہاں انور بیگم اس کے خاوند اور دو بچوں عمران اور یاسمین کو ان کے پیش کیا، جنہوں نے انور بیگم کی زبانی سارا قصہ خود سنا اور پریس کو بریف کیا۔ اللہ تعالیٰ نے لاہور پولیس کی امداد فرمائی وگرنہ دوسرے روز لوگوں نے اس واقعہ کو اسلام پورہ والے واقعہ کے ساتھ ملا کر سڑکوں پر نکل آنا تھا۔ انور بیگم جس نے اپنے گلشن کو اپنے ہی ہاتھوں سے خود برباد کیا کو گرفتار کر کے دوسرے روز جیل بھیج دیا گیا۔

خونی انگلیاں



1992ء

ماہ ستمبر 1992ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں میں بطور ڈی ایس پی سی آئی اے سٹی تعینات تھا۔ میرا ہیڈ کوارٹر تھانہ کوتوالی تھا۔ انار کلی بازار لاہور کا معروف تاجر عقیل احمد باڑی ولد محمد ایوب باڑی ساکن کوٹھی نمبر 297 عمر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور مورخہ 5 ستمبر 1992ء کو اپنی دکان واقعہ انار کلی بازار سے فارغ ہو کر سوا نو بجے رات گھر پہنچا اور گھر کے باہر لگائی ہوئی گھنٹی بجائی۔ بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی فرد دروازہ کھولنے نہ آیا تو ساتھ والے مکان سے اپنے پڑوسی کے نوکر اصغر کو بلایا۔ اس کو چھت کے ذریعہ بھیج کر اندر سے دروازہ کھلوایا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کی بیوی صبیحہ عقیل قالین پر مردہ حالت میں پڑی ہوئی ہے اور رسی کے پھندے کا نشان گردن پر ہے۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں بچوں کو تلاش کیا۔ دیکھا کہ دونوں بچے عامر احمد عمر 8 سال عاطر احمد عمر 3 سال سٹور میں خون میں لت پت پڑے ہیں اور دونوں کی شہ رگیں کٹی ہوئی ہیں، جو مردہ حالت میں ہیں۔ گھریلو سامان VCR اور زیورات غائب ہیں۔ اس سنسنی خیز اور اندوہناک سانحہ کی اطلاع عقیل احمد باڑی نے متعلقہ تھانہ گلشن اقبال کو دی۔

میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کوتوالی میں موجود تھا۔ مجھے بھی اس واقعہ کی اطلاع مل گئی۔ میں اپنے ہمراہ گارڈ لے کر فوری طور پر پہنچا۔ مقامی پولیس جائے وقوعہ پر پہنچ چکی تھی۔ چونکہ یہ خبر سارے شہر میں پھیل چکی تھی اس لئے عقیل باڑی کے گھر کے اردگرد لوگوں کا بہت رش لگ چکا تھا اور لوگ حسب معمول پولیس پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ میں نے لوگوں کو تسلی دی اور فوری طور عقیل باڑی کی کوٹھی کے اندر گیا۔ نعشوں کا غور سے ملاحظہ کیا۔ صبیحہ عقیل کو رسی سے پھاہ دے کر قتل کیا گیا تھا اور دونوں بچوں کے گلے تیز دھار آلہ سے کاٹے گئے تھے۔ صبیحہ عقیل کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی میں کچھ بال تھے۔ خیال تھا کہ اُس نے کسی ملزم کو بالوں سے پکڑا اور کشمکش میں ملزم کے بال اس کی مٹھی میں آ گئے۔ نعشیں پوسٹ مارٹم کیلئے روانہ کی گئیں اور پوسٹ مارٹم کے دوران ڈاکٹر نے مٹھی والے بال حوالہ پولیس کیے جو فرد کے ذریعہ قبضہ میں لیے گئے۔

میں نے انتہائی باریکی کے ساتھ ملاحظہ موقع کیا۔ کمرہ کے اندر دیوار پر ایک جگہ خون آلود نشانات انگشت پائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ملزم نے جلدی میں خون آلودہ ہاتھ کو دیوار

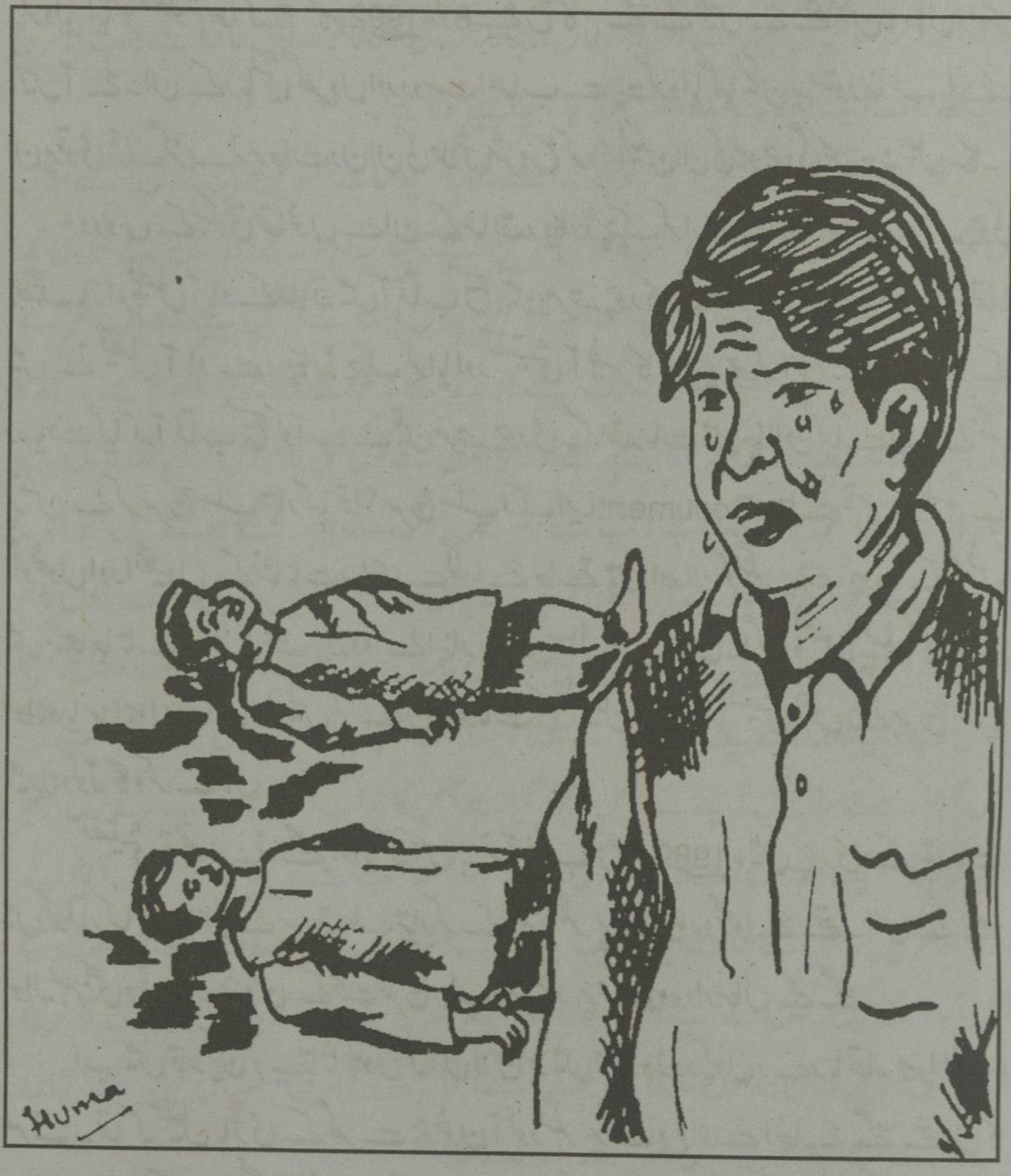
کے ساتھ صاف کیا ہو۔ یہ درست ہے کہ Crime Leaves Some Clue ۔خون آلودہ نشانات کو محفوظ کیا اور ایکسپرٹ فنگر پرنٹ بیورو کو بلوا کر نشانات انگشت لفٹ کروا کر محفوظ کر لیے۔

عقیل باڑی کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے رش اور گھر کی مستورات کی چیخ و پکار کی وجہ سے تفتیش میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ گھر کے افراد میں سے صرف عقیل باڑی ہی تھا جس سے گھر کے حالات جاننے ضروری تھے لیکن وہ بیچارہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ظاہر ہے کہ جس شخص کا سارا کنبہ ہی اتنی سفاکی اور بیدردی سے قتل کر دیا گیا ہو وہ ہوش میں کیسے رہ سکتا ہے۔تاہم گردونواح کے لوگوں اور عقیل باڑی کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ اور سراغ برآری کا سلسلہ جاری رکھا۔دوسرے روز نعشوں کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نے عقیل باڑی کو کچھ حوصلہ دیا اور صبر سے کام لینے کیلئے کہا۔وہ چیخیں مار مار کر کہہ رہا تھا کہ چوہدری صاحب کیسے صبر سے کام لوں۔ میرا سارا گلشن اُجڑ گیا ہے۔میری بیوی گئی میرے دولخت جگر لال چلے گئے،ہائے کیسے صبر کروں۔

میں نے اسے گلے لگا لیا اور علیحدہ کمرہ میں لے گیا۔اسے کہا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے اب ہم نے مل کر ان ظالموں تک پہنچنا ہے۔ میں نے اس سے گھر کی روٹین معلوم کی۔اس نے کہا کہ میں تقریباً نو بجے صبح دکان پر چلا جاتا ہوں اور رات کو آٹھ نو بجے واپس آتا ہوں۔میری عدم موجودگی میں میری بیوی گھر کا مین دروازہ اندر سے بند رکھتی ہے۔بغیر واقفیت اور شناخت کے وہ دروازہ نہیں کھولتی۔عقیل باڑی کے اس بیان سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ دروازہ کسی واقف کار آدمی نے کھلوایا ہے۔میں نے عقیل باڑی سے نوکروں کی تفصیل لی۔ واقف اور رشتہ دار جوان کی عدم موجودگی میں گھر میں داخل ہو سکتے تھے ان کی بابت پوچھا۔جو نوکر پہلے کبھی نکال دیئے گئے تھے ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔نیز عقیل باڑی سے دریافت کیا کہ کوٹھی کے اندر کوئی مستری مزدور لگا کر سفیدی یا سینٹری کا کام کروایا ہو۔عقیل باڑی نے کہا کہ تقریباً دو ماہ پیشتر اس نے کوٹھی میں سینٹری کا کام کروایا تھا۔دریافت کیا کہ مستری مزدور کہاں سے منگوائے تھے۔ذرا سوچ کر بتایا کہ راجو سینٹری سٹور ملتان روڑ سے دو مستری منگوائے تھے۔ان میں سے ایک کا نام غلام مصطفیٰ اور دوسرا آفتاب مسیح تھا۔ان کے مکمل کوائف راجو سینٹری سٹور سے مل سکتے ہیں؟ راجو سینٹری سٹور کے مالک کو بلوایا تو اس نے ان دونوں مستریوں کے درج ذیل کوائف دیئے۔

1 غلام مصطفیٰ ولد محمد حنیف قوم راجپوت ساکن پنجریاں تھانہ دیپالپور ضلع اوکاڑہ

2 آفتاب مسیح ولد نذیر مسیح قوم عیسائی ساکن بدو کے تھانہ مرید کے ضلع شیخوپورہ


Huma

عقیل باڑی کے تمام نوکر، رشتہ دار اور واقف کار چیک کیے جن میں کوئی شخص مشکوک نظر نہ آیا اور سب بلانے پر حاضر ہوتے گئے۔ لیکن جب غلام مصطفیٰ اور آفتاب مسیح کا پتہ راجو سینٹری سنٹر سے کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ 5 ستمبر 1992ء کو 8 بجے صبح کام کے لئے کہیں گئے تھے لیکن تا حال واپس نہیں آئے۔ ان کے رہائشی گھروں اور دوست احباب سے پتہ کروایا گیا لیکن بدستور غائب پائے۔ ان پر قوی شک گزرنے پر رات دن ان کی تلاش شروع کر دی لیکن ان کی موجودگی کا پتہ نہ چل سکا۔

دونوں کے سکونتی تھانوں سے ان کے سابقہ ریکارڈ چیک کرائے گئے تو انکشاف ہوا کہ چوکی جھنگ بازار فیصل آباد کے علاقہ میں آفتاب مسیح تین مرتبہ چوری کے مقدمات میں چالان ہوا تھا۔ میں نے فیصل آباد سے ریکارڈ چیک کرایا اور تفتیشی آفیسر کا نام پوچھ کر اس سے رابطہ کر کے دریافت کیا کہ آفتاب مسیح کو آپ نے تین مرتبہ چوری کے مقدمات میں چالان کیا ہے اس کے فنگر پرنٹس لے کر سرچ سلپ تیار کیا تھا؟ سرچ سلپ ایک ایسا Document ہوتا ہے جس پر ملزم کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے نشانات سیاہی سے لگوائے جاتے ہیں اور ان کو فنگر پرنٹ بیورو کے آفس میں بھیجا جاتا ہے۔ فنگر پرنٹ بیورو والے اپنا ریکارڈ پڑتال کرتے ہیں۔ اگر وہ شخص پہلے کبھی گرفتار ہوا ہو یا سزا ہوا ہو تو اس کو ٹریس کر کے ان مقدمات کی تفصیل سے افسر تفتیشی جس نے سرچ سلپ بھیجا ہو کو آگاہ کرتے ہیں۔

تفتیشی آفیسر نے مجھے بتلایا کہ اس نے آفتاب مسیح کو 1989ء میں چوری کے مقدمات میں گرفتار کیا تھا۔ اس کے سرچ سلپ تیار کر کے دفتر فنگر پرنٹ بیورو بھجوائے تھے۔ اس نے مجھے حوالہ نمبر بھی دے دیئے جن کے تحت سرچ سلپ دفتر فنگر پرنٹ بیورو ارسال کیے گئے۔

اب میں قارئین کو یہ بتا تا چلوں کہ اس لائن پر میں زیادہ زور کیوں دے رہا تھا۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ عقیل باڑی کے گھر سے جو خون آلود فنگر پرنٹ دیوار سے اٹھائے گئے تھے ان کا موازنہ آفتاب مسیح کے فنگر پرنٹس سے کرالیا جائے۔ اگر مطابقت پائی جاوے تو پھر کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی اور ہم صرف ایک لائن پر تفتیش کر کے آفتاب مسیح اور غلام مصطفیٰ کی گرفتاری پر سارا زور دیں گے۔

میں نے محمد اجمل قریشی انسپکٹر سی آئی اے کو سرچ سلپ کے نمبر دے کر دفتر فنگر پرنٹس بیورو بھیجا کہ وہاں سے آفتاب مسیح کے سابقہ سرچ سلپ ٹریس کرائیں۔ محمد اجمل دفتر واپس آیا جس کے چہرے پر مایوسی کے آثار تھے۔ کہنے لگا سر جی! دفتر فنگر پرنٹس بیورو کے انچارج نے تین

چار گھنٹے بٹھا کر کہا ہے کہ فیصل آباد کے سرچ سلپس کے چھ سات بنڈل پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے تلاش کرنا ہے۔ آپ دو تین دن کے بعد آ کر پتہ کر لیں۔ مجھے اس کا یہ جواب سن کر انتہائی دکھ ہوا کہ اگر فنگر پرنٹس بیورو کے دفتر کا یہ حال ہے تو پھر باقی محکمہ کا تو خدا ہی حافظ ہے جب کہ سرچ سلپ کا جواب ایک ہفتہ کے اندر واپس پہنچ جانا چاہیے ہوتا ہے۔

میں نے قریشی محمد اجمل انسپکٹر کو کہا کہ اچھے سمجھدار چھ سات افسر کل 9 بجے دن اکٹھے کریں میں بھی ساتھ جاؤں گا اور سرچ سلپ تلاش کریں گے۔ چنانچہ دوسرے روز میں نے قریشی محمد اجمل کے علاوہ چھ افسر اور ساتھ لیے اور سیدھا فنگر پرنٹس بیورو کے آفس پہنچے۔ وہاں دفتر کے انچارج ماشاء اللہ ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے 15/20 ملازم علیحدہ علیحدہ بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے جو گپیں لگا رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے انچارج سے کہا کہ مولانا صاحب آپ کے دفتر میں ڈاک کے انبار لگے ہوئے ہیں جو آپ گھٹڑیوں میں باندھ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور آپ کے پاس اتنے ملازم ہیں آپ ان سے کیوں کام نہیں لیتے؟ مولانا صاحب نے کیا جواب دینا تھا! میں یہ حال دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو یہ ملک کیسے چلے گا۔ میں نے مولانا صاحب کو کہا کہ آفتاب مسیح کا سرچ سلپ ضلع فیصل آباد سے 3 سال قبل آپ کے پاس بھیجا گیا ہے جس کا جواب ابھی تک آپ نے نہیں بھیجا جب کہ یہ کام ایک ہفتہ کے اندر ہونا ضروری ہے۔ مولانا صاحب سے پوچھا کہ ضلع فیصل آباد کے بنڈل کدھر ہیں۔ اس نے سامنے ایک ریک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ سامنے چھ بنڈل ضلع فیصل آباد کے ہیں۔ میں نے اپنے افسران کو ایک ایک بنڈل تقسیم کر کے دیا کہ آفتاب مسیح کا سرچ سلپ تلاش کریں۔ ان بنڈلوں میں ایک بنڈل سے آفتاب مسیح کا سرچ سلپ مل گیا۔ مجھے انتہائی خوشی ہوئی کیونکہ اس پر میری تفتیش کا زیادہ تر دارومدار تھا۔

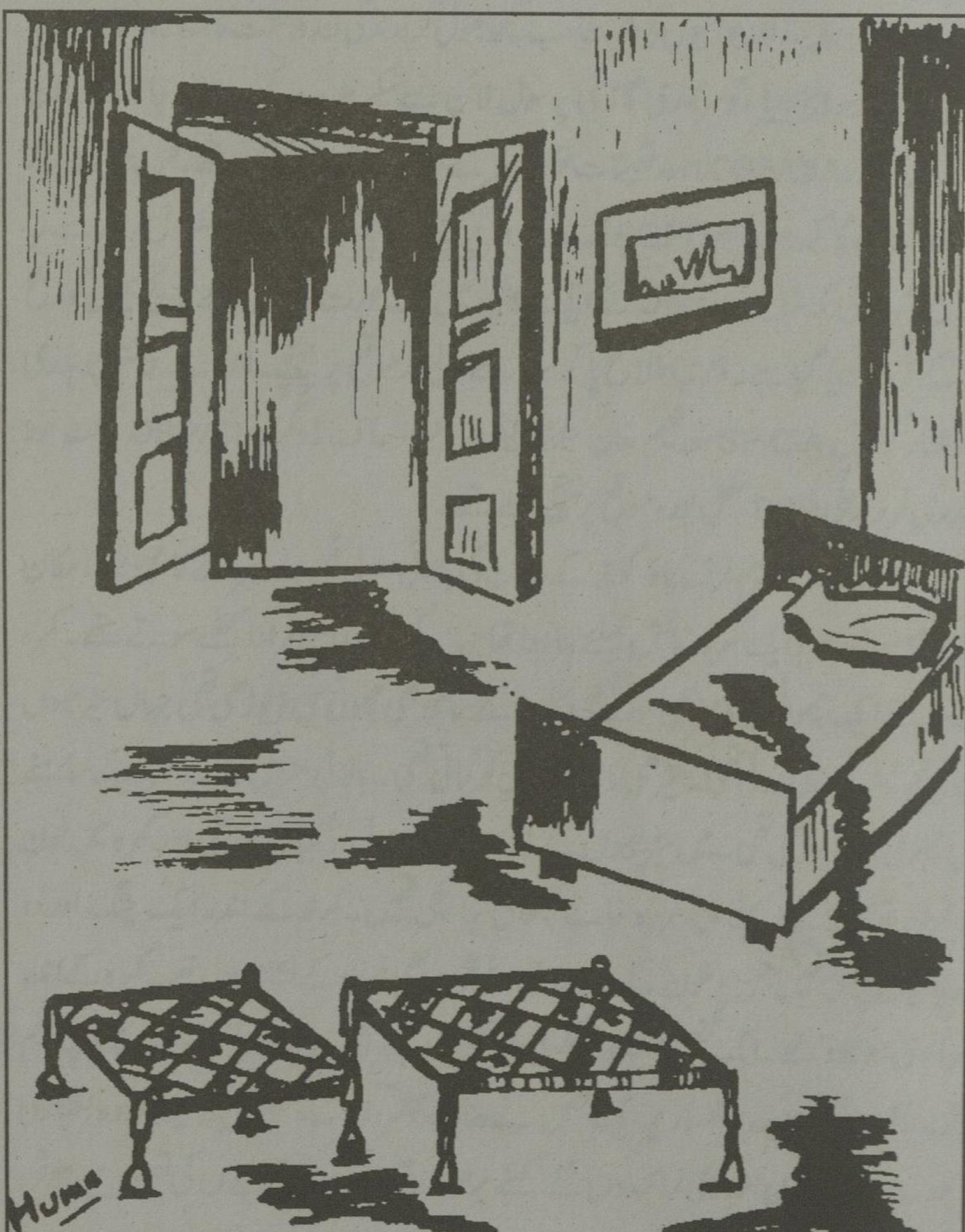
آفتاب مسیح کے سرچ سلپ پر نشانات انگشت کا عقیل باڑی کے گھر سے جو خون آلود نشانات انگشت دستیاب ہوئے تھے کے ساتھ موازنہ کرایا گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نشانات انگشت کی آپس میں مطابقت پائی گئی۔ ایکسپرٹ نے بتلایا کہ دونوں نشانات انگشت ایک ہی شخص کے ہیں۔ اب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ آفتاب مسیح اور غلام مصطفیٰ کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر ان دونوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں کو گرفتار کیا جنہوں نے علیحدہ علیحدہ یہ وقوعہ تسلیم کیا۔ جو بال عقیل ماڑی کی مقتولہ بیوی کی مٹھی سے برآمد ہوئے تھے ان بالوں کا

موازنہ آفتاب مسیح اور غلام مصطفیٰ ملزمان کے بالوں کے ساتھ کرایا گیا تو ایکسپرٹ نے رائے دی کہ جو بال صبیحہ عقیل مقتولہ کے ہاتھ سے برآمد ہوئے ہیں ان کی مطابقت غلام مصطفیٰ کے بالوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کو ظلم کی سزا دینی تھی۔ ایک ملزم کے نشانات انگشت مل گئے جب کہ دوسرے کے بالوں کی مطابقت ہوگئی۔ مسروقہ مال V.C.R اور زیورات بھی برآمد کر لیے گئے۔ باقی شہادتوں کے علاوہ یہ دو ایسی شہادتیں تھیں جو ناقابل تردید تھیں۔

دونوں ملزمان کے خلاف چالان عدالت میں دیا گیا۔ جناب جسٹس گلباز خان جج صاحب انسداد دہشت گردی لاہور کی عدالت سے آفتاب مسیح اور غلام مصطفیٰ ملزمان کو 3/3 بار سزائے موت ہوئی۔ ان ملزمان نے سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جو خارج ہوگئی اور جناب صدر پاکستان نے ان کی رحم کی اپیل بھی خارج کر دی ہے۔

خون کی ہولی



1993ء

انسان میں اگر صفات انسانی پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں تو وہ اوج ثریا سے سرگوشیاں کرتا ہے۔چاند کے چہرے پر اپنے پاؤں کے نشانات چھوڑتا ہے۔مریخ اور زحل پر کمندیں ڈالتا ہے۔اوراگر انسانیت سے گر جائے تو وحشی درندوں سے بھی بدتر ثابت ہوتا ہے۔یہ جتنا نرم اور نازک دل رکھتا ہے اتنا ہی ظالم،سفاک،درندہ اور سنگدل واقع ہوتا ہے۔باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بھائی بہن کا پیار اور بھائیوں کی محبت سب کچھ بھول کر درندگی اور وحشت کا شکار ہو جاتا ہے۔

22 ستمبر 1993ء کو سرکاری گاڑی پر سول لائن سے سیکریٹریٹ کی جانب جا رہا تھا۔ان دنوں میں بطور DSP/CIA لاہور تعینات تھا۔میرے ساتھ دو گن مین بھی تھے۔قریباً آٹھ بجے دن کا وقت ہوگا کہ جب ہم GPO چوک مال روڈ پر پہنچے۔اچانک وائرلیس کنٹرول روم سے یہ اطلاع نشر ہوئی کہ شالیمار کے علاقہ کے ایک مکان میں ایک عورت اور اس کے پانچ بچوں کو ذبح کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔ہم یہ اطلاع پا کر سیدھے شالیمار موقع پر پہنچے۔اس سے پیشتر چوہدری حامد مختار گوندل SP/CIA معہ نعیم خان SP کینٹ، عبدالرؤف ڈوگر DSP/CIA کینٹ اور چوہدری فرزند علی DSP مغل پورہ موقع پر پہنچ چکے تھے۔

جائے وقوعہ محمد سلیم عرف باؤ گوجر کے مکان کی بالائی منزل تھی۔دو مرلے کا چھوٹا سا مکان نیچے دکان اور اوپر ایک کمرہ رہائش کیلئے بنا ہوا تھا جہاں گھر کے تمام افراد اکٹھے سوتے تھے۔کمرہ کے سامنے ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی اور نیچے دکان کے ساتھ بھی چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی جہاں سیڑھیوں کے نیچے لیٹرین بنی ہوئی تھی۔سیڑھی بالائی منزل کو جاتی تھی۔بالائی منزل والے کمرہ کے سامنے بھی چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی۔میں سیڑھیوں کے ذریعہ بالائی منزل پر گیا۔ڈیوڑھی اور کمرہ میں خون ہی خون تھا۔لاشیں پہلے ہی مردہ خانے بھجوائی جا چکی تھیں۔کمرہ کے اندر ایک پلنگ اور دو چارپائیاں پڑی تھیں جن پر خون کے دھبے تھے۔فرش پر بھی خون کے نشانات تھے۔کمرہ کے اندر چار آدمی موجود تھے۔ایک شخص صندوق کھول کر کپڑے باہر نکال رہا تھا۔''وہ بچوں کا باپ سلیم عرف باؤ ہے'' میرے استفسار پر ایک شخص نے بتایا۔دوسروں کے متعلق پتہ چلا کہ وہ اخباری نمائندے ہیں۔''میں اخباری نمائندوں کے کہنے پر صندوق سے بیوی اور بچوں کی تصویریں تلاش

کر رہا ہوں'' محمد سلیم عرف باؤ نے مجھے خود بتایا۔ میں نے اخباری نمائندوں کو یہ کہہ کر استدعا کی کہ موقع سے نشانات ضائع ہو جائیں گے وہ ذرا باہر تشریف لے جائیں۔ وہ میرے ایک ہی اشارے پر باہر چلے گئے۔ میرے ساتھ محمد امین کانسٹیبل گن مین تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ میری جو گفتگو محمد سلیم عرف باؤ سے ہو وہ نوٹ کرتا جائے۔ محمد سلیم عرف باؤ نے پوچھنے پر بتایا کہ ''مکان کے نیچے اس کی چھوٹی سی بیکری کی دکان ہے۔ رات کے ساڑھے نو بجے اپنی دکان معمول کے مطابق بند کر کے گھر آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر بیکری کا سامان لینے کیلئے سنگھ پورہ اللہ دتہ بیکری والے کے پاس گیا۔ اس کی بیکری گندیاں بہیاں کے پاس ہے۔ وہ نہ مل سکا پھر نواں والا چوک باغبانپورہ گیا کیونکہ معلوم ہوا کہ وہاں کوئی نئی بیکری کی دکان کھلی ہے۔ وہاں گیا تو دکان نہ مل سکی۔ تو وہ سیدھا شاہ جمال میلہ دیکھنے چلا گیا۔ رات کو ایک بجے شاہ جمال پہنچ گیا تھا۔ باغبانپورہ سکھ نہر سے سیدھا رکشے میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اس نے یہ پوچھنے پر بتایا۔

اس سوال کے جواب میں کہ محلّہ کا کوئی شخص اسے میلہ میں ملا تو اس نے بتایا کہ چھ بجے صبح اسے اپنے محلّہ کے اشخاص جمشید گڈو، بلال چرغہ والا اور یاسین جو کہ اس کی دکان کے سامنے ریڑھی لگاتا ہے ملے تھے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ میلہ میں اکیلے کیوں گیا تھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اپنے ایک دوست نذیر کے ساتھ پروگرام بنایا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل پر اس کے ہمراہ جانا تھا، لیکن نہ جانے وہ کیوں نہ پہنچ سکا۔ پھر یہ اکیلے چلا گیا۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ روزانہ رات کو بیکری کا سامان لینے جاتا تھا۔ تو اس نے بتایا کہ صبح سویرے سائیکل پر ایک شخص اسے بیکری کا سامان دے جاتا ہے لیکن آج رات وہ خود ہی سامان لینے چلا گیا تھا۔ پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتایا کہ جمشید گڈو کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر وہ اپنے گھر سات بجے صبح پہنچا۔ اس کے ہمراہ اس کا پڑوسی یاسین بھی تھا۔ جمشید گڈو نے ان دونوں کو اس کے گھر کے سامنے اتارا۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا سیدھا گھر گیا تھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اپنے ساتھی یاسین کو کہا کہ نزدیک ہی ہوٹل سے ناشتہ کر لیں۔ ہوٹل پر ناشتہ کیا پھر چائے پی۔ ساڑھے سات بجے کا وقت ہو گا کہ اس کے ایک پڑوسی نے اسے ہوٹل پر بیٹھا دیکھ کر کہا کہ تم فوراً اپنے گھر جاؤ وہاں کچھ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گھر گیا۔ بالائی منزل کی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ دیکھا کہ بیوی فریدہ خون میں لت پت پڑی ہے جو مر چکی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر وہ غش کھا کر گر پڑا۔ کافی دیر بعد اسے ہوش آئی۔ معلوم ہوا کہ اس کے بچے بھی ذبح کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ ''ہائے میرا راجو بھی چلا گیا۔'' پوچھنے



پر اس نے بتلایا کہ راجو کا نام عمیر ہے پیار سے اسے راجو کہتے ہیں۔ تین سال کا یہ بیٹا اسے بہت پیارا تھا۔ اس نے پھر کہا کہ میرا راجو بھی چلا گیا۔

ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ بڑا بیٹا شاہد ٹیلی ویژن پر فلم دیکھنے کیلئے اپنی دادی کے گھر آٹھ بجے کے قریب چلا گیا تھا اور وہاں ہی سو گیا تھا۔ مزید بتایا کہ اس کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا اور نہ ہی اس کے چہرہ پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نظر آئے۔ سلیم باؤ کے بیان کے دوران میں اس کی Face Reading کرتا رہا۔ اس کے چہرہ پر کسی قسم کی پریشانی اور غم کے آثار نہ تھے اور وہ بڑے اعتماد سے جواب دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ذبح کر کے قتل کیے گئے ہیں۔ بڑی بیٹی سعیدہ کی عمر 8 سال، فائزہ کی عمر 6 سال، حنا کی عمر ساڑھے چار سال، زہرہ کی عمر 1 سال اور بیٹے عمیر عرف راجو کی عمر 3 سال ہے۔ ''ہائے میرے بچے کہاں گئے؟'' اس نے مکارانہ انداز میں کہا۔ میں نے اس کو مشکوک سمجھ لیا۔ لیکن یہ مرحلہ بہت نازک تھا۔ کافی لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے جو مشتعل ہو کر جلوس کی شکل اختیار کر کے دکانیں زبردستی بند کروا رہے تھے۔ ٹائروں کو آگ لگا کر ٹریفک بھی بند کرائی ہوئی تھی۔ انتہائی محتاط انداز سے گھر کے سربراہ سلیم باؤ سے گفتگو کرنی تھی۔

ایس پی سی آئی اے اور ایس پی کینٹ اس مکان کے ملحقہ مارکیٹ میں ایک دکان کے اندر بیٹھ کر اہل محلّہ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے اور مشتعل لوگوں کو ٹھنڈا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ میں نے ایس پی سی آئی اے کو علیحدگی میں بلایا اور ان کو بتایا کہ بچوں کا باپ سلیم عرف باؤ مجھے کافی حد تک مشکوک نظر آتا ہے۔ اس کی صحیح طور پر انٹیروگیشن کے بعد ہم صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ سلیم باؤ نے جو بیان دیا میں نے انہیں بتایا۔ ہم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس کے بیان کی روشنی میں تفتیش شروع کریں۔ اس کے بیان کی تصدیق کرنے پر معلوم ہوا کہ نہ تو وہ سنگھ پورہ میں اللہ دتہ کی بیکری پر گیا ہے اور نہ ہی باغبانپورہ سکھ نہر کی طرف گیا ہے۔ اس دوران بودی دودھ والے نے بتلایا کہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا وقت ہوگا سلیم باؤ اس کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ پہلے جب گزرتا تھا سلام دعا کرتا تھا لیکن رات کو وہ خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ بودی دودھ والے کی دکان سلیم باؤ کے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے اور سلیم باؤ وہاں سے اپنی ماں کے گھر کی طرف جاتا ہوا دیکھا گیا۔

سلیم عرف باؤ کے بھائی طارق کے بیان پر مقدمہ قتل تھانہ شالیمار میں درج ہو چکا تھا۔ ہم



نے زنانہ پولیس سادہ لباس میں مستورات کے اندر مناسب ہدایات دے کر بھیجی تھی۔انہوں نے آ کر رپورٹ دی کہ فریدہ مقتولہ کی والدہ، بہنیں اور بھائی سیالکوٹ سے آ گئے ہیں۔فریدہ کی والدہ اپنے داماد سلیم باؤ پر الزام لگا رہی ہے اور بین کر رہی ہے کہ ہائے اس نے فریدہ کو سلیم کے ساتھ کیوں بھیجا۔زنانہ پولیس نے بتایا کہ فریدہ کی والدہ کہہ رہی ہے کہ فریدہ روٹھ کر بچوں کو لے کر ان کے پاس گئی ہوئی تھی۔پندرہ روز ہوئے ہیں کہ سلیم باؤ اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھنے کی یقین دہانی کرا کر لایا ہے۔فریدہ کہتی تھی کہ سلیم اسے چھری دکھا کر قتل کی دھمکیاں دیتا تھا اور اسے ہر وقت خوف زدہ رکھتا تھا۔ہم نے فریدہ کی والدہ اور بھائی اور چچا کو بلوایا۔''ہماری بیٹی کو اس کے خاوند سلیم باؤ کے سوا کوئی نہیں قتل کر سکتا'' انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا اور یہ بھی کہا کہ فریدہ اور اس کے بچوں کی میتیں بھی وہ سیالکوٹ میں دفن کریں گے۔سلیم کے سسرال کی باتیں جب اہل محلّہ نے سنیں تو ان میں پیدا شدہ اشتعال ٹھنڈا ہو گیا۔اور لوگوں میں عام چرچا ہونے لگا کہ یہ سب کچھ بچوں کے باپ سلیم نے کیا ہے۔ان حالات میں ہمیں سلیم سے پوچھ گچھ کرنے کا موقع مل گیا۔ہم اسے اعتماد میں لے کر تھانہ باغبانپورہ لے گئے۔غور سے دیکھا تو اس کے گلے پر خراش کے نشانات تھے اور دائیں شہادت والی انگلی پر تیز دھار آلہ کا کٹ کا زخم موجود پایا۔

اس سے پوچھا کہ جب تمہارے محلّہ کے کافی لوگ میلہ دیکھنے شاہ جمال گئے تھے اور تم بھی ایک بجے رات وہاں پہنچ گئے تو کیا وجہ ہے کہ چھ بجے صبح تک تمہیں اپنے محلّہ کا کوئی شخص نہ ملا۔اس نے کہا کہ اسے نیند آئی ہوئی تھی دربار شاہ جمال کے قریب ایک تمبو میں وہ سو گیا۔چھ بجے صبح اس کی آنکھ کھلی۔''تم میلہ دیکھنے گئے تھے اور جاتے ہی کیوں سو گئے تھے''؟ اس سے پوچھا۔اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ساتھ ہی انگلی پر زخم گلے پر خراش وغیرہ کے متعلق اور اس کا سارا بیان جھوٹا ثابت ہونے پر اس پر سوالات کی بوچھاڑ کی گئی تو وہ گم صم ہو گیا اور اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔اس کے بیٹے شاہد نے بتلایا کہ اسے باپ نے کہا تھا کہ تم دادی کے گھر فلم دیکھنے چلے جاؤ اور وہیں ہی سو جانا۔اب ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ سب کچھ اس نے خود کیا ہے محض اس کے منہ سے اگلوانا باقی ہے۔اس اثنا میں ایک اے ایس آئی نے آ کر بتایا کہ ایک شخص علیحدگی میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔میں اور ایس پی۔سی آئی اے اس کو علیحدہ کمرہ میں لے گئے۔اس نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی یقین دہانی پر بتایا کہ سلیم کے مکان کے سامنے اس کا مکان ہے۔یہ بالائی منزل پر سوئے ہوئے تھے۔سلیم بھی بالائی منزل پر رہتا ہے۔ان کی کھڑکی سے سب کچھ نظر آتا ہے۔تقریباً 3 بجے


Huma

رات کا وقت ہوگا کہ بیوی نے اسے جگایا کہ سلیم کے گھر کوئی واقعہ ہو رہا ہے۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا کہ سلیم اپنے کمرہ میں موجود تھا۔ اس کا جسم کمر سے اوپر اوپر نظر آ رہا تھا جو ننگا جسم تھا۔ دو مرتبہ اس نے لائٹ بند کی اور جلائی ایک بچی کی آواز سنی کہ ''ابو نہ مارو''۔ تھوڑی دیر کے بعد خاموشی ہوگئی اور ان کی لائٹ بالکل بند ہوگئی۔ شاید میاں بیوی کا جھگڑا ہوگا، انہوں نے سمجھا۔ آج صبح جب اس واقعہ کا علم ہوا تو پہلے تو یہ ڈر کے مارے خاموش رہے۔ پھر انہوں نے سوچا جو کچھ دیکھا ہے پولیس کو بتا دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ پولیس کو اس سے کوئی مدد مل جائے۔ ہم نے اس شخص کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

سلیم کے کمرہ جہاں بچے قتل ہوئے میں لگے ہوئے بجلی کے سوئچ دیکھے تو ایک پر خون لگا ہوا تھا۔ اس خون کو حاصل کر کے سلیم کے خون کے ساتھ تجزیہ کرایا تو مطابقت پائی گئی۔

اب ہمیں مکمل یقین ہوگیا۔ ہم نے سلیم سے سوالات کیے اور اس کے چہرہ کا بغور مشاہدہ کرتے رہے۔ ہم نے تقریباً چھ گھنٹے مسلسل اس سے انٹیروگیشن کی۔ وہ انتہائی زیرک، مکار، چالاک اور پختہ کار تھا۔ لیکن تفتیشی ٹیم جن میں میرے علاوہ چوہدری حامد مختار گوندل ایس پی سی آئی اے تھے کے سامنے وہ زیادہ دیر پختہ نہ رہ سکا اور بالآخر سچ بتانے پر آمادہ ہوگیا۔

اس نے بتایا کہ اسے اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ تھا۔ اور یہ بھی شبہ تھا کہ بڑے بیٹے کے علاوہ باقی سب بچے اس کے نہیں ہیں۔ دو بجے رات اس کی بیوی نیچے لیٹرین میں پیشاب کرنے گئی۔ جب کافی دیر واپس نہ آئی تو اسے شک گزرا۔ اس نے اوپر سے دیکھا تو ایک شخص نیچے دروازہ سے نکل کر تیزی سے جا رہا تھا۔ اس کو شک ہوا کہ یہ شخص فریدہ کو مل کر جا رہا ہے۔ اس نے چھری اٹھائی، کرتہ اور شلوار اتار دیئے، ایک پرانا تولیہ کمر میں باندھ لیا، فریدہ سیڑھیوں سے اوپر ڈیوڑھی میں آئی تو اس نے چھری سے اس کی چھاتی اور پیٹ میں وار کیے۔ وہ گر پڑی تو اس نے گلے پر چھری پھیر دی۔ اسی اثنا میں اس کی بیٹی سعدیہ جاگ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا کہ ابو امی کو نہ مارو۔ اس نے اس کی گردن پر بھی چھری پھیر دی۔ پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ باقی بچوں کے گلوں پر بھی چھری پھیر دی۔ جب وہ سوئے ہوئے تھے لائٹ جلا کر اس نے دیکھا تو سب مر چکے تھے۔ اس کی دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی پر بھی چھری سے زخم آ گیا۔ اس نے نیچے نلکا پر خون صاف کیا۔ چھری دھو کر شلوار میں چھپا لی۔ شالیمار چوک سے رکشہ میں بیٹھ کر شاہ جمال میلہ پر چلا گیا۔ راستہ میں لوہے والی چھوٹی پلی اور ریلوے پھاٹک کے درمیان چلتے رکشہ سے چھری نہر

میں پھینک دی۔ شاہ جمال میلہ پر اس لئے گیا تھا کہ وہاں اس کے محلہ کے لوگ اسے دیکھ لیں گے کہ یہ بھی میلہ پر آیا ہوا ہے اور اس طرح سے اس پر کوئی شک نہ کرے گا۔

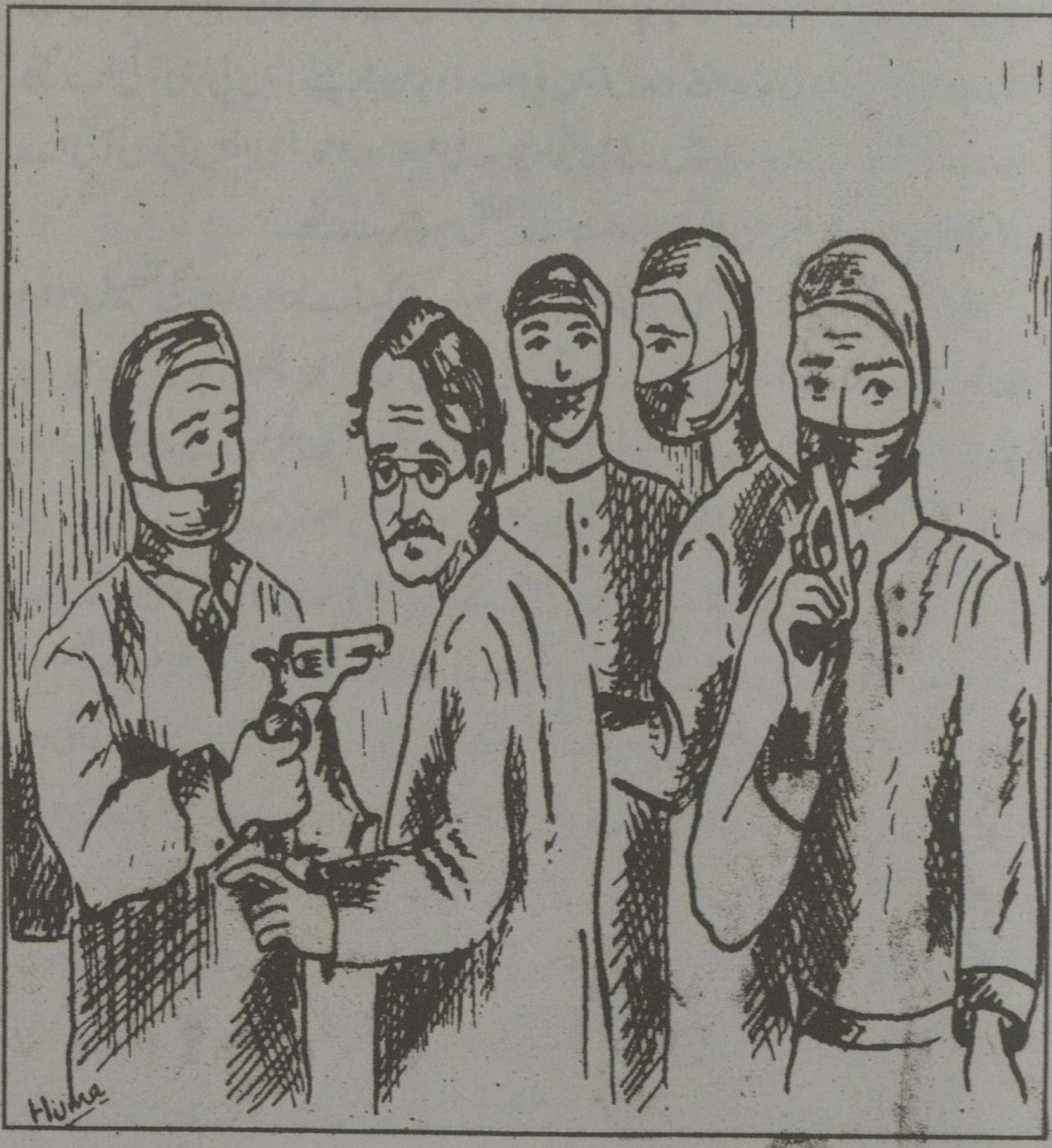
اس دوران فریدہ اور پانچ بچوں کی میتیں فریدہ کے میکے والے سیالکوٹ لے کر جا چکے تھے۔ ساری کارروائی کے دوران سلیم باؤ نے ایک لمحہ بھی بچوں کو یاد نہ کیا اور نہ ہی ان کے چہرے دیکھنے کی کوئی خواہش ظاہر کی۔ سلیم کو باقاعدہ مقدمہ قتل میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس نے نہر کی نشاندہی کی جہاں چھری پھینکی تھی۔ یہاں پانی کافی گہرا تھا۔ نہر بند کرنے کے سوا چھری تلاش کرنی ممکن نہ تھی۔ محکمہ انہار کے سینئر افسروں کو نہر بند کرنے کیلئے تحریری چٹھی لکھی گئی جنہوں نے تعاون کرتے ہوئے نہر بند کرا دی۔ نہر سے تلاش کرنے پر چھری برآمد ہو گئی۔ سلیم باؤ نے عدالت میں بھی تسلیم کر لیا کہ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کیا ہے۔ اس طرح یہ معمہ حل ہو گیا۔

علاقہ کے لوگ اس واقعہ کو بہت بڑی تخریب کاری سے منسوب کر رہے تھے۔ انہوں نے پولیس کی کارکردگی کو سراہا۔ بدقسمت سلیم باؤ نے خود ہی اپنے چمن کو برباد کر دیا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ڈپٹی کمشنر کے گھر
خونیں ڈاکہ



1994ء

''چار ڈاکوؤں نے 264 نیو مسلم ٹاؤن میں شاہین اصغر ڈپٹی کمشنر کے گھر ڈاکہ ڈالا ہے۔ اس کو قتل کر کے گھر سے زیورات اور نقد رقم لوٹ کر فرار ہو گئے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب اور ایس ایس پی صاحب نے سخت ناکہ بندی کا حکم دیا ہے'' یہ پیغام وائرلیس پر نشر ہوئے۔ میں نے سنا جب کہ میں راوی پل پر مسروقہ گاڑیوں کی چیکنگ ٹیم کی نگرانی کر رہا تھا۔ مورخہ 20 جون 1994 کو 9 بجے رات کی بات ہے جب کہ ان دنوں میری تعیناتی ایس پی سی آئی اے تھی۔ میں اپنے گن مینوں کے ہمراہ سیدھا موقع پر پہنچا۔ تقریباً دس بجے رات کا وقت ہوگا۔ شاہین اصغر کی لاش پوسٹ مارٹم کیلئے مردہ خانہ میو ہسپتال بھجوائی جا چکی تھی۔ وسیع لان کے ساتھ کافی بڑا گھر تھا جس کے ڈرائینگ روم میں چوہدری حامد مختار گوندل ایس پی صدر ڈویژن جو پہلے ایس پی سی آئی اے تھے اور ان سے سی آئی اے کا چارج میں نے لیا تھا، چوہدری شفقات احمد ڈی ایس پی سی آئی اے ماڈل ٹاؤن اور چند دیگر افسران بیٹھ کر واردات کے متعلق سوچ رہے تھے۔

سلام کرنے کے بعد میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔ محمد حنیف چوکیدار نے واردات کی تفصیل موجود افسران کو بتلائی۔ سامنے قالین پر ایک نیلے رنگ کی جینز کی خون آلود پتلون پڑی تھی۔ میرے استفسار پر چوہدری حامد مختار گوندل ایس پی نے بتلایا کہ یہ پتلون ایک ملزم کی ہے جو شاہین اصغر کے ساتھ گتھم گتھا کے دوران پتلون خون آلود اتار کر اور شاہین اصغر کے کپڑے پہن کر فرار ہو گیا۔ یہ بات محمد حنیف چوکیدار نے بتلائی۔ اس نے مزید بتلایا کہ چاروں ملزمان نے نقاب اوڑھے ہوئے تھے، جن میں دو ملزمان کے قد لمبے اور دو کے چھوٹے تھے۔ ایک ملزم پتلے جسم اور ایک بھاری جسم کا تھا جب کہ دو ملزمان درمیانے جسم کے تھے۔ چہرے نقاب میں چھپے ہونے کی وجہ سے صحیح حلیہ اور عمر وغیرہ بتانے سے قاصر ہے۔ شاہین اصغر نے واردات کے دوران ایک ملزم کو پکڑ لیا تھا۔ دوسرے ملزم نے فائرنگ کر کے شاہین اصغر کو مضروب کیا جو بعد میں جان بحق ہو گیا۔ میں نے قالین پر پڑی ہوئی ملزم کی واگزاشتہ خون آلود پتلون کی جیبیں اور سٹکر چیک کرنے کیلئے پتلون کو اٹھایا تو گوندل صاحب ایس پی صدر فوراً بولے کہ پتلون کو اچھی طرح تین چار بار چیک کر لیا ہے۔ اس کی جیبوں سے کوئی چیز نہیں ملی جو ملزمان کا سراغ لگانے میں کار آمد ثابت ہو سکے۔ چونکہ

میں بھی اپنی عادت سے مجبور تھا میں نے اس کی جیبیں چیک کرنی شروع کیں۔ جب میں نے پینٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری جیب سے یہ جیب چھوٹی ہے۔ لیکن وہ کلف لگنے کی وجہ سے چمٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو زور سے دبانے پر جب مکمل جیب کھل گئی تو میری انگلیوں سے کوئی چیز ٹچ ہوئی۔ میں نے ہاتھ کی دو انگلیوں میں پکڑ کر آرام سے اسے باہر نکال لیا۔ دیکھا تو وہ ایک کاغذ کا چھوٹا ٹکڑا تھا جو لپٹا ہوا تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کاغذ پتلون کی جیب میں تھا اور بعد میں پتلون کی دھلائی ہونے کی وجہ سے جیب کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اس کاغذ کو کھولا۔ اس پر ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا جو بھیگ جانے کی وجہ سے ہندسے کافی مدھم ہو چکے تھے۔ لیکن غور سے پڑھنے پر نمبر نوٹ کر لیا۔ باقی افسران موقع پر ہی تھے کہ میں چوہدری شفقات احمد ڈی ایس پی کو ہمراہ لے کر اپنے دفتر چلا گیا۔

سمن آباد ایکسچینج کے علاقہ کا نمبر تھا۔ فوری طور پر وہاں سے اس ٹیلی فون کا ایڈریس لیا جو کہ ندیم شہید روڈ ملت پارک لاہور کا تھا۔ اس ایڈریس کی خفیہ نگرانی کر کے تین بجے رات ڈی ایس پی نے ریڈ کیا۔ وہاں سے اصل دو ملزمان زاہد عرف پویا ساکن ندیم شہید روڈ ملت پارک لاہور اور ریاض ساکن نیلم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور مل گئے اور بیگ میں پستول اور شاہین اصغر کے گھر سے لوٹا ہوا مال بھی مل گیا۔ ان کی نشاندہی پر باقی دو ملزمان محمد حسین اور علی عمران پپو ساکن لبرٹی مارکیٹ لاہور بھی تھانہ مناواں کے علاقہ سے چھ بجے صبح تک پکڑ لیے گئے۔ سب کو گرفتار کر کے چالان کیا۔ ان ملزمان کی گرفتاری کے لیے شفقات احمد ڈی ایس پی رات بھر جاگے اور سخت محنت کے بعد گرفتار کیا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ پولیس افسر کو تفتیش کے دوران ہر چیز کو انتہائی باریک بینی سے دیکھنا چاہیے۔

حبیب بینک لیڈیز برانچ
میں ڈاکہ



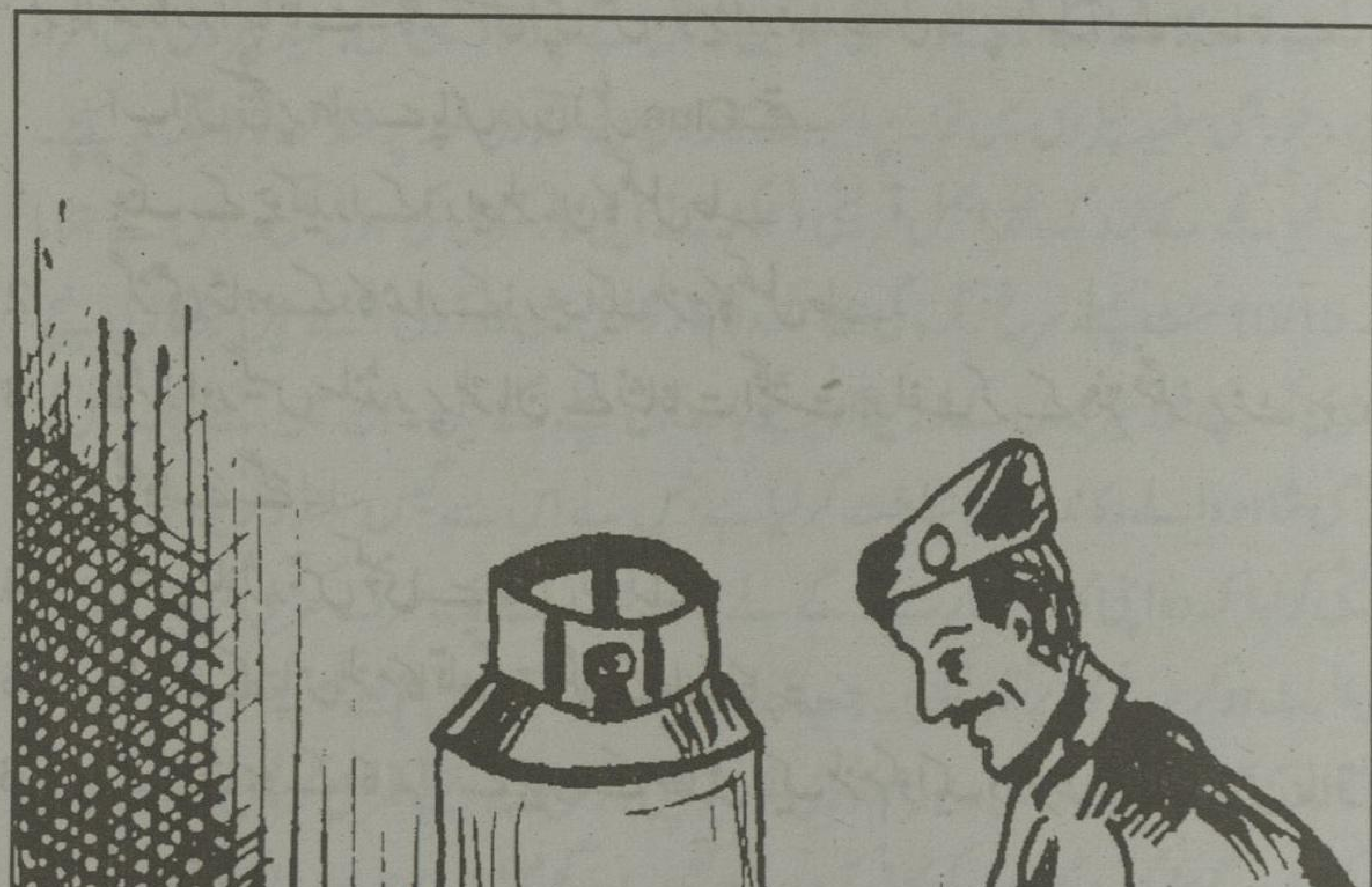
1986ء

دسمبر 1986ء کی ایک شام ایک شخص نے حبیب بینک لیڈیز برانچ لبرٹی مارکیٹ گلبرگ کا گیٹ کھڑکایا۔ بینک کے اندر سے چوکیدار آیا اس نے تھوڑا سا گیٹ کھول کر دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ اس شخص نے ایک پیک شدہ ڈبہ آگے کرتے ہوئے کہا کہ یہ مینجر صاحب کا تحفہ دبئی سے آیا ہے ان کو دے دینا۔ چوکیدار نے پوچھا کہ کس نے بھیجا ہے تو اس شخص نے کہا کہ بھیجنے والے کا مکمل پتہ اس ڈبہ کے اندر موجود ہے۔ چوکیدار گیٹ کے اندر کھڑے ہو کر ڈبہ پکڑنے لگا تو اس شخص نے اچانک دھکا دے کر اس کو گرا دیا اور خود اندر جا کر اسے قابو کر لیا۔ اسی اثنا میں اس شخص کے تین اور ساتھی بینک کے اندر داخل ہو گئے جنہوں نے مل کر چوکیدار کو بینک کے اندر رسیوں سے باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گیس سلنڈر بینک کے اندر لے آئے جو کہ انہوں نے بینک کے باہر کھڑی ایک کار میں رکھا ہوا تھا۔ گیس سلنڈر کے ذریعہ شب بھر بینک کے لاکرز کو توڑتے رہے۔ دوسرے روز بینک میں چھٹی تھی۔ ملزمان نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور وہ لاکرز توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلنڈر کی گیس ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ مزید کارروائی جاری نہ رکھ سکے۔ تقریباً تیس لاکھ کے کرنسی نوٹ اور کچھ سونے کے زیورات ان کے ہاتھ لگے جو لے کر فرار ہو گئے۔ گیس سلنڈر اور پلاس پیچ کس وغیرہ بینک کے اندر ہی چھوڑ گئے۔ دو بجے دن دوسرا چوکیدار آیا۔ اس نے دیکھا کہ بینک کے دروازہ کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ اس نے سمجھا کہ چوکیدار باہر سے کوئی چیز لینے گیا ہوگا۔ اس نے اس کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ بالآخر وہ بینک کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ دیکھا کہ چوکیدار رسیوں سے جکڑا پڑا ہے اور بینک کے لاکرز وغیرہ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے ساتھی چوکیدار کو رسی کھول کر آزاد کیا اور فون کر کے بینک مینجر کو اطلاع کی۔ مقامی تھانہ گلبرگ کی پولیس بھی پہنچ گئی جنہوں نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی۔

میں ان دنوں C.I.A لاہور کا بطور ڈی۔ ایس۔ پی انچارج تھا۔ جب 10 روز تک اس وقوعہ کو ٹریس کرنے میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو ایس ایس پی لاہور نے تفتیش میرے سپرد کر دی۔ میں نے موقع کا بغور ملاحظہ کیا۔ تھانہ گلبرگ کے افسر انچارج کو موقع پر طلب کیا جس نے میرے استفسار پر بتلایا کہ لاکرز اور گیس سلنڈر پر ملزمان کے لگے ہوئے نشانات، لفٹ کروا کر دفتر فنگر

پرنٹس بھجوائے جا چکے ہیں۔ چوکیدار جس کو رسیوں سے باندھا گیا تھا اس کا تفصیل کے ساتھ بیان تحریر کیا اور ملزمان کے حلیوں کے متعلق انتہائی باریک بینی سے دریافت کیا گیا۔ افسر انچارج تھانہ سے میں نے گفٹ والے ڈبہ اور باقی تمام سامان سلنڈر وغیرہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ یہ تمام چیزیں تھانہ کے مال خانہ میں موجود ہیں۔

بینک کے عملہ اور چوکیدار سے ضروری دریافت کے بعد ایک اہم انکشاف ہوا کہ ملزمان کے پاس سرخ رنگ کی 82 ماڈل کرولا کار تھی جو بینک کے باہر کھڑی رہی۔ میں سیدھا تھانہ گلبرگ گیا۔ گفٹ والے ڈبہ میں ایک چھوٹا سکوٹر بچوں کا کھلونا بند تھا۔ ڈبہ پر جو لیبل وغیرہ لگا ہوا تھا وہ میں نے نوٹ کر لیا اور گیس سلنڈر اپنی گاڑی میں رکھوا کر C.I.A ہیڈ کوارٹر اپنے دفتر پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں ایک بات کھٹک رہی تھی کہ سلنڈر جس کمپنی کا بنا ہوا ہے اس کا نام وغیرہ اس پر ضرور کندہ ہوگا۔ بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ سلنڈر پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن صحیح طور پر پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے محمد اجمل قریشی انسپکٹر اور محمد اسحاق سب انسپکٹر کو کہا کہ سلنڈر کو اچھی طرح رگڑ کر صاف کرائیں اور سرف منگوا کر اسے اچھی طرح دھلائیں۔ جب سلنڈر اچھی طرح دھل کر صاف ہو گیا تو اس پر کمپنی اور نمبر وغیرہ قابل خواندگی پائے۔ میں نے محمد اجمل قریشی انسپکٹر کو کہا کہ سلنڈر کو گاڑی میں رکھ کر متعلقہ کمپنی جو باغبانپورہ کے علاقہ میں تھی وہاں لے جا کر ان سے معلوم کریں کہ یہ سلنڈر انہوں نے کب اور کس کو دیا تھا۔ دو گھنٹے کے بعد انہوں نے واپس آ کر بتلایا کہ سر جی مبارک ہو۔ کمپنی نے جس شخص کو سلنڈر دیا تھا اس کا نام و پتہ ٹریس ہو گیا ہے۔ یہ شخص جس کو سلنڈر کمپنی سے Issue ہوا تھا گڑھی شاہو کا رہائشی تھا۔ میں نے انسپکٹر کو کہا کہ فوری طور پر اس آدمی سے دریافت کرے اور پھر میرے پیش کرے۔ کچھ دیر بعد محمد اجمل قریشی اس شخص کو اپنے ہمراہ لایا جس نے بتلایا کہ گڑھی شاہو بازار میں اس کی دکان ہے اور وہ گیس کے سلنڈروں کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ سلنڈر وہ کمپنی سے لایا تھا۔ آئندہ جس شخص کو بیچا تھا اس کا رجسٹر میں باقاعدہ اندراج ہے۔ رجسٹر سے اس شخص کا نام و پتہ نوٹ کر کے محمد اجمل قریشی انسپکٹر کو بھیجا کہ پہلے خفیہ طور پر اس شخص کا پتہ کرایا جاوے اور ٹریس ہونے پر اس کو پکڑ کر دریافت کیا جاوے۔ انسپکٹر نے واپس آ کر بتلایا کہ وہ رجسٹر میں دیئے ہوئے پتہ پر گیا تھا۔ پتہ جو کہ قلعہ گوجر سنگھ کا ایریا ہے درست ہے لیکن اس نام کا کوئی شخص وہاں یا اس کے گردونواح میں نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ اس شخص نے بوگس نام تحریر کروایا ہے۔ گڑھی شاہو والے دکاندار سے اس شخص کا مکمل حلیہ پوچھ کر نوٹ کیا۔ اس نے اس سوال پر کہ


Huma

کبھی اس شخص کو پہلے بھی دیکھا تھا بتلایا کہ گڑھی شاہو کے بازار میں ایک دفعہ اسے گزرتے دیکھا تھا۔

اب یہاں آ کر ہماری تفتیش کو بریک لگ گئی۔ عام طور پر تفتیش میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک سٹیج پر آ کر بلائنڈ کارنر آ جاتا ہے۔ پھر تفتیشی اپنی عقل، گویڑ اور مہارت کی بنا پر سلسلہ آگے بڑھاتا ہے۔

اب اس سٹیج پر ہمارے پاس درج ذیل Clue تھے۔

1 بینک کے چوکیدار کے ذریعہ ملزمان کا مکمل حلیہ۔

2 گڑھی شاہو کے دکاندار کے ذریعہ ایک ملزم کا مکمل حلیہ۔

3 لاکرز اور گیس سلنڈر پر ملزمان کے نشانات انگشت جو لفٹ کر کے دفتر فنگر پرنٹ بیورو بھجوائے گئے۔

4 گیس سلنڈر جس کمپنی سے حاصل کیا گیا۔

5 دکاندار کے پاس ملزم کا قلعہ گوجر سنگھ کے علاقہ کا پتہ۔

6 گڑھی شاہو کے دکاندار کے بیان کے مطابق ایک ملزم کو ایک دو مرتبہ پہلے بھی اس علاقہ میں دیکھنا۔

7 ملزمان کا واردات میں سرخ رنگ کی 82 ماڈل ٹیوٹا کرولا کار استعمال کرنا۔

8 بچوں کا کھلونا سکوٹر بند ڈبے میں بطور گفٹ پیش کرنا۔

چنانچہ میں نے C.I.A کے ذہین اور تجربہ کار ملازمین کو اکٹھا کیا اور مندرجہ بالا Clue کے متعلق ان کو اچھی طرح بریف کر کے سفید کپڑوں میں قلعہ گوجر سنگھ اور گڑھی شاہو کے علاقہ میں روانہ کیا کہ وہ ضروری معلومات حاصل کریں۔ شام کو ملازمین واپس آئے تو میں نے علیحدہ علیحدہ ان سے رپورٹ لی۔ محمد اسحاق سب انسپکٹر نے مجھے بتلایا کہ وہ گڑھی شاہو کے علاقہ میں پھر کر اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اس کے ایک خاص آدمی نے بتلایا کہ گڑھی شاہو سینما کے قریب ایک شخص نے تقریباً ایک ماہ قبل ایک چوبارہ کرایہ پر لیا ہوا ہے۔ اس کے پاس سرخ رنگ کی 82 ماڈل کی ٹیوٹا کرولا گاڑی بھی ہے اور اس کا حلیہ اس شخص سے ملتا ہے جس نے گڑھی شاہو کے دکاندار سے گیس کا سلنڈر خریدا تھا۔ مزید کہا کہ وہ چوبارہ دیکھ آیا ہے۔ مین روڈ کی طرف سے سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔

میں نے محمد اجمل قریشی انسپکٹر اور محمد اسحاق سب انسپکٹر کو کہا کہ پرائیویٹ گاڑی میں سفید

کپڑوں میں جا کر اس چوبارہ کے نزدیک مین روڈ پر گاڑی کھڑی کر کے نگرانی کریں اور گڑھی شاہو والے دکاندار کو ملزم کی شناخت کیلئے ہمراہ لے جائیں۔ نیز سرکاری اسلحہ گاڑی کے اندر چھپا کر رکھ لیں۔

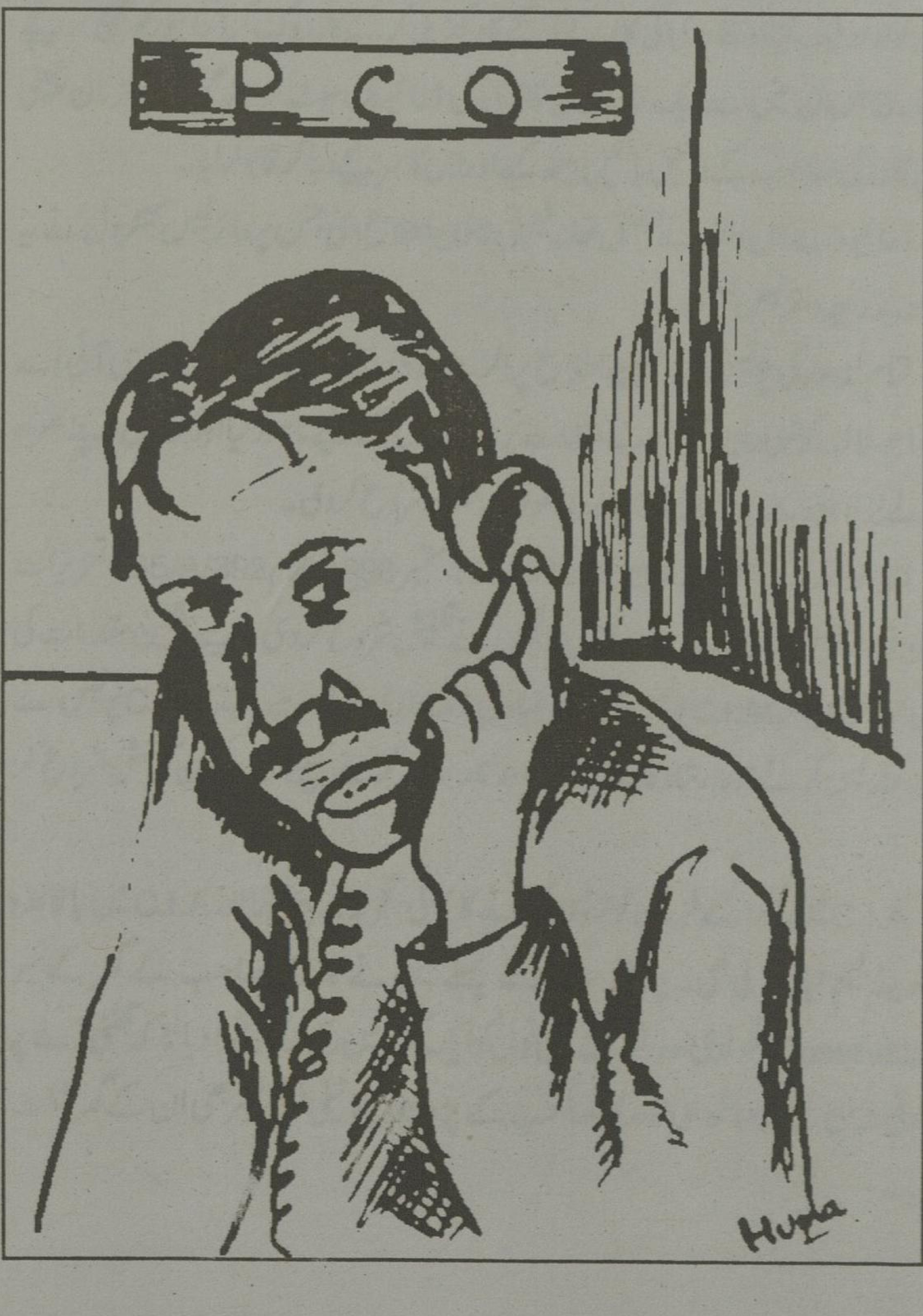
تقریباً 9 بجے رات انسپکٹر نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ جناب آپ گڑھی شاہو چوک کے کارنر پر سگرٹوں والے کھوکھا کے سامنے فوراً پہنچ جائیں۔ میں نے چار ملازمین مسلح سفید کپڑوں میں ہمراہ لیے۔ خود بھی سفید کپڑوں میں تھا۔ پرائیویٹ کار میں بیٹھ کر فوری طور پر متذکرہ بالا جگہ پر پہنچے۔ وہاں کھوکھے کے نزدیک محمد اجمل قریشی انسپکٹر نے اپنی کار کھڑی کی ہوئی تھی۔ اس نے بتلایا کہ 10/15 منٹ پہلے سرخ رنگ کی 82 کرولا کار گاڑی میں دو آدمی آئے ہیں جو گاڑی نیچے کھڑی کر کے خود سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر چوبارہ میں چلے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کو گڑھی شاہو والے دکاندار نے شناخت کر لیا ہے جس نے اس سے گیس سلنڈر خریدا تھا۔ انسپکٹر قریشی کو کہا کہ وہ اپنی کار اس کار سے آگے لے جا کر سڑک کے ایک طرف کھڑی کر دیں اور کار میں الرٹ ہو کر سرخ کار پر نظر رکھیں۔ جب آدمی اوپر سے آ کر کار میں بیٹھنے لگیں تو فوراً اپنی کار ان کی کار کے آگے کھڑی کر لیں۔ اور ہم فوری طور پر اپنی کار ان کے پیچھے کھڑی کر لیں گے اور ان کو قابو کر لیں گے سڑک پر گاڑیوں کی کافی آمدورفت تھی۔ اور کچھ گاڑیاں ادھر ادھر سڑک پر کھڑی بھی تھیں۔ ہماری کاروں کے کھڑا ہونے کا قطعاً شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ہم دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر الرٹ ہو کر پوزیشن سنبھال لیں اور سرخ کار پر اپنی نظریں جمائے رکھیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد وہی اشخاص چوبارہ سے نیچے اترے۔ جب گاڑی کے دروازے کھول کر گاڑی کی سیٹوں پر بیٹھے ہی تھے ابھی تک گاڑی سٹارٹ نہیں کی تھی کہ یک لحہ ہماری گاڑیاں ان کی گاڑی کے آگے پیچھے لگ گئیں۔ انتہائی پھرتی کے ساتھ ہم نے ان دونوں کو قابو کر لیا اور بمعہ ان کی گاڑی C.I.A ہیڈ کوارٹر لے آئے۔ ان دونوں کے نام محمد یوسف اور نعمت علی معلوم ہوئے۔ گڑھی شاہو کے دکاندار نے محمد یوسف کو شناخت کر کے بتلایا کہ اس شخص نے اس سے گیس سلنڈر خرید کیا تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر جلدی سچ بولو گے تو فائدہ میں رہو گے ورنہ پنجابی کی مثال ''سو چھتر اور سو گنڈھے'' کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ محمد یوسف کے پاس اب سچ بولنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ سر جی! میں نے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ اس کے ساتھی نعمت علی اور ملازمین کو باہر نکال دیا گیا۔ اس نے بتلایا کہ جناب اس واردات میں ہم چار ملزم شامل ہیں۔ ایک تو یہ

نعمت علی میرے ساتھ ہی پکڑا گیا ہے۔ تیسرا ملزم فاضل حسین گڑھی شاہو اپنے گھر موجود ہوگا اور چوتھا ملزم محمد اکرم عرف بھولا میو ہسپتال میں اس وقت موجود ہے۔ اس کا چاچا وہاں داخل ہے۔ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ ہم دونوں بھی اب اس کے پاس جا رہے تھے کہ پکڑے گئے ہیں۔ ہم نے میو ہسپتال سے محمد اکرم عرف بھولا کو پکڑ لیا اور فاضل حسین ملزم گڑھی شاہو اپنے گھر سے قابو آ گیا۔ جملہ ملزمان نے واردات کرنی تسلیم کر لی اور ان سے لوٹی ہوئی رقم کرنسی نوٹ اور زیورات برآمد کر لئے گئے۔

بینک کے چوکیدار نے بھی شناخت پریڈ کے دوران ان کو شناخت کر لیا۔ اور فنگر پرنٹ بیورو سے بھی ان کے نشانات انگشت کی مطابقت ہوگئی۔ جملہ ملزمان کو چالان کیا۔

اب قارئین کے ذہن میں ایک سوال ابھرنے لگا ہوگا کہ ملزمان کے چوبارہ سے واپس آنے کا انتظار کیوں کیا گیا، ان کو چوبارہ میں قابو کیوں نہ کر لیا گیا؟ میں اس کی وضاحت کرتا چلوں کہ چوبارہ کو جانے والی سیڑھیوں کو دروازہ لگا ہوا تھا جو اندر سے بند تھا۔ چوبارہ کافی اونچا تھا اور اوپر سے مکانات کی چھتیں ملتی تھیں۔ اگر ہم جلد بازی کرتے تو ملزمان کا مکانات کی چھتوں کے ذریعہ فرار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

اغواء برائے تاوان



1996ء

لاہور میں ایک دور ایسا آیا کہ متمول گھرانے کے سرکردہ شخص کو اغوا کر لیا جاتا اور اسے محبوس رکھ کر تاوان کا مطالبہ کیا جاتا۔ اسی طرح قادری شادی ہال گڑھی شاہو لاہور کا مالک ارشاد قادری مورخہ 11 ستمبر 1996ء کو تقریباً 11/12 بجے رات اپنی کار ٹیوٹا کرولا LOA/72 میں فیصل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔ جب فیصل ٹاؤن راؤنڈ اباؤٹ کے نزدیک پہنچے تو پیچھے سے ایک تیز رفتار کار نے ان کو اوورٹیک کیا اور قادری کی کار کے آگے کار کھڑی کر کے کار روک کر ڈرائیور کو کھینچ کر نیچے اتار دیا۔ 3 ملزمان میں سے ایک قادری کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دو ملزمان پچھلی سیٹ پر قادری صاحب کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور اس کا سر نیچے دبا کر قابو کر لیا۔

ڈرائیور نے اس واقعہ کے متعلق تھانہ فیصل ٹاؤن اطلاع دی جس پر وائرلیس کنٹرول نے یہ واردات بذریعہ وائرلیس نشر کی۔

تمام لاہور کی پولیس اس سنگین اطلاع پر الرٹ ہوگئی۔ میں نے بطور ایس پی سی آئی اے اپنے تمام سٹاف کو ضروری اور مناسب مقامات پر ناکہ بندی کے لیے مامور کیا اور خود بھی اپنے ہمراہ گارڈ لے کر لاہور سے باہر جانے والے راستوں پر گشت شروع کر دی۔

اس واقعہ کے متعلق مقدمہ نمبر 218 مورخہ 12 ستمبر 1996ء جرم 365/A/392 تعزیرات پاکستان تھانہ فیصل ٹاؤن درج ہوا۔ مقامی پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔ ایسے سنگین مقدمات کی تفتیش اور ٹریس کرنا C.I.A پولیس کی بھی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لہٰذا C.I.A پولیس نے مجرمان کو ٹریس کرنے اور ارشاد قادری مغوی اور کار برآمد کرنے کیلئے رات دن کوشش شروع کر دی۔

C.I.A میں اغوا کے ملزمان کو ٹریس کرنے کا کافی تجربہ ہو چکا تھا اور C.I.A میں باقاعدہ ایک ٹرینڈ ٹیم تیار کر لی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے قادری صاحب کے گھر کے نمبر پر Observation لگوا دی اور دفتر کے ٹیلی فون کو ایک کمرہ میں رکھ کر تالہ لگوا دیا تاکہ گھنٹی آنے پر اسے کوئی نہ سن سکے۔ ساتھ ہی قادری صاحب کے پڑوسیوں کا ٹیلی فون نمبر بھی ان کے گھر شفٹ کرا لیا۔

قادری صاحب کے گھر ایک کمرہ خالی کرا لیا۔ اس میں دونوں ٹیلی فون سیٹ ایک دوسرے سے فاصلہ پر رکھ دیئے اور دونوں ٹیلی فون سیٹوں پر اچھے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسپکٹر مامور کر دیئے۔ ان کے انچارج کے طور پر چوہدری مشتاق حسین گوجر DSP انٹی کار لیفٹنگ سٹاف کو مقرر کر دیا۔ ایک سمجھدار انسپکٹر کی ڈیوٹی اس علاقہ کی نزدیکی ٹیلیفون ایکسچینج میں لگا دی۔ ہماری منصوبہ بندی کچھ اس طرح تھی کہ جب مجرمان تاوان مانگنے کیلئے قادری کے نمبر پر ٹیلیفون کریں تو دوسرے ٹیلی فون کے ذریعہ فوری طور پر ٹیلی فون ایکسچینج میں بٹھائے انسپکٹر سے رابطہ کر کے معلوم کیا جائے کہ کس ٹیلی فون نمبر سے کال آ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ٹیلی فون ایکسچینج کے عملہ کو ہم نے مکمل طور پر اعتماد میں لے لیا تھا۔ یہ کارروائی مورخہ 11 ستمبر 1996ء دو بجے دن تک مکمل کر لی۔ اس روز مجرمان کی طرف سے کوئی ٹیلی فون کال موصول نہ ہوئی۔ دوسرے روز مجرمان کی طرف سے تین کالیں موصول ہوئیں۔ ایک کال 10 بجے دن آئی۔ دوسری کال 3 بجے دن آئی اور تیسری کال 8 بجے رات آئی۔ تینوں P.C.O کے نمبر ٹریس ہوئے۔ 10 بجے دن والی کال جنرل ہسپتال کے قریب سے کی گئی۔ دوسری کال وحدت روڈ سے کی گئی اور تیسری کال ریگل چوک کے قریب سے کی گئی۔ کالوں کا دورانیہ آدھے منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ تینوں P.C.Os کے محل وقوع کا بھی پتہ کر لیا۔ لیکن کال کا دورانیہ کم ہونے کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔ ان کالوں میں ملزم نے ارشاد قادری کے بیٹے سے 50 لاکھ روپیہ تاوان کی ڈیمانڈ کی۔ دوسرے روز نئی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ جس جس علاقہ سے مجرمان کے ٹیلیفون کال آنے کی امید ہو سکتی تھی اس علاقے میں جتنے P.C.O تھے ان کی فہرست اس طرح بنائی گئی کہ جہاں P.C.O تھا اس کے نزدیک جو مشہور جگہ تھی اس کے نام سے P.C.O کا نام دیا گیا۔ اس طرح سے کل نوے P.C.Os, کی فہرست بنائی گئی۔ سفید پارچات میں پولیس ملازمین کی 15 ٹیمیں بنائی گئیں۔ ہر ٹیم میں ایک آفیسر اور 4 کانسٹیبل شامل کیے گئے جن میں 2 کانسٹیبلوں کو اسلحہ دیا گیا۔ ہر ٹیم کے انچارج کو ایک واکی ٹاکی وائرلیس سیٹ اور پرائیویٹ کار دی گئی۔ ہر ایک ٹیم کو چھ/چھ P.C.O, جو ایک دوسرے کے قریب تھے، کی فہرست دے کر ان کو وہ P.C.O دکھائے گئے۔ ٹیم کے انچارج کو ہدایت کی گئی کہ چھ P.C.O, کے درمیان والے کسی پوائنٹ پر کھڑے ہو جانا ہے اور وائرلیس سیٹ آن رکھنے ہیں۔ تمام 15 ٹیموں کو ایک مخصوص چینل دے دیا گیا۔ اس کے بعد SP/CIA یعنی میری کال کا انتظار کرنا ہے۔

جس P.C.O سے ملزمان ٹیلی فون کریں گے اس کے متعلق متعلقہ ٹیم کے انچارج کو فوری اطلاع دے دی جائے گی جو انتہائی پھرتی کے ساتھ کارروائی مکمل کریں گے۔ اس سلسلہ میں تمام ٹیموں کے انچارج کو مکمل بریف کر دیا گیا۔

ادھر ارشاد قادری کے گھر جو کنٹرول روم بنایا ہوا تھا، وہاں ارشاد قادری کا بیٹا ٹیلی فون سن رہا تھا۔ اس کو بریف کیا گیا کہ جب ملزمان کی کال برائے تاوان آئے تو بات لمبی کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ جتنی رقم کی ڈیمانڈ کریں انہیں منت سماجت کرنی ہے کہ رقم کچھ کم کریں۔ اس طرح سے گفتگو میں طوالت پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

اب اس طریقہ سے ہم نے کل نوے P.C.Os کو مکمل طور پر Cover کر لیا۔ تقریباً 3 بجے دن ملزمان کی طرف سے ارشاد قادری کے گھر کے نمبر پر ٹیلی فون کی کال آئی۔ ملزم نے ارشاد قادری کے بیٹے کو کہا ''ہاں بھئی کیہ سوچیا ای'' اور ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ میں نے تمام ٹیموں کے انچارج افسران کو وائرلیس کے ذریعہ الرٹ کر دیا۔ کافی انتظار کرانے کے بعد 8 بجے رات پھر کال آئی۔ ملزم اور ارشاد قادری کے بیٹے کی بات شروع ہوگئی۔ ٹیلیفون ایکسچینج میں نمبر ٹریس ہو گیا۔ وہاں ڈیوٹی پر مامور انسپکٹر نے مشتاق حسین DSP کو فوری طور پر ٹیلی فون کر کے بتلایا کہ ملی شوز مال روڈ کے P.C.O سے ملزم بات کر رہا ہے۔ میں ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ملی شوز مال روڈ کے ایریا کے ٹیم انچارج کو وائرلیس پر اطلاع دی کہ اس وقت ملی شوز مال روڈ کے سامنے P.C.O سے ملزم ٹیلی فون کر رہا ہے۔ اتفاق سے اس علاقہ کی ٹیم کی موجودگی اس PCO کے قریب تھی۔ انہوں نے ملزم کو عین اس وقت پیچھے سے قابو کر لیا جب وہ ابھی ٹیلی فون پر ارشاد قادری کے بیٹے سے تاوان کی بات کر رہا تھا۔ ٹیم کے انچارج نے بذریعہ وائرلیس اطلاع دی کہ ''مہمان کو اٹھا لیا ہے''۔ میں نے ان کو ہدایت کی کہ اس کو CIA ماڈل ٹاؤن لے چلیں۔ اس دوران میں معہ مشتاق حسین DSP ماڈل ٹاؤن CIA پہنچ گیا۔ وہاں چوہدری شفقات احمد CIA/DSP ماڈل ٹاؤن دفتر میں موجود تھا۔ ملزم مسمی محمد علی ولد محمد فاضل بھٹی ساکن ضلع قصور شناخت ہو گیا تھا۔ کیونکہ پہلے کئی مرتبہ ڈکیتی کی وارداتوں میں چالان ہو چکا تھا۔ اور CIA کے اکثر ملازمین اسے اچھی طرح سے جانتے تھے۔

محمد علی بھٹی ظالم، سفاک اور انتہائی خطرناک ڈاکو اور راہزن تھا۔ کئی مرتبہ پولیس کی تفتیش میں شامل ہو کر چالان ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی پختہ کار بھی تھا۔ اس کو Break کرنے کیلئے

انتہائی محنت اور مہارت کی ضرورت تھی۔ تقریباً ایک سال پیشتر میں نے اسے کار چوری کی واردات میں چالان کیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اسے اعتماد میں لینے کیلئے انٹیروگیشن کا آغاز کچھ اس طرح کیا۔

☐ محمد علی اُس مقدمہ میں کب ضمانت پر آئے ہو؟

○ سر جی! 7/8 ماہ سے ضمانت پر ہوں۔

☐ اس مقدمہ کے علاوہ اور کتنے مقدمات تمہارے خلاف ہیں؟

○ کل تعداد تو یاد نہیں 7/8 اور مقدمے ہوں گے۔

☐ کبھی کسی مقدمہ میں سزا بھی ہوئے ہو؟

○ نہیں سر جی! کبھی سزا نہیں ہوا۔ اکثر مدعی کے ساتھ صلح ہو جاتی ہے یا گواہ بٹھا لیتے ہیں۔

☐ آج کل کیا کام کرتے ہو؟

○ سر جی! تائب ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔ اللہ اللہ کرتا ہوں اور کاشتکاری کر کے حلال کی روٹی کھاتا ہوں۔

☐ اچھا محمد علی آپ یہ بتائیں کہ آپ ٹیلی فون کہاں کر رہے تھے؟

○ جناب میں اپنے ایک دوست کو ٹیلی فون کر رہا تھا۔

☐ کونسے دوست کو ٹیلیفون کر رہے تھے؟

○ سر جی! میرا ایک دوست سمن آباد میں رہتا ہے اس کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

☐ دوست کا نام کیا ہے اور اس کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟

○ (قدرے سوچ کر کہا) سر جی! ابھی میری اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔

☐ اگر بات نہیں بھی ہوئی تھی تو اس کا نام مکمل پتہ اور ٹیلی فون نمبر بتائیں؟

○ جناب اس کا نام اسلم ہے۔ لیکن اس کے گھر کا مکمل پتہ نہیں۔ اس کے ٹیلیفون نمبر کا پتہ ہے۔

☐ ٹیلیفون نمبر کیا ہے؟

○ غلط ٹیلی فون نمبر بتلا دیا۔ نمبر ڈائیل کر کے بات کرائی تو معلوم ہوا کہ وہ اسے جانتے تک نہیں۔ خواہ مخواہ ان کے ساتھ تعلق ظاہر کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر اچانک ڈائریکٹ سوال کیا جائے۔

- ☐ محمد علی تم بیچارے قادری صاحب کو کیوں اٹھا کر لے گئے ہو؟ کیا تمہارا اس کے ساتھ کوئی لین دین کا مسئلہ ہے؟
- ○ (مصنوعی ایکٹنگ) سر جی! کون قادری؟
- ☐ قادری جس کو پرسوں رات تم بمعہ اس کی کار سے زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے؟
- ○ سر جی! آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی؟
- ☐ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی میں نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے۔ تم جہاں ٹیلی فون کر رہے تھے وہ بات بھی چھپا رہے ہو جب کہ مجھے پوری طرح علم ہے کہ تم ٹیلیفون کہاں کر رہے تھے۔ اس پر اس کی زبان تھوڑی سی لڑکھڑائی لیکن چالاک ہونے کی وجہ سے پھر سنبھل گیا۔ میں نے کہا محمد علی سچ سچ بتا دو وقت ضائع نہ کرو۔ جتنا ہمیں پریشان کرو گے اتنا ہی تم پریشان ہو گے۔ جن لوگوں نے تمہیں عین اس وقت قابو کر لیا ہے جب تم قادری کے بیٹے سے تاوان کی رقم مانگ رہے تھے ان کو سب کچھ علم ہے۔ اب اس سٹیج پر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

انٹیروگیشن کے دوران گناہ گار ملزم درج ذیل حرکتیں کرتا ہے۔

1. کسی وقت خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔
2. کسی وقت کان کھجلاتا ہے۔
3. کسی وقت مصنوعی جمائی لیتا ہے۔
4. زمین کو کریدنا شروع کر دیتا ہے۔
5. کچھ دیر کیلئے ایک ہی جگہ نظر جما لیتا ہے۔
6. مصنوعی رونا اور مصنوعی ہنسنا جیسی حرکت کرتا ہے۔
7. کچھ لمحات کیلئے کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔

میں نے محمد علی پر اچانک سوال کیا کہ بتائے کہ مورخہ 11 ستمبر 1996ء کو یعنی پرسوں 12 بجے دن سے لے کر 12 بجے رات تک وہ کہاں رہا اور کھانا وغیرہ کہاں کھایا۔ اس نے جو جواب دیا اس کی تصدیق کروائی تو جھوٹ ثابت ہوا۔ اب اس کے پاس سچ اگلنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ انٹیروگیشن کے دوران تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ اب اس نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی خاموشی اور چہرہ کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اب یہ Break ہونے کے قریب ہے۔ اس موقع پر میں نے اسے پھر سمجھایا کہ اس کی ہر بات جھوٹی ثابت ہو چکی ہے۔ اب فائدہ

اس میں ہے کہ سچ سچ بتا دے اور جہاں قادری صاحب کو چھپایا ہوا ہے اس کی نشاندہی کر دے۔ میں نے اسے مزید سمجھایا کہ تم پولیس کے قابو آ چکے ہو اب چھوٹ کر واپس نہیں جا سکتے۔ جتنا جلدی ہو سکے قادری کو برآمد کراؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اناڑی دوستوں کو تمہاری گرفتاری کا پتہ چل جائے تو وہ گھبرا کر قادری کو قتل نہ کر دیں۔ اس طرح سے تم قتل کے ایک انتہائی سنگین مقدمہ میں ملوث ہو جاؤ گے اور پھانسی کی سزا پاؤ گے۔ اگر قادری کو جلدی برآمد کرا دو تو اس سے تمہاری صلح بھی ہو سکتی ہے۔ اور رقم کے لین دین کے تنازعہ کا موقف لے کر تم مقدمہ سے بری بھی ہو سکتے ہو۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ میری باتوں کا اس پر کچھ اثر ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو مزید اعتماد میں لیا۔ کہنے لگا جناب مجھے پانی پلوا دیں، میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ میں نے اسے پانی پلوایا۔ پانی پی کر کہنے لگا کہ جناب وعدہ کریں کہ میرے ساتھ رعایت کریں گے۔ اس دوران اس عیار اور مکار آدمی نے ایک من گھڑت جھوٹی کہانی تیار کر کے بتایا کہ جناب اصل بات یہ ہے کہ قادری صاحب کے ساتھ میں نے گاڑی کا سودا کیا تھا اور رقم نقد ادا کر دی تھی۔ بعد میں قادری صاحب سودے سے مکر گئے اور نہ صرف گاڑی بلکہ رقم واپس دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس رنج کی بنا پر میں نے ان سے گاڑی چھین لی اور ان کو بھی ساتھ لے آیا۔ قصور سے آگے میں نے ان کو ایک ڈیرہ پر رکھا ہوا ہے، آپ ساتھ چلیں برآمد کرا دیتا ہوں۔

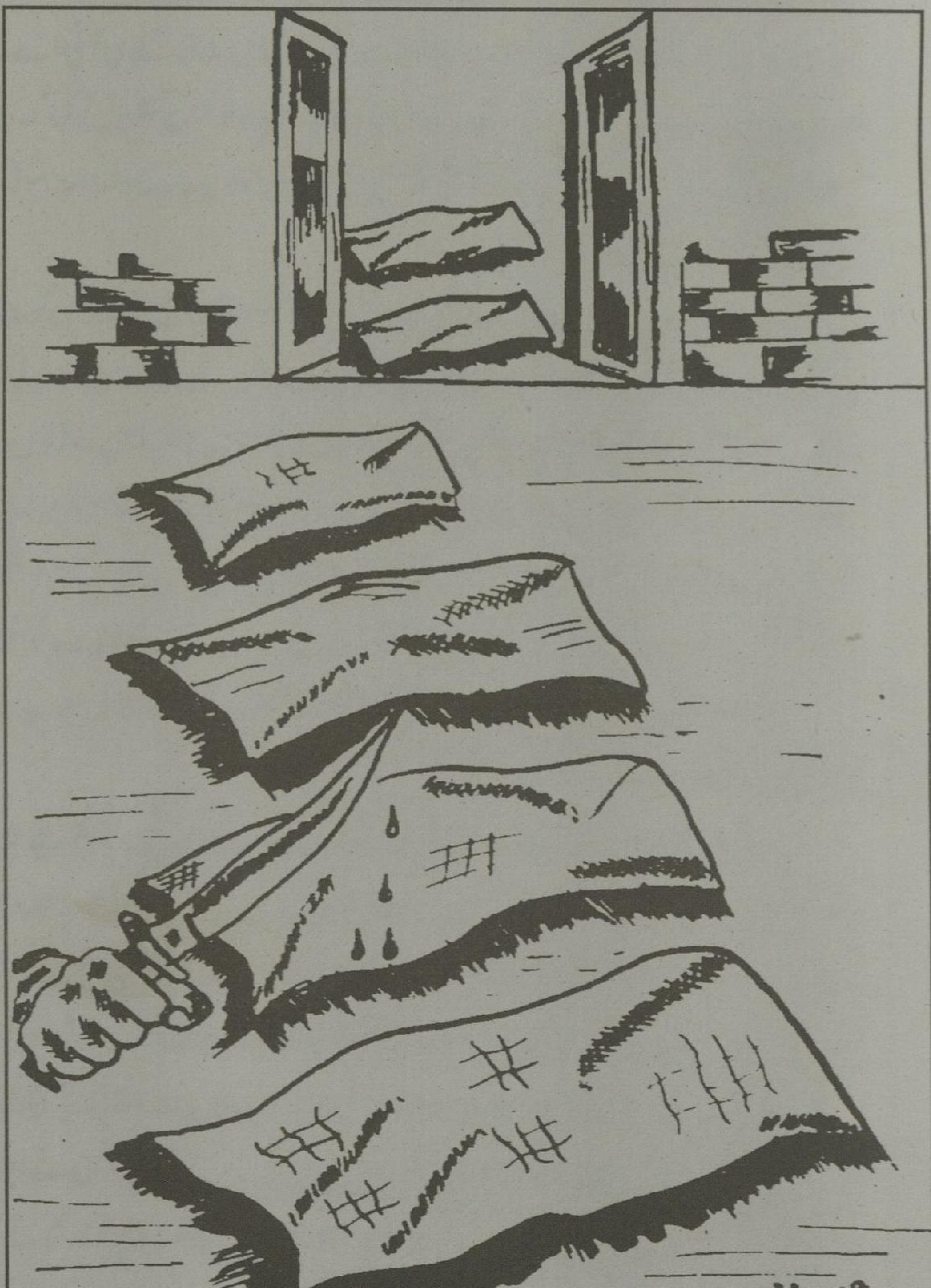
دو بجے رات طیب سعید SP ماڈل ٹاؤن، چوہدری شفقات احمد DSP، چوہدری مسعود عزیز DSP اور چوہدری مشتاق حسین DSP اور مناسب فورس کو ہمراہ لیا۔ محمد علی کو ہتھکڑی لگوا کر میں نے اپنی جیپ میں گن مینوں کی نگرانی میں بٹھا لیا اور جیپ آگے لگا کر روانہ ہوئے۔ راہ میں میں نے اس کو مزید اعتماد میں لے لیا۔ یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ مکمل طور پر Break ہو چکا ہے اس کی نشاندہی پر چلتے رہے۔ میں نے اسے کہا کہ جب اس ڈیرہ سے ایک میل دور رہ جائیں گے تو بتانا ہے۔ قصور سے آگے تقریباً پندرہ میل دور ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس وقت 4 بجے رات کا وقت تھا۔ محمد علی نے بتلایا کہ یہاں سے وہ ڈیرہ جہاں قادری صاحب کو رکھا ہوا ہے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہم نے گاڑیاں گاؤں کے چوک میں کھڑی کر دیں اور محمد علی کو ہمراہ لے کر ڈیرہ کی طرف پیدل چل پڑے۔ محمد علی کی نشاندہی پر ڈیرہ سے تقریباً 200 گز کے فاصلہ پر پہنچے تو ٹیمیں بنا کر ڈیرہ کو فوری طور پر گھیرا میں لے لیا۔ ڈیرہ کے غربی طرف کھلی جگہ پر 5/6 چارپائیاں نظر آئیں۔ دبے پاؤں چارپائیوں کے قریب جا کر جو لوگ چارپائیوں پر لیٹے



ہوئے تھے کو گھیرا میں لے کر ہینڈز اپ کروایا۔ ملزمان نے ارشاد قادری مغوی کے دونوں پاؤں میں سنگل باندھ کر چارپائی کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ وہاں موجود ملزمان سے چابی لے کر سنگل کھولا۔

قادری بیچارا خوف کے مارے اتنا سہا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ یہ لوگ محمد علی بھٹی کے ساتھی ہیں اور اسے کسی اور جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بعد میں اس کو شناخت کروائی۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ جب گاڑی کی لائٹ کے سامنے آئے تو اس نے مجھے پہچان لیا اور ''آپ چدھڑ صاحب'' کہہ کر میرے ساتھ لپٹ گیا اور دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ اب آپ ان ظالموں کے چنگل سے آزاد ہو چکے ہیں۔ ہم واپس لاہور پہنچ گئے۔ ارشاد قادری کو اس کے بیوی بچوں سے ملوایا جو خوشی کے مارے ارشاد قادری سے لپٹ گئے اور اس گھر میں خوشیاں پھر لوٹ آئیں۔ محمد علی کے علاوہ محمد مالک، مقصود، عباس، محمد حنیف، زاہد محمود اور گلزار ملزمان سے گاڑی برآمد کر کے ان کو چالان عدالت کر دیا۔ چھ ماہ بعد محمد علی بھٹی ملزم پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا جب کہ اسے جیل سے عدالت میں پیش کرنے کیلئے پولیس ملازمین ماڈل ٹاؤن کچہری لائے تھے۔ فراری کے بعد محمد علی بھٹی مجرم اشتہاری قرار دیا گیا جو بالآخر ایک پولیس مقابلہ میں مارا گیا اور اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

چھ لاشیں خون میں لت پت



1996ء

بطور ایس پی سی آئی اے لاہور تعیناتی کے دوران مورخہ 5 جولائی 1996ء کو ساڑھے نو بجے دن میں اپنے دفتر جو کہ تھانہ قلعہ گوجر سنگھ کی بالائی منزل پر تھا میں مصروف کار تھا۔ وائرلیس آپریٹر نے اطلاع دی کہ محلّہ مہاجر آباد علاقہ تھانہ نواں کوٹ کے ایک مکان میں جملہ اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میں فوری طور پر جائے واردات کی طرف روانہ ہوا۔ اس علاقہ کے سی آئی اے کے ڈی ایس پی چوہدری محمد اسحاق رخصت پر تھے۔ لہٰذا میں نے بذریعہ وائرلیس کنٹرول کو کہا کہ چوہدری مسعود عزیز ڈی۔ ایس۔ پی سی آئی اے کو مطلع کریں کہ وہ فوری طور پر جائے واردات سوڈھی وال کواٹروں کے قریب محلّہ مہاجر آباد پہنچ جائیں۔

جائے واردات پر میرے پہنچنے سے قبل محمد رفیع سب انسپکٹر انچارج تھانہ نواں کوٹ پہنچ چکا تھا۔ جائے واردات مکان ملکیتی منصور احمد ولد عبدالسلام تھا۔ مکان کے اندر سامنے والے کمرہ میں ایک عورت کی نعش پڑی تھی جس کا نام شفیقہ بیگم معلوم ہوا۔ ساتھ والے کمرہ میں دو لڑکوں اور ایک بچی کی نعشیں پڑی تھیں جن کے نام تیمور عمر 9 سال، ہارون عمر 6 سال اور عائشہ عمر 2 سال معلوم ہوئے جب کہ ملحقہ سٹور میں ایک لڑکے اور ایک بچی کی نعشیں پڑی تھیں جن کے نام مقبول احمد عمر 12 سال اور عینی عمر 14 سال معلوم ہوئے۔ نعشوں کے قریب بیڈ کے نیچے ایک چاقو خون آلود پڑا پایا گیا۔ تمام نعشوں کے گلوں پر تیز دھار آلہ کے زخم تھے جنہیں انتہائی سفاکی اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا۔

موقع پر موجود عبدالسلام ولد عبدالحمید قوم انصاری نے بتلایا کہ میرے پانچ بیٹے ہیں۔ چار بیٹے اکٹھے اس کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں جب کہ پانچواں بیٹا منصور احمد دوسری گلی میں بمعہ بال بچوں کے رہتا ہے اور گوجرانوالہ میں پاور لومز کے کارخانہ کی نگرانی کرتا ہے۔ مورخہ 3 جولائی 1976ء کو منصور احمد اپنے گھر سے گوجرانوالہ چلا گیا تھا۔ شب گزشتہ میرا بیٹا ندیم اپنے بھائی منصور کے گھر گیا جو نو بجے رات واپس آیا اور سب خیریت بتلائی۔ آج 8 بجے دن معمول کے مطابق اپنے بیٹے ندیم کو منصور کے گھر دودھ دینے کے لیے بھجوایا جس نے اطلاع دی کہ میں فوری منصور کے گھر پہنچ جاؤں۔ میں فکر مند ہو کر فوراً منصور کے گھر پہنچا تو ندیم نے بتلایا کہ

مین گیٹ کا اور بیڈ روم کے دروازے کھلے ہیں اور بھابی شفیقہ سمیت تمام بچے خون میں لت پت پڑے ہیں۔ میں اندر گیا تو قیامت صغریٰ برپا ہو چکی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون۔ ایسے خوفناک منظر کو دیکھنے کی سکت ہی کہاں۔ بہو شفیقہ معصوم پوتے مقبول احمد عمر 12 سال، تیمور احمد عمر 9 سال ہارون عمر 6 سال اور معصوم پوتیاں عینی عمر 4 سال اور عائشہ عمر 2 سال بہت ہی ظالمانہ اور سفاکانہ طریقے سے قتل ہوئے پڑے تھے جن کے گلے تیز دھار آلہ سے کٹے ہوئے تھے۔ شبہ کیا کہ مسمی محمد سلیم ولد محمد جمیل قوم انصاری ساکن عقب ناز سینما لکشمی چوک لاہور جس کو بری حرکات کی وجہ سے کچھ روز قبل میرے بیٹوں نے محلہ میں زدوکوب کیا تھا اور اس نے قتل کی دھمکیاں دی تھیں۔

محمد رفیع انچارج تھانہ نے مقدمہ درج کیا۔ جائے واردات کا غور سے ملاحظہ کیا گیا۔ فرش پر پڑے خون پر مجرمان کے نقوش پا واضح تھے۔ گیراج میں کھڑی شیراڈ کار کے ڈرائیور سائیڈ والے دروازے پر خون آلود انگلیوں کے نشانات تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایک مجرم نے کار کے دروازہ کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ مسماۃ شفیقہ کے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں بال تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے مجرم کے سر کے بال پکڑ کر کھینچے ہوں گے جو بال اکھڑ کر اس کی مٹھی میں رہ گئے۔ مکان کے مین گیٹ سے جو بندہ اندر داخل ہو بھی جائے تو اس کے لیے مکان کے اندرونی دروازہ سے بغیر اندر سے دروازہ کھولنے کے داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ تمام حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملزمان میں سے کم از کم ایک ملزم اہل خانہ کا جاننے والا اور قابل اعتماد تھا جس کو پہچان کر شفیقہ بیگم نے دروازہ کھولا ہوگا۔ ٹیلیویژن، فرج، شو کیس، گلاس، شیراڈ کار سے فنگر پرنٹس اور فرش سے نقوش پا کے مولڈ حاصل کئے گئے اور پوسٹ مارٹم کنندہ ڈاکٹر کو تحریری طور پر آگاہ کیا گیا کہ شفیقہ مقتولہ کی مٹھی میں پکڑے ہوئے بال قبضہ میں لے کر محفوظ کئے جائیں۔ محمد سلیم جس کو عبدالسلام مدعی نے رپورٹ ابتدائی میں نامزد کیا تھا اس سے تفتیش پوچھ گچھ وغیرہ ہوئی لیکن وہ بے گناہ ثابت ہوا۔ عبدالسلام نے اپنے بیان میں یہ بھی تحریر کرایا تھا کہ منصور کے گھر کے سامان کی پڑتال کرنے پر ایک عدد گھڑی سیکو فائیو برنگ گولڈن، ایک پسٹل 30 بور پاک میڈ لائسنسی ازان منصور احمد، ایک عدد انگوٹھی مردانہ، ایک عدد سیٹ زنانہ، دو کانٹے ٹکا، گلے کا ہار طلائی اور نقد رقم مبلغ سترہ ہزار بھی چوری ہونا پائے گئے ہیں۔

تفتیش کے دوران ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ گھر کا مالک منصور احمد بروز بدھ، جمعرات گوجرانوالہ کارخانہ میں رہتا تھا اور جمعہ کو واپس لاہور اپنے بچوں کے پاس آجاتا تھا اور اس کی بیوی

شفیقہ اپنے اندرونی دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر رکھتی تھی اور بغیر شناخت کے دروازہ ہرگز نہیں کھولتی تھی۔

اب یہ بات یقینی معلوم ہوتی تھی کہ کم از کم ایک ملزم ان کا اچھی طرح جاننے والا ہے اور اس کو یہ بھی علم ہے کہ منصور احمد بدھ اور جمعرات گوجرانوالہ میں ہوتا ہے اور جمعہ کو واپس آتا ہے اور وقوعہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب ہوا تھا۔

سخت گرمی کا موسم تھا۔ دن کو کڑاکے کی دھوپ میں مکان کی چھت اردگرد کے مکانوں اور گلیوں میں پھر کر جائزہ لیتے رہے۔ اسی طرح رات بھر جاگ کر ہر پہلو پر تفتیش کرتے رہے۔

دوسرے روز میں نے عبدالسلام اور اس کے بیٹوں جن میں متاثرہ گھر کا سربراہ منصور احمد بھی تھا کو علیحدہ ایک کمرہ میں بلایا اور ان کو کہا کہ وہ سب علیحدہ بیٹھ کر مشورہ کریں اور مشورہ کر کے اپنے ایسے رشتہ داروں اور جاننے والوں کی ایک فہرست تیار کریں جن کے کہنے پر یا دیکھ کر شفیقہ دروازہ کھول سکتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ رات کو ہم سب اکٹھے ہو کر مشورہ کر کے کل تک فہرست آپ کو دے دیں گے۔ تیسرے روز انہوں نے فہرست میرے پیش کی۔ فہرست دیکھ کر ان سے کہا کہ ان میں کون کون ایسے لوگ ہیں جن کے کردار کسی نہ کسی حوالہ سے مشکوک ہو سکتے ہیں۔ ان سب نے متفقہ طور کہا کہ ندیم ولد محمد الیاس چرس پیتا ہے اور آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا رہتا ہے لیکن وہ شفیقہ مقتولہ کا بھتیجا ہے۔

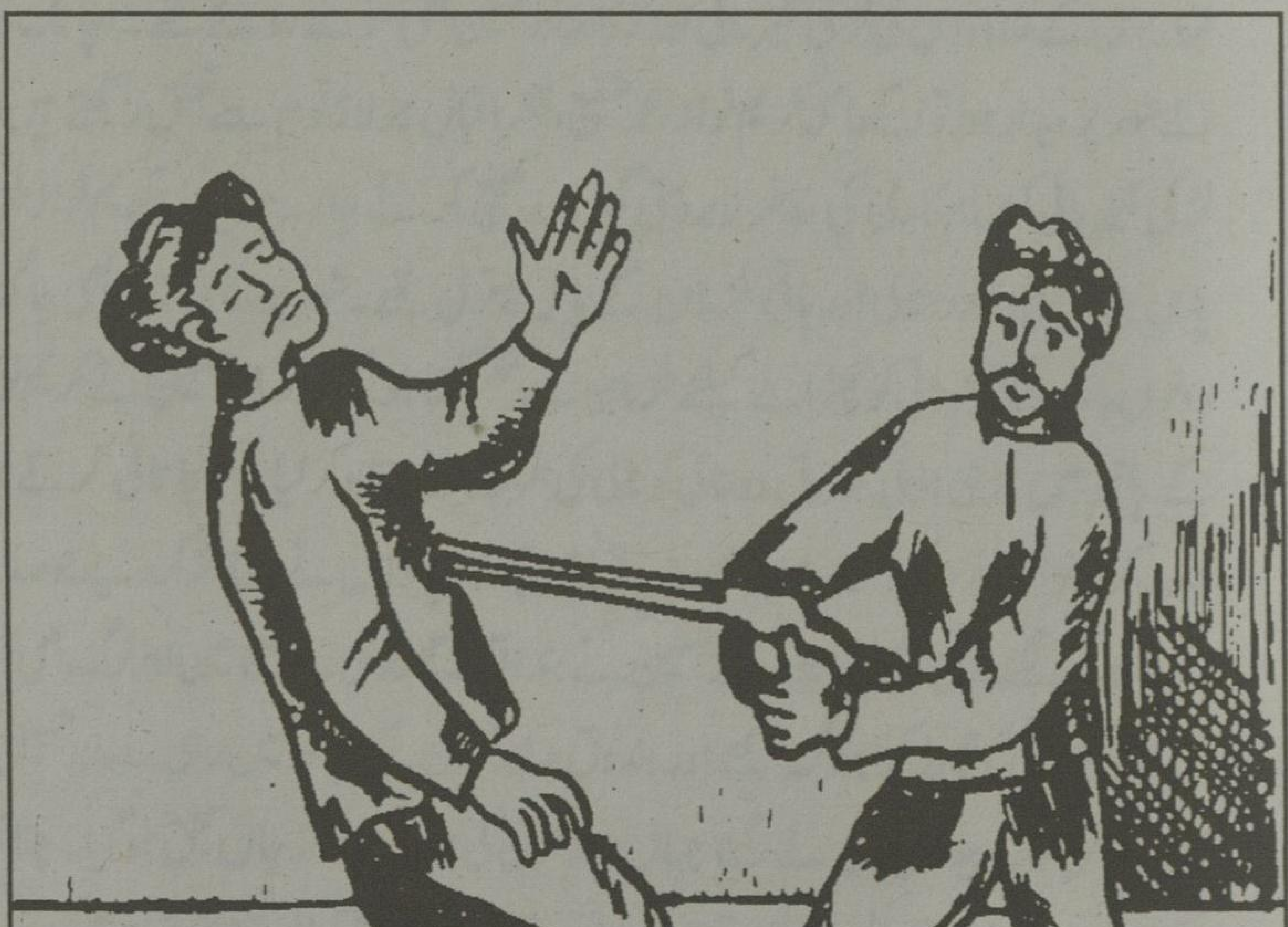
میں نے عبدالسلام کو کہا کہ آپ اپنے طور پر خفیہ اس کے گھر سے پتہ کروائیں کہ وہ کدھر ہے۔ خفیہ طور پر پتہ کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ دو دن سے گھر نہیں آیا اور داتا دربار کے سامنے دو آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ میں نے ندیم کے بھائی کو کہا کہ ندیم کو میرے پاس لائیں اس سے کوئی بات پوچھنی ہے۔ دوسرے روز اس کے رشتہ دار اسے تلاش کر کے میرے پاس لائے۔ میں نے اُسے کہا کہ مورخہ 4 جولائی بروز جمعرات صبح 8 بجے دن سے لے کر 5 جولائی 12 بجے دن تک تم کہاں کہاں رہے ہو اور رات کو کہاں سوئے ہو اس کی تفصیل بتاؤ۔ اس نے جو تفصیل بتائی اور رات کو جس جگہ سونا بتلایا اس کی تصدیق کروائی گئی تو سب جھوٹ ثابت ہوا۔ اب وہ بوکھلا گیا۔ ساتھ ہی اس کی انگلیوں کے نشانات فنگر پرنٹ بیورو بھجوائے گئے جہاں سے رپورٹ موصول ہوئی کہ شیراڈ کار کے دروازے پر جو خون آلود انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے ان کے ساتھ ندیم کی انگلیوں کے نشانات مطابقت کرتے ہیں۔

اب اس کے پاس سوائے سچ اُگلنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس یعنی ندیم ولد محمد الیاس

قوم انصاری ساکن محلہ سلطان پورہ تھانہ باغبانپورہ ضلع گوجرانوالہ نے انکشاف کیا کہ وہ گوجرانوالہ میں ہی کپڑوں پر کڑھائی کا کام کرتا ہے۔ اس کو اس کے ایک دوست عاشی نے چرس کے نشہ پر لگا لیا اور آہستہ آہستہ یہ بری سوسائٹی میں چلا گیا۔ اس کے پھوپھا منصور احمد نے گوجرانوالہ میں پاور لومز کا کارخانہ لگایا ہوا ہے۔ ایک دن یہ اپنی پھوپھی شفیقہ کے پاس لاہور آیا اس کے پاس چرس کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس نے اپنی پھوپھی سے ایک سو روپیہ مانگا جس نے رقم دینے سے انکار کر دیا اور الٹا گالیاں دیں۔ اوپر سے اس کا پھوپھا منصور احمد آ گیا جس نے اسے دیکھ کر بُرا بھلا کہا اور آوارہ چرسی کہہ کر گھر سے نکل جانے کو کہا۔ یہ وہاں سے چلا گیا لیکن دل میں یہ ٹھان لیا کہ ان کے گھر میں ڈاکہ ضرور ڈالیں گے۔

چنانچہ اس نے اپنے دوستوں سرفراز ولد عبدالرشید، محمد یوسف عرف عاشی ولد عبدالغفور اور جاوید ریاض کو ساتھ ملایا۔ مورخہ 5 جولائی کو علی الصبح اپنی پھوپھی شفیقہ کے گھر پہنچے۔ اس نے پھوپھی کو کہا کہ دروازہ کھولو کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ پھوپھی نے دروازہ کھولا اِس نے پیچھے کھڑے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر کے بلایا اور سب اندر چلے گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے شفیقہ کو قابو کر کے اس کا گلا چاقو سے کاٹا۔ چونکہ سب بچوں نے اسے دیکھ لیا تھا اس لئے شناخت کے خوف سے سب کو مارنے کا ارادہ کر لیا۔ ان سب نے مل کر باری باری سب کے گلے کاٹ دیئے۔ گھر کی تلاشی لینے پر ایک پستول 30 بور کچھ زیورات اور سترہ ہزار روپیہ نقد ان کے ہاتھ لگے جو یہ اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس کے بعد باقی ملزمان کے گھروں پر چھاپے مار کر سب کو گرفتار کر لیا جنہوں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ان کی نشاندہی پر تمام مسروقہ سامان برآمد کر لیا اور خون آلودہ کپڑے جہاں جلائے تھے وہاں سے راکھ بھی برآمد کر لی گئی۔ بال جو شفیقہ کی مٹھی سے قبضہ میں لیے گئے تھے ان کی مطابقت ملزمان کے سر کے بالوں کے ساتھ کرائی گئی تو ایکسپرٹ نے رپورٹ دی کہ وہ بال سرفراز کے بالوں کے ساتھ مطابقت کرتے ہیں۔ جملہ ملزمان اناڑی تھے جنہوں نے یہ پہلی واردات کی تھی۔ ہمیشہ اناڑی اور نو آموز جرائم پیشہ سنگین واردات کرتے ہیں۔ اس مقدمہ کی سماعت انسداد دہشت گردی کی عدالت میں ہوئی جہاں سے ملزمان کو موت کی سزا سنائی گئی۔

دونالی بندوق



1997ء

تھانہ شیدانی ضلع رحیم یار خان کے علاقہ میں ایک قصبہ خان بیلہ ہے۔ یہ کے ایل پی روڈ پر واقع ہے۔ یہاں پولیس چوکی کے علاوہ ہیلتھ سنٹر اور محکمہ ہائی ویز کا ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔ اردگرد آموں کے باغات ہیں۔ نہایت سرسبز علاقہ ہے جس وجہ سے لوگ قدرے خوشحال ہیں۔

مورخہ 11 اگست 1997ء کو بستی عباس نگر کے ایک شخص مسمی قمر الدین ولد محمد خان قوم چانڈیہ نے پولیس کو رپورٹ کی کہ شب گزشتہ ایک بجے رات وہ اپنے مکان کے صحن میں سویا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی لڑکی کنیز مائی اور لڑکا صابر حسین بھی سوئے ہوئے تھے۔ اچانک کنیز مائی کے شور پر بیدار ہوا تو دیکھا کہ کریم نواز، محمد شفیع، ظفر اقبال جو لاڑ قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس کی لڑکی کنیز مائی کو حرام کاری کی خاطر زبردستی گھر سے کھینچ کر لے جا رہے ہیں۔ کریم نواز ملزم کے پاس بندوق 12 بور دونالی اور باقی ملزمان کے پاس پستول تھے۔ شور پر صابر حسین بھی جاگ گیا۔ دونوں باپ بیٹا کنیز مائی کو چھڑانے کیلئے ملزمان سے گتھم گتھا ہو گئے۔ صابر حسین نے کریم نواز ملزم کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق دونالی کو نالی کی طرف سے قابو کر لیا۔ کھینچا تانی کرتے رہے۔ جب کریم نواز نے دیکھا کہ صابر حسین بندوق نہیں چھوڑ رہا تو اس نے دو فائر کر دیے جو صابر حسین کو پیٹ پر لگے۔ اس کے باوجود صابر حسین نے بندوق نہ چھوڑی۔ اتنے میں اور لوگ بھی آ گئے۔ ملزمان کنیز مائی کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور بندوق صابر حسین کے ہاتھ میں رہی۔ صابر حسین کو زخمی حالت میں خان بیلہ ہسپتال لے گئے جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ چنانچہ مدعی کے اس بیان پر احمد مختار ایس ایچ او تھانہ شیدانی نے مقدمہ درج کیا اور تفتیش شروع کی۔ رپورٹ ابتدائی میں نامزد ملزمان کو گرفتار کر لیا جنہوں نے اپنی بے گناہی کا واویلہ کیا۔ علاقہ کے معززین نے ان کی بے گناہی کے سلسلہ میں صفائی پیش کی۔ اس پر مقامی پولیس نے ان کو بے گناہ لکھ دیا جس کی تصدیق محمد طفیل ڈی ایس پی صاحب حلقہ افسر لیاقت پور نے بھی کر دی اور الزام علیہان کو فارغ کر دیا۔

جب مقدمہ کے مدعی نے دیکھا کہ جو ملزمان اس نے رپورٹ ابتدائی میں لکھوائے تھے ان کو پولیس نے بے گناہ کر دیا ہے تو وہ اتوار کے روز کھلی کچہری میں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم

پاکستان کے پاس ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنی لڑکی کنیز کو لے کر پیش ہو گیا اور داستان غم وزیر اعظم صاحب کو سنائی۔ وزیر اعظم صاحب اس کی داستان سن کر جذبات میں آ گئے اور انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا کہ ملزمان فوراً گرفتار کیے جائیں۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس پنجاب لاہور نے ڈی آئی جی صاحب بہاولپور کو حکم دیا۔ انہوں نے ایس ایس پی صاحب رحیم یار خان کو فوری کارروائی کرنے کی ہدایت کی۔

میں ان دنوں رحیم یار خان میں بطور ایڈیشنل ایس پی تعینات تھا۔ ایس ایس پی نے اس مقدمہ کی تفتیش میرے سپرد کی اور بتایا کہ وزیر اعظم نے سخت غصہ کا اظہار کیا ہے آپ ذاتی طور پر اس مقدمہ کی تفتیش کریں۔ دوسرے دن میں نے اپنے گن مین ساتھ لیے اور سرکاری گاڑی پر موقع پر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ڈی ایس پی لیاقت پور اور ایس ایچ او تھانہ شیدانی کو بھی بلوالیا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں موقع کا معائنہ کیا اور وہاں سے فارغ ہو کر تھانہ شیدانی پہنچ گیا۔ مقدمہ کی فائل کو بغور پڑھا تو اس میں بندوق 12 واگزشتہ ملزمان کی فرد مقبوضگی لگی ہوئی تھی۔ جس میں اس کی تفصیل بندوق 12 بور دونالی پاک میڈ نمبر RAC-3251 تحریر تھی۔ جب میں نے فرد مقبوضگی دیکھی تو میں نے ایس ایچ او کو کہا کہ وہ بندوق مجھے دکھائیں۔ ایس ایچ او تھانہ کے مال خانہ سے بندوق نکال کر لایا۔ میں نے بندوق کا بغور ملاحظہ کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بندوق لائسنسی ہے۔ چنانچہ میں نے بندوق کے کوائف اپنے پاس نوٹ کر لیے اور بندوق دیکھ کر پُر امید ہو گیا کہ اصل ملزمان کا سراغ مل جائے گا۔ میں نے اپنے ایک واقف کار حسن خان اسلحہ ڈیلر راوی روڈ لاہور سے رابطہ کر کے اس کو بندوق نمبر RAC-3251 کے کوائف نوٹ کرائے اور کہا کہ پتہ لگانا ہے کہ یہ بندوق کس کمپنی کی بنی ہوئی ہے اور کس کو فروخت ہوئی ہے۔ دوسرے دن حسن خان نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ RAC سے مراد رائل آرمز کمپنی ہے۔ یہ پشاور میں ہے اور اس کے مالک کا نام فخر عالم خان ہے۔ اس نے مجھے فخر عالم خان کے ٹیلی فون نمبر بھی دیئے۔ میں نے فخر عالم سے پشاور رابطہ کیا اور بندوق کے کوائف بتائے۔ اس نے پہلے تو لیت ولعل سے کام لیا لیکن جب میں نے اصرار کیا اور اس مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی کہا کہ خان صاحب آپ کا بڑا احسان ہو گا آپ ہماری امداد ضرور کریں تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ کل تک اپنا سارا ریکارڈ چیک کرے گا۔ کل اس سے معلوم کر لینا۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے اسے ٹیلی فون کیا تو اس نے بتلایا کہ مورخہ 4 جنوری 1995ء کو یہ بندوق انہوں نے ابراہیم اینڈ سنز اسلحہ ڈیلر راوی روڈ کو فروخت کی تھی۔ یہ

اطلاع پا کر مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے فخر عالم خان صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ایس ایس پی صاحب کو واقعات بتا کر لاہور چلا گیا۔ لاہور پہنچ کر ابراہیم اینڈ سنز اسلحہ ڈیلر راوی روڈ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے ریکارڈ کی پڑتال کی اور بتایا کہ انہوں نے یہ بندوق دسمبر 1995ء میں عبدالرشید اینڈ سنز قصور اسلحہ ڈیلر کو فروخت کی تھی۔ چنانچہ میں نے عبدالرشید اینڈ سنز قصور سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بندوق مسمی سراج ولد نبی بخش ساکن پکالاڑاں ضلع رحیم یار خان لائسنسدار کو فروخت کی ہے۔ اس اطلاع پر میں اور خوش ہوا کہ اب بندوق کا کھوج اسی علاقہ کی طرف آ رہا ہے جس علاقہ میں واردات ہوئی ہے۔ اب ملزمان تک پہنچنا ممکن ہو گیا ہے۔ میں لاہور سے واپس رحیم یار خان آ گیا۔ گن مین ہمراہ لے کر سرکاری جیپ میں فوری طور پر پکالاڑاں پہنچا۔ اسی اثنا میں میں نے ڈی ایس پی لیاقت پور اور ایس ایچ او تھانہ پکالاڑاں کو بلا لیا اور مسمی سراج ولد نبی بخش کو قابو کر لیا۔ اس نے دریافت پر بتلایا کہ وہ اسلحہ لائسنسدار ہے۔ اس نے بندوق دونالی قصور سے خرید کی تھی۔ وہ بندوق اس کے ایک دوست اکبر شاہ کے پاس ہے۔ اکبر شاہ کو لا کر دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بندوق اس کے پاس تھی لیکن اللہ نواز لاڑ اور اللہ ڈیوایا سکنہ پکالاڑاں اس سے مانگ کر لے گئے تھے اور ابھی تک واپس نہ کی ہے۔ اس طرح سراغ لگا کر اصل ملزمان تک پہنچ گئے جن کو گرفتار کیا گیا۔ علاقہ میں یہ مقدمہ بہت ہی متنازعہ بنا ہوا تھا اور پارٹی بازی کی وجہ سے پولیس کیلئے دردسر بنا ہوا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی مدعی کے ساتھ دوسری پارٹی ملزم فریق کے ساتھ تھی۔ اس طرح موقع پر چھوڑی ہوئی بندوق سے سراغ مل گیا اور اصلیت سامنے آ گئی۔ جو ملزمان بندوق سے ٹریس ہوئے وہ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اگر ڈی ایس پی اور ایس ایچ او پہلے روز اس طرف توجہ دیتے تو مسئلہ بہت جلد حل ہو جاتا۔ اس میں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سراج نے جو بندوق کا لائسنس بنوایا تھا وہ بھی لیاقت پور سے بنوایا تھا۔ اس میں اس بندوق کا اندراج تھا۔ مقامی پولیس نے اتنی بھی تکلیف گوارا نہ کی کہ وہ واگزاشتہ دونالی بندوق کی پڑتال لیاقت پور لائسنس اسلحہ برانچ سے کرا لیتے۔

بنگالی ڈاکو



لاہور شہر جرائم کا گڑھ ہے۔ اس شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں کے نت نئے گینگ تیار ہوتے ہیں۔ ان کے گرفتار ہونے پر کرائم میں کچھ ٹھہراؤ آ جاتا ہے لیکن اچانک نیا گینگ تیار ہو کر سرگرم عمل ہو کر لوگوں کا سکھ چھین لیتا ہے۔ عام طور پر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو چور ڈاکو گرفتار ہو کر چالان ہوتے ہیں ان میں سے کئی تو مقدمات سے بری ہو جاتے ہیں اور کئی جعلی ضمانت نامے پیش کر کے ضمانت پر رہا ہو کر جیل سے باہر آ جاتے ہیں اور پھر عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔ وہ عدالت سے غیر حاضر ہو کر عدالتی مفرور قرار دیئے جاتے ہیں اور وہ از سر نو وارداتوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

ڈاکوؤں کا گروہ پکڑے جانے کے بعد اگر ان کا کوئی ساتھی پولیس کے قابو نہ آئے تو پھر وہ نیا گینگ تیار کر کے سنگین وارداتوں میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد کے عام طور پر جیل کے اندر ایک دوسرے سے رابطے ہوتے ہیں اور وہاں سے رہائی کے بعد نیا گروہ بنا لیتے ہیں۔

لاہور شہر میں بڑے بڑے خطرناک ظالم اور سفاک ڈاکو کچھ عرصہ سرگرم عمل رہ کر بالآخر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ انتہائی دلیرانہ، خوفناک اور ظالمانہ انداز میں واردات کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف لوگوں کا مال لوٹتے ہیں بلکہ ان کی عزتیں بھی لوٹ لیتے ہیں۔ اور اکثر وارداتوں میں ڈاکہ زنی کے دوران اہل خانہ کو اپنی قیمتی جانوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے 11 سال کی طویل تعیناتی CIA لاہور میں گزار کر کئی خطرناک ڈاکوؤں کے گروہوں کو نہ صرف پکڑا بلکہ ان کو عدالت سے سنگین سزائیں بھی دلوائیں اور کروڑوں روپے کے زیورات اور کرنسی نوٹ ان ڈاکوؤں کے قبضہ سے برآمد کر کے اصل مالکان کو واپس کیے۔

ان خطرناک گروہوں میں ایک بنگالی ڈاکوؤں کا گروہ تھا جو کراچی شہر کے رہائشی تھے اور وہ سنگین وارداتوں میں ملوث ہونے کے بعد فرار ہو کر لاہور آ گئے اور یہاں ڈاکہ زنی کی وارداتیں شروع کر دیں۔ بالآخر یہ گروہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور ان کو چالان کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد گروہ کا سرغنہ محبوب الرحمٰن بنگالی ماڈل ٹاؤن کچہری کی جوڈیشل حوالات کے روشندان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

فراری کے بعد اس نے اپنے گروہ کے ان افراد سے رابطہ کیا جو پہلے اس کے ساتھ نہیں پکڑے گئے تھے۔ رابطے کے بعد اس نے اپنا گینگ مکمل کر کے پھر سے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کا نشانہ پوش ایریا، گلبرگ، اپر مال اور ڈیفنس کا علاقہ تھا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا جس دن یہ اس علاقہ میں ڈاکہ نہ مارتا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم بالکل دبلا پتلا تھا۔ جینز کی پینٹ، شرٹ استعمال کرتا اور اتنا پھرتیلا تھا کہ متاثرہ گھر کے مکین کہتے کہ یہ واردات کے دوران چھلاوے کی طرح چھلانگیں مارتا رہتا ہے اور کلاشنکوف کنپٹی پر رکھ کر ہینڈز اپ کرا لیتا ہے۔ روز بروز اس کی مجرمانہ سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ اس نے ایک دن میں تین متمول گھرانوں کے گھر میں ڈاکے مارے۔ ان وارداتوں سے لاہور شہر میں خوف وہراس پھیل گیا اور لوگ اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ جس روز اس گینگ نے تین گھروں میں ڈاکے مارے میں نے تینوں گھروں میں جا کر جائے وقوعہ کا معائنہ کیا اور مکینوں سے پوچھ گچھ کی۔ لوگوں نے بتلایا کہ یہ گروہ زبردستی گھر میں داخل ہو کر اہل خانہ کو پہلے ہینڈز اپ کراتے ہیں، پھر منہ کے بل لیٹ جانے کا حکم دیتے ہیں اور اس کے بعد تسلی کے ساتھ بغیر کسی ڈر خوف کے سارے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔ زیورات، نقدی اور قیمتی اشیاء سمیٹ کر چلے جاتے ہیں اور ہر واردات میں کار استعمال کرتے ہیں۔ تین گھروں میں ڈکیتی کے وقوعے دیکھنے کے بعد مجھے انتہائی شرمندگی محسوس ہوئی۔ میں نے انتہائی غصہ کے انداز میں CIA ہیڈ کوارٹر ٹیلی فون کیا کہ میں دفتر پہنچ رہا ہوں۔ CIA کے تمام افسران اکٹھے ہو کر میرا انتظار کریں۔ CIA ہیڈ کوارٹر پہنچ کر افسران کی میٹنگ بلائی اور ان کو اپنی بے حسی اور نالائقی کا احساس دلایا اور جذباتی انداز میں کہا کہ اب ہم اتنے بے حس اور نالائق ہو گئے ہیں کہ ایک چوہے جتنا آدمی کراچی سے آ کر سارے شہر کو لوٹ رہا ہے اور ہمارے قابو نہیں آ رہا۔ اس کی گرفتاری اب ہمارے لیے سخت چیلنج بن گیا ہے۔

میں نے پراپرٹی ڈیلروں کی فہرستیں پہلے سے مرتب کروالی تھیں۔ اب منصوبہ بندی اس طرح کی کہ جملہ سی آئی اے کے افسران کو علاقہ اور پراپرٹی ڈیلرز تقسیم کر دیئے اور ہدایت کی کہ پراپرٹی ڈیلروں کا ریکارڈ چیک کریں۔ چھ مہینے کے اندر اگر کسی شخص نے کوئی مکان یا کوٹھی کرایہ پر لی ہو ان کے کوائف کی تفصیل لی جائے اور خفیہ طور پر اس شخص کی تصدیق کروائی جائے کہ وہ کون ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ سب افسران کو مناسب ہدایات دے کر اپنے اپنے علاقہ میں روانہ کر دیا۔ اور میں خود ڈیفنس کے علاقہ میں تلاش مجرمان کیلئے روانہ ہو گیا۔



سچ کہتے ہیں کہ جب کوئی انسان خلوص نیت اور ایمانداری کے ساتھ نیکی، بھلائی اور خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کسی نیک مقصد کیلئے قدم اٹھاتا ہے تو کامیابیاں اور کامرانیاں اس کے قدم چومتی ہیں۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد کرامت علی انسپکٹر جس کو میں نے والٹن روڈ کے پراپرٹی ڈیلروں کا ریکارڈ چیک کرنے کیلئے مامور کیا تھا نے وائرلیس پر میری پوزیشن دریافت کی۔ میں نے اپنی پوزیشن ڈیفنس Z بلاک بتلائی۔ اس نے وائرلیس پر پیغام دیا کہ آپ والٹن روڈ پر بڑے مینار والی مسجد کے سامنے پہنچ جائیں۔ میں فوری طور پر وہاں پہنچا تو کرامت علی انسپکٹر پہلے سے وہاں کھڑا تھا جو مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر کہنے لگا کہ سر جی! مبارک ہو سراغ مل گیا ہے۔ اور بات جاری رکھتے ہوئے بتلایا کہ پراپرٹی ڈیلروں کی دکانیں چیک کرتا ہوا وہ قادری پراپرٹی ڈیلر کے دفتر پہنچا۔ ان کا ریکارڈ چیک کرنے لگا تو قادری نے کہا کہ جناب آپ کا مقصد کیا ہے۔ اس کو بتلایا کہ وہ کچھ مشکوک لوگوں کی تلاش میں ہے۔ اِس پر قادری پراپرٹی ڈیلر نے انکشاف کیا کہ ''ایک ماہ پیشتر دو لڑکے میرے دفتر آئے تھے جنہوں نے کوٹھی کرایہ پر لینے کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی ان کا یہ مطالبہ تھا کہ کوٹھی کے ساتھ گیراج ہونا ضروری ہے''۔ اس نے ساتھ ہی گلی میں تھوڑا آگے انہیں ایک کوٹھی سات ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لے کر دی ہے۔

کرامت علی انسپکٹر نے مزید کہا کہ قادری کو بنگالی گینگ کے سرغنہ محبوب الرحمٰن کی تصویر دکھائی ہے جو اس نے پہچان لی ہے کہ اس لڑکے نے کوٹھی کرایہ پر لی ہے۔ اب ہمارے لئے خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہم دونوں نے ہمراہی ملازمین کو ادھر ہی کھڑا کر دیا اور خود سفید کپڑوں میں قادری پراپرٹی ڈیلر کے پاس چلے گئے۔ اس سے میں نے مزید تسلی کی۔ اس کی بات سن کر مجھے بھی یقین ہو گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں مطلوب ہیں۔ اس نے مزید بتلایا کہ ان کے پاس روزانہ نئی گاڑی ہوتی ہے۔

بنگالی ڈاکوؤں کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ ہر واردات سے پہلے نئی گاڑی چھینتے تھے۔ پھر اس پر واردات کر کے ایک دو دن گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر کے استعمال کرتے اور پھر لاوارث چھوڑ دیتے۔

میرے اس سوال پر کہ آخری دفعہ ان کو آپ نے کب دیکھا ہے قادری نے بتلایا کہ پہلے تو روزانہ سامنے سے گزرتے نظر آتے تھے لیکن اب دو دن سے وہ نظر نہیں آئے۔ دو دن نظر نہ آنے کی بات سن کر اچانک پریشانی ہوئی کہ کہیں وہ کوٹھی چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوں۔ میں نے قادری کو

مزید اعتماد میں لے کر پوچھا کہ آپ کسی بہانے اس کوٹھی پر جا سکتے ہیں۔اس نے کہا کہ وہ دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی چیز لینے دینے کیلئے ان کے پاس جاتا رہتا ہے۔اب بھی ایک پیڈسٹل پنکھا ان کے پاس ہے۔وہ پنکھا لینے کے بہانے جا سکتا ہے۔میں نے اس کے ساتھ ایک ملازم جو شکل وصورت سے پولیس ملازم معلوم نہیں ہوتا تھا سفید کپڑوں میں پنکھا لینے کے بہانے بھیجا۔تھوڑی دیر کے بعد قادری نے واپس آ کر بتلایا کہ جناب کوٹھی کے گیٹ کو باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔یہ بات سن کر پریشانی میں مزید اضافہ ہوا کہ کہیں وہ کوٹھی چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوں اور ہماری ساری محنت ضائع نہ ہو جائے۔ہم قادری کو پرائیویٹ کار میں بٹھا کر تین ملازم ہمراہ لے کر گلی جو مین روڈ سے اس کوٹھی کی طرف جاتی ہے کی نکر پر ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔سرکاری اسلحہ ہم نے نیچے چھپایا ہوا تھا۔کرامت علی بھٹی انسپکٹر کو کہا کہ وہ مستری کو بلوا کر کوٹھی کا تالا کھلوا کر اندر سے چیک کرے کہ ان کا سامان موجود ہے یا کوٹھی خالی ہے۔کرامت علی بھٹی انسپکٹر نے واپس آ کر بتلایا کہ اس نے مین گیٹ اور اندر کوٹھی کے تالے کھلوا کر چیک کیا ہے اندر ایک کمرہ میں قالین بچھا ہوا ہے اور ان کا سامان وغیرہ موجود ہے۔کرامت نے مزید بتلایا کہ انہوں نے اسی طرح کوٹھی کو تالے لگا دیئے ہیں۔اب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ لوگ ابھی تک یہاں سے شفٹ نہیں ہوئے ممکن ہے کسی واردات کیلئے کہیں گئے ہوئے ہوں۔میں نے 8 جوان کمانڈو ٹائپ کرامت علی بھٹی انسپکٹر کو دے کر کہا کہ وہ کھانے پینے کا سامان لے کر کوٹھی کے جس کمرہ میں ان کا سامان پڑا ہے اس کا تالہ کھول کر اندر چلا جائے۔ہم باہر سے تالہ لگا دیتے ہیں۔چنانچہ ان کو اندر بمعہ اسلحہ بھیج دیا گیا۔ہم نے باہر سے تالہ لگا لیا۔انسپکٹر کو یہ ہدایت کی گئی کہ ملزمان جب کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں تو اچانک اندر سے کمانڈو ایکشن کر کے ان کو قابو کر لینا ہے۔جس گلی میں یہ کوٹھی تھی وہ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔وہاں ایک شخص نے حویلی میں دو بھینسیں باندھی ہوئی تھیں۔اس کو اعتماد میں لے کر وہاں پڑی ہوئی چار پائیوں پر سفید کپڑوں میں چار کانسٹیبل اور ایک ہیڈ کانسٹیبل محمد نصر اللہ کو بٹھا دیا اور سب کو الرٹ رہنے کی ہدایت کی۔میں اور محمد شریف ڈوگر انسپکٹر چار کانسٹیبلوں اور قادری پراپرٹی ڈیلر کو ہمراہ لے کر گلی کے بالمقابل سڑک کے دوسری طرف ایک پرائیویٹ پک اپ میں بیٹھ کر ملزمان کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

ملازمین کو علیحدہ علیحدہ بھیج کر یہ ڈیوٹی اس طریقے سے لگائی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔تمام رات انتظار کرتے رہے لیکن ملزمان نہ آئے۔دوسرے روز 8 بجے دن ایک سفید کار گلی

میں داخل ہوئی جس میں تین نوجوان لڑکے سوار تھے۔ قادری نے کار دیکھ کر بتلایا کہ جناب وہ آگئے ہیں۔ وہ کار کوٹھی کے مین گیٹ سے آگے گلی میں لے گئے اور وہاں سے واپس ٹرن کر کے کار کا رخ مین روڈ کی طرف کر کے اس کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا کیا۔ دونوں جوان لڑکے کار سے نیچے اترے۔ ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ کوٹھی کے مین گیٹ کا تالہ کھولنے لگے تو ہیڈ کانسٹیبل محمد نصر اللہ والی پارٹی نے فوری ایکشن کر کے ان دونوں کو قابو کر لیا جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اس کو محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل نے گریبان سے پکڑا تو اس نے کار دوڑا دی جو پہلے سٹارٹ تھی۔ محمد نصر اللہ کار کے دروازہ کے ساتھ چمٹ گیا اور ایک ہاتھ سے سٹیرنگ کو قابو کر لیا۔ اس نے کار کی محمد نصر اللہ والی سائیڈ دیوار میں مار کر اس کو گرانے کی کوشش کی۔ محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل زخمی ہونے کے باوجود کار کا سٹیرنگ پکڑ کر ساتھ چمٹا رہا۔ ملزم نے اپنے پاؤں کے نیچے سے پسٹل نکال کر محمد نصر اللہ پر فائر کیا جو محمد نصر اللہ کے ہاتھ پر لگ کر آگے دیوار میں جا لگا۔ اسی اثنا میں محمد نصر اللہ نے انتہائی پھرتی کے ساتھ بائیں ہاتھ سے سٹیرنگ پکڑ کر دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے ملزم پر فائر کیا جو سیدھا اس کے دل پر لگا۔ اس کی گاڑی آؤٹ آف کنٹرول ہو کر آگے بجلی کے کھمبے میں جا کر لگی۔ ملزم دل پر فائر لگنے سے موقع پر ہی جان بحق ہو گیا جو بعد میں بنگالی گینگ کا سرغنہ محبوب الرحمٰن شناخت ہوا۔

محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل کو زخمی حالت میں فوری طور پر جنرل ہسپتال بھجوایا گیا۔ کمرے کے اندر والی پارٹی کو نکالا گیا۔ ہر دو ملزمان جو کوٹھی کے گیٹ پر قابو آئے ان کے نام سیف اللہ ساکن کراچی اور عارف ساکن ملتان معلوم ہوئے۔ وائرلیس پر اطلاع پا کر ایس ایس پی لاہور چوہدری تنویر بھی پہنچ گئے۔ محبوب الرحمان جس نے لاہور کے پوش ایریا میں ڈکیتی کی وارداتوں کا اودھم مچا رکھا تھا کی ہلاکت کی خبر پورے لاہور میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ پولیس کی تعریف ہونے لگی۔ میں اور ایس ایس پی جنرل ہسپتال پہنچے۔ وہاں محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل کی عیادت کی جس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ایس ایس پی نے فرط جذبات میں آ کر محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے شاباش دی۔ چوہدری تنویر صاحب اچھے پولیس افسر کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔

ڈاکوؤں کے گروہ کے سرغنہ محبوب الرحمان کی نعش پوسٹ مارٹم کیلئے میو ہسپتال بھجوا دی گئی۔ باقی دو ملزمان سیف اللہ اور عارف کو CIA ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ انہوں نے علیحدہ علیحدہ انٹیروگیشن

پر لاہور میں تقریباً ساٹھ ڈکیتی کی وارداتوں کا انکشاف کیا اور بتلایا کہ جتنے زیورات انہوں نے لوٹے ہیں ان میں سے کچھ حرم گیٹ ملتان کے قریب حبیب بینک کے لاکر میں رکھے ہوئے ہیں اور کچھ زیورات ان کے ایک ساتھی ملزم مسکین علی ساکن میاں میر پل کے پاس ہیں۔ مسکین علی کے متعلق بتلایا کہ اس کو ساتھ لے کر یہ کل فیصل آباد واردات کیلئے گئے تھے۔ گلستان کالونی کے علاقہ میں واردات کر کے واپس آتے ہوئے اس کو آج صبح میاں میر پل کے قریب اتار دیا تھا۔ اس کے ساتھ پروگرام بنایا ہے کہ کل ٹھیک دو بجے دن وہ راحت بیکری کے سامنے چوک میں آ جائے گا۔ ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے اور آئندہ ڈیفنس کے علاقہ میں واردات کیلئے جائیں گے۔ لہٰذا اگر اسے یہ پتہ نہ چل گیا کہ ہم پکڑے گئے ہیں تو پھر لازمی وہاں پہنچے گا۔

دوسرے دن میں نے مسکین علی ملزم کی شناخت کے لیے سیف اللہ ملزم کو ہمراہ لیا اور پرائیویٹ گاڑی میں فلک شیر سب انسپکٹر اور چار جوان ہمراہ لیے۔ ہم سب سفید کپڑوں میں تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے دن راحت بیکری کے قریب کونے والی چرغہ کی دکان کے سامنے اپنی گاڑی چوک کی طرف رخ کر کے کھڑی کر دی۔ وہاں آس پاس اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سیف اللہ ملزم کو میں نے راستہ میں سمجھایا کہ اگر مسکین علی نہ پکڑا گیا تو تمام مال تم لوگوں کو پورا کرنا پڑے گا۔ اگر پکڑا گیا تو تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ جناب اب ہم پکڑے گئے ہیں اور ہمارا ایک ساتھی جو ہمارا لیڈر تھا مارا گیا ہے۔ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اسے بچائیں۔ اگر وہ آ گیا تو میں فوراً اس کی نشاندہی کر دوں گا۔

اب ہم گاڑی میں بیٹھے تھے اور ہماری نظریں سامنے چوک کی طرف تھیں۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ چوک میں کچھ لوگ ویگنوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ دو بج کر پانچ منٹ پر میاں میر پل کی طرف سے ایک ویگن چوک میں آ کر رکی۔ اس میں سے تین چار سواریاں اتریں جن میں مسکین علی کو دیکھتے ہی سیف اللہ نے کہا کہ وہ پیلے سوٹ والا مسکین علی ہے۔ ہمارے جوان جو سفید کپڑوں میں تھے دو ایک سائیڈ سے اور دو دوسری سائیڈ سے آ گئے۔ میں گاڑی سے اتر کر قریب کھڑا ہو گیا۔ فلک شیر سب انسپکٹر بھی جوانوں کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ پر تھا۔ مسکین علی کو تب پتہ چلا جب وہ ہمارے جوانوں کے شکنجہ میں آ چکا تھا۔ ایک سرکاری گاڑی جس میں باوردی مسلح جوان تھے وہ ہم نے فورٹریس سٹیڈیم کے پاس کھڑی کی ہوئی تھی جن کے ساتھ بذریعہ وائرلیس ہمارا رابطہ تھا۔ ان کو کال کیا وہ دو منٹ میں پہنچ گئے۔ مسکین علی کو اس گاڑی میں فورٹریس سٹیڈیم لے گئے

اور اسے بتلایا کہ اس کے ساتھی پکڑے جا چکے ہیں اب ہر بات سچ سچ بتا دو۔ سیف اللہ ہمراہی ملزم کو حراست میں دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ واقعی اس کے ساتھی پکڑے گئے ہیں۔ اس نے کہا جو اس کے ساتھیوں نے بتلایا ہے وہ درست ہے۔ میں ان کے ساتھ وارداتیں کرتا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ وارداتیں کرنے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے تمہارے ساتھی کہتے ہیں کہ لوٹا ہوا سارا زیور سونا وغیرہ تمہارے پاس ہے۔ اس نے کہا نہیں جناب وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ زیادہ مال ان کے پاس ہے اور کچھ میرے پاس بھی ہے۔ میں نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا ساتھی سرغنہ محبوب الرحمٰن مارا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اسے اس روز کا اخبار دکھایا جس میں اس کے مارے جانے کی خبر لگی ہوئی تھی۔ اور مرے ہوئے کی تصویر بھی اخبار کے پہلے صفحہ پر چھپی ہوئی تھی۔ اس کی مردہ حالت میں تصویر دیکھ کر وہ یک لخت پریشان ہو گیا۔ میں نے کہا جلدی جلدی بتاؤ کہ سارا زیور کدھر ہے۔ اس نے کہا جناب میرے پاس جو زیور ہے وہ میں برآمد کرا دیتا ہوں۔ آپ میاں میر پل کی طرف چلیں۔ میاں میر پل کے شرقی سرے کے قریب اس نے کہا کہ یہاں گاڑی روک لیں۔ ہم گاڑی روک کر نیچے اتر آئے۔ وہ ہمیں پل کے نیچے شرقی کنارے کی طرف لے گیا جہاں پل ختم ہوتا ہے۔ وہاں نیچے ایک غار میں ہمیں لے گیا اور زمین میں دفن کیا ہوا ایک شاپر بیگ نکالا جس میں تقریباً 4 کلوگرام سونے کے زیورات ہوں گے۔ یہ زیورات قبضہ پولیس میں لیے گئے۔ بعد ازاں عدالت عالیہ سے حکم حاصل کر کے ملتان حبیب بینک پہنچے۔ آخری واردات ایک شخص شیخ دولت علی ساکن اپر مال کی ہوئی تھی اس کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حبیب بینک کے مینجر کو عدالت عالیہ کا حکم دکھا کر لاکر کو کھلوایا۔ اس میں سے تقریباً سات کلو سونے کے زیورات اور کچھ کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔ وہ سارا مال قبضہ پولیس میں لے کر ہم بذریعہ ہوائی جہاز واپس لاہور پہنچ گئے۔ دوسرے روز ان تمام اشخاص کو جن کے گھر ان ڈاکوؤں نے وارداتیں کی تھیں CIA ہیڈ کوارٹر پر طلب کر لیا۔ وہ مال کی برآمدگی کی خبر سن کر اپنے ساتھ مستورات بھی لائے تھے تا کہ زیورات کی شناخت میں آسانی ہو۔

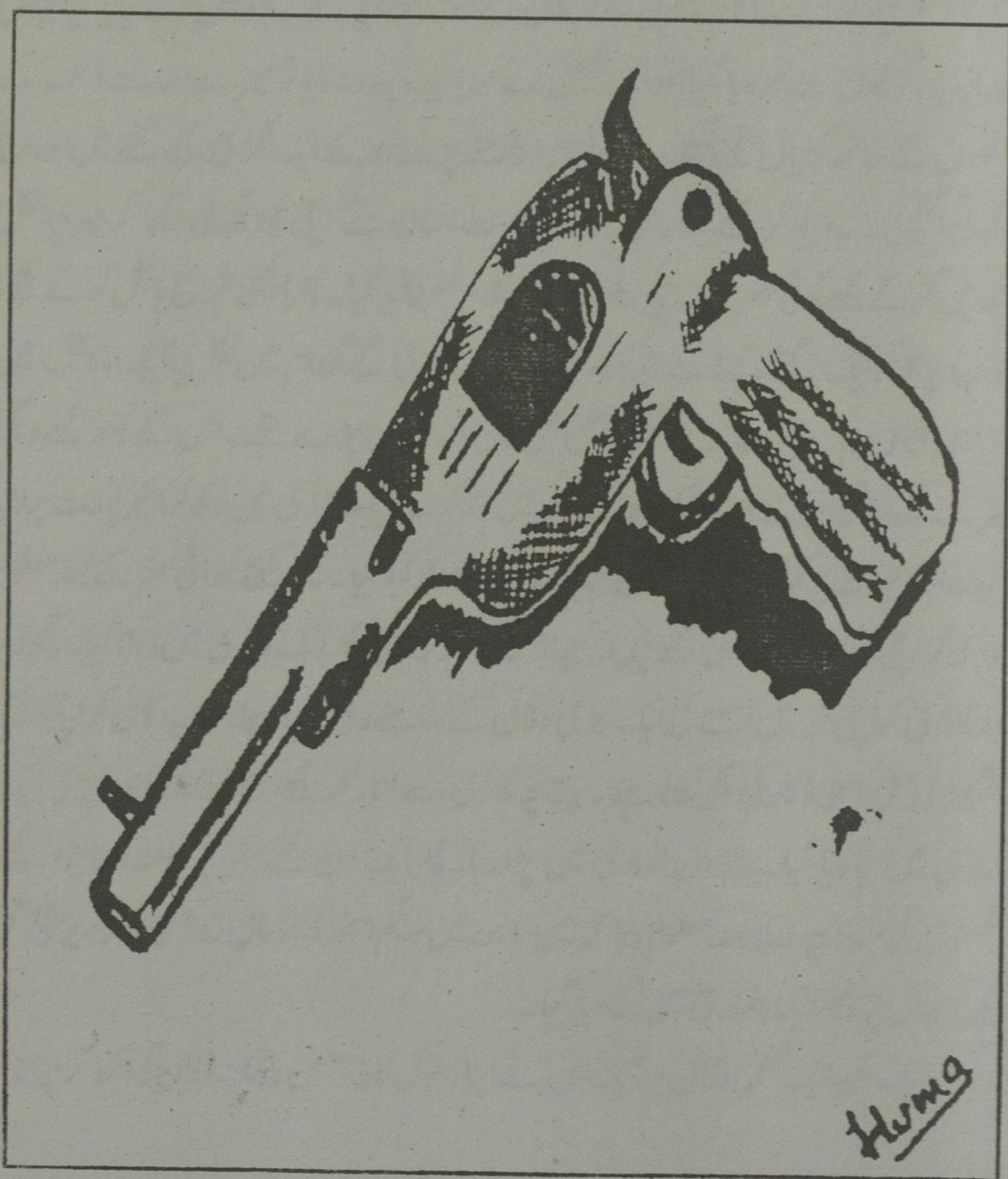
ایک بڑے کمرے میں میز لگا کر اس کے اوپر سفید کپڑا بچھا کر تمام زیور میزوں پر بچھا دیا۔ ایک ایک فیملی کو بلا کر باری باری زیورات دکھاتے گئے جو اپنا اپنا زیور چھانٹ کر علیحدہ کرتے گئے۔ ہم ساتھ ساتھ فہرست بناتے گئے۔ چونکہ تمام لوگ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے زیورات شناخت کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ ہر ایک نے اپنا اپنا زیور شناخت کر

لیا۔ سارے زیورات میں صرف بارہ عدد چوڑیاں متنازعہ بنیں ۔ایک فیملی نے اپنی شناخت کیں لیکن دوسری فیملی نے کہا کہ وہ ان کی ملکیت ہیں۔ بہر حال جہاں سے انہوں نے چوڑیاں بنوائی تھیں ان زرگروں کو بلا کر وہ چوڑیاں دکھائیں۔ یہ مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو گیا۔ مستورات اپنے اپنے لوٹے ہوئے زیورات واپس پولیس کے پاس دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

CIA ہیڈ کوارٹرز پر میلے کا سا سماں تھا۔ لوگ پولیس کو داد دے رہے تھے کہ پہلی دفعہ اتنی بھاری تعداد میں لوٹا ہوا مال لوگوں کو واپس مل رہا ہے۔ تمام مالکان کو عدالت کے حکم پر مال سپرد داری پر دے دیا گیا اور ملزمان کو جملہ مقدمات کی تفتیش مکمل ہونے پر چالان عدالت کر دیا۔

جناب ڈی آئی جی صاحب لاہور نے محمد نصر اللہ ہیڈ کانسٹیبل کو اے ایس آئی کے عہدہ پر ترقی یاب کر دیا اور بقایا ٹیم کو تعریفی اسناد اور نقد انعامات دیئے۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کی گرفتاری پر لاہور کے شہریوں میں پولیس پر اعتماد کی فضا بحال ہوگئی۔ متاثرہ خاندانوں نے مل کر تمام ٹیم کو ایک پر وقار تقریب میں گولڈ میڈل دیئے اور پولیس کی کارکردگی کو سراہا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کی گرفتاری پر عوام کی نظروں میں محکمہ پولیس کے وقار میں بے حد اضافہ ہوا۔ میرا اس بات پر ایمان مزید پختہ ہو گیا کہ اگر انسان نیک نیتی کے ساتھ خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر محنت اور ایمانداری سے اپنے فرائض سرانجام دے تو کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومتی ہے۔

ایک پستول کا سفر



ہزاروں سال سنگلاخ پہاڑوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر حوادث زمانہ سے محفوظ رکھا اور پتھروں کے درمیان ان سے چمٹ کر پیار و محبت کی زندگی گزاری۔ بالآخر حضرت انسان تلاش کرتا کرتا ایک دن مجھ تک آن پہنچا۔ سینہ کوہ چیر کر پتھر سے میری صدیوں کی رفاقت ختم کر کے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا اور میری خوب گت بنائی۔ آگ کی بھٹی میں ڈال کر مجھے پانی کی طرح کر دیا اور پھر ٹھنڈا ہونے پر میں لوہے کی شکل میں تیار ہو گیا۔ ایک دن انگلستان کی ایک مشہور اسلحہ ساز فیکٹری جس کا نام ''ویبلے'' ہے نے مجھے خرید لیا اور اپنی فیکٹری میں لا کر میری توڑ پھوڑ کر کے مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر ان ٹکڑوں کو پرزوں کی شکل میں تبدیل کیا اور انہیں جوڑ کر ایک چھوٹی قسم کا اسلحہ تیار کر کے میرا نام پستول رکھا۔ اس کے بعد مجھے ایک تجربہ گاہ میں لے جایا گیا جہاں میرا پیٹ گولیوں سے بھر دیا گیا اور ایک شخص نے میرا ایک پرزہ دبایا تو میرے منہ سے آگ کے شعلوں کے ساتھ گولیاں نکلنے لگیں۔ یہ گولیاں سامنے پڑے ہوئے ایک لکڑی کے تختے میں سوراخ کرتی گئیں۔ یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ حضرت انسان نے اپنی کاریگری دکھا کر میری شکل تبدیل کر کے مجھے کوئی خطرناک چیز بنا دیا ہے۔ مجھ پر نمبر لگایا گیا۔ پھر اچھی طرح پالش کر کے مجھے خوب چمکا کر ایک گتے کے ڈبے میں بند کر دیا گیا۔ فیکٹری کے گودام میں تقریباً ایک ماہ تک میں ڈبہ میں محبوس رہا۔ وہاں میرے دیگر ساتھی بھی کافی تعداد میں پڑے تھے۔ اس کے بعد مجھے دیگر میرے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بڑے ڈبہ میں بند کر کے ایک گاڑی میں رکھ کر ائیرپورٹ پر لایا گیا۔ ائیرپورٹ پر کھڑے ایک ہوائی جہاز میں ہمیں سوار کیا گیا۔ کچھ گھنٹے ہوائی سفر کے بعد معلوم ہوا کہ کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاز سے اتار کر ہمیں پھر ایک گاڑی میں ڈالا گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کراچی شہر میں اسلحے کی ایک بڑی دکان کے سامنے رکی۔ پتہ چلا کہ یہ دکان کراچی کے مشہور ڈوسل اسلحہ ڈیلر کی ملکیت ہے۔ چنانچہ گاڑی سے اتار کر مجھے دکان کے اندر پڑی ایک الماری میں سجا دیا گیا۔ چند دن الماری میں پڑا رہا۔ پھر ایک دن مجھے سفر پر روانہ ہونا پڑا۔ کچھ گھنٹوں کی مسافت کے بعد معلوم ہوا کہ میں لاہور میں ویلکم اسلحہ ڈیلر مال روڈ کی دکان پر پہنچ گیا ہوں جہاں پر مجھے ایک الماری میں رکھ دیا گیا۔

ایک دن ایک شخص دکان پر آیا۔ اس نے اپنا پستول کا لائسنس مالک دکان کو دکھا کر اپنا نام

حاکم علی ساکن سمن آباد بتلایا اور پستول خریدنے کی خواہش کی۔ حاکم علی نے مجھے پسند کر کے میری قیمت دکان کے مالک کو ادا کر دی اور مجھے ایک چمڑے کے خول میں ڈال کر اپنے گھر لے جا کر لوہے کی ایک الماری میں رکھ دیا۔ حاکم علی شریف آدمی تھا۔ کئی سال تک میں محفوظ پر امن طور پر الماری میں پڑا رہا۔ ایک دن حاکم علی بینک سے رقم نکلوانے گیا اور مجھے اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے میرے پیٹ میں چھ گولیاں ڈال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ بینک سے مبلغ دو لاکھ روپے کی رقم حاصل کر کے حاکم علی اپنی گاڑی ٹیوٹا کرولا 86 ماڈل میں بیٹھ کر اپنے گھر سمن آباد کی طرف جا رہا تھا کہ گندے نالے کے پُل کے قریب ایک موٹر سائیکل پر سوار تین جوان عمر ڈاکوؤں نے اچانک اپنی موٹر سائیکل گاڑی کے سامنے کھڑی کر دی۔ پیشتر اس کے کہ حاکم علی میری امداد لیتا ڈاکوؤں نے اسے میری نسل کا اسلحہ دکھا کر کار سے نیچے پھینک دیا اور میں بھی اپنے خول کے اندر دبکا پڑا تھا کیونکہ خود بخود کوئی ایکشن کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں تھی۔ ڈاکو گاڑی والٹن روڈ کی طرف لے گئے۔ وہاں گاڑی کو ایک کوٹھی کے اندر گیراج میں بند کر کے کھڑا کر دیا اور رقم اور مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک ڈاکو نے مجھے پکڑ کر اچھی طرح چیک کیا اور پھر اپنی جیکٹ کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا۔ ڈاکو مختلف وارداتوں میں مجھے استعمال کرتے رہے۔ گاڑی میں مجھے اکثر پاؤں کے نیچے پڑے ہوئے میٹ کے نیچے یا سیٹوں پر چڑھے ہوئے کور کے اندر چھپا لیتے تھے۔ پولیس کے ناکوں کے مقامات سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے وہ خفیہ راستے استعمال کرتے کہ پولیس کے ساتھ ان کا آمنا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن مجھے انتہائی دکھ ہوا جب ان ڈاکوؤں نے شاد باغ کے علاقہ میں ڈاکے کی واردات کے دوران مجھے استعمال کیا اور میرے اندر سے نکلنے والی گولیوں سے دو بے گناہ شہریوں کی جان لے لی۔ اس واردات کے بعد گھر پہنچ کر وہ ڈاکو ذرا بھی نہ پچھتائے بلکہ بڑے فخر سے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ پستول بہت اچھا ہے۔ میں اپنی تعریف سن کر شرمندہ ہو رہا تھا۔

ڈاکو اپنے مسکن پر پہنچ کر مجھے فرش پر بچھی دری کے نیچے کبھی صوفوں کے کور کے اندر اور کبھی الماری میں پڑی ہوئی کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھ دیتے تھے۔

ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان ڈاکوؤں نے سانده کے علاقہ میں دو بجے رات ڈاکہ کی ایک واردات کی، عورتوں کے زیورات وغیرہ اتروائے۔ مالک مکان نے اوپر والی منزل سے فائرنگ کی تو ڈاکو بھاگ پڑے۔ اتفاق سے دیوار پھلانگتے ہوئے ڈاکو کے ہاتھ سے میں اچانک

نیچے گر پڑا۔ ڈاکو کو مجھے دوبارہ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مالک مکان کے ٹیلیفون کرنے پر پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ موقع واردات دیکھتے وقت اچانک ایک پولیس افسر کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے جلدی سے مجھے اٹھایا۔ سب نے باری باری مجھے دیکھا اور پھر تھانے جا کر ایک کمرہ میں مجھے رکھ دیا جہاں اور بھی اسلحہ پڑا تھا۔ جس واردات کے دوران میں گرا تھا تھانہ کے محرر نے اس واردات کا مقدمہ نمبر وغیرہ ایک کپڑے کے ٹکڑے پر لکھ کر ٹکڑا میرے ساتھ باندھ دیا۔ ایک سال تک میں وہاں پڑا رہا۔ مختلف اوقات میں پولیس افسر آتے اس کمرہ کا معائنہ کرتے مجھے دیکھ کر پھر رکھ دیتے۔

ایک روز ایک پولیس افسر تھانہ میں آیا۔ اس نے اس کمرہ میں پڑا ہوا اسلحہ اور ہر چیز کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ چیک کیا۔ اس کے چیک کرنے کا انداز دوسرے افسران سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے مجھے اچھی طرح دیکھ کر تھانہ کے انچارج سے پوچھا کہ یہ پستول عرصہ ایک سال سے یہاں کیوں پڑا ہے؟ انچارج تھانہ نے جواب دیا سر! یہ پستول ڈاکے کی ایک واردات میں استعمال ہوا تھا۔ بھاگتے وقت ڈاکو کے ہاتھ سے گر پڑا جو موقع واردات سے ملا تھا۔ افسر کے مزید استفسار پر انچارج تھانہ نے بتلایا کہ اس واردات کے ملزمان ابھی تک ٹریس نہیں ہوئے۔ پولیس افسر مجھے اٹھا کر کمرہ سے باہر لایا، اچھی طرح غور سے مجھے دیکھا اور تھانہ کے محرر کو کہا کہ اس پر زنگ اور مٹی لگی ہوئی ہے اس کو اچھی طرح دھو کر صاف کر کے لاؤ۔ محرر باہر نکلنے پر لے گیا پہلے تو نلکے پر مجھے غسل کرایا پھر ریت وغیرہ سے مجھے اچھی طرح صاف کیا۔ مٹی اور زنگ اتر گئے تو میرا چہرہ نکھر آیا اور میں اپنے اصلی روپ میں آ گیا۔ میرے دستہ پر کمپنی کا نام اور مجھ پر کندہ نمبر صاف پڑھا جا رہا تھا۔ اس پولیس افسر نے کمپنی کا نام اور میرا نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کر لئے اور مجھے ساتھ لے کر مال روڈ پر ایک مشہور اسلحہ ڈیلر بخش الٰہی اینڈ کمپنی کے پاس فوری پہنچ گیا۔ کمپنی کے تجربہ کار مالک کے سامنے مجھے رکھ کر اس سے دریافت کیا کہ یہ پستول کہاں کا بنا ہوا ہے۔ کمپنی کے مالک نے عینک لگا کر مجھے بڑے غور اور باریک بینی سے دیکھا اور پولیس افسر کو بتلایا کہ یہ ویبلے کمپنی کا بنا ہوا ہے جو کہ انگلستان کی مشہور کمپنی ہے۔ پولیس افسر نے کہا یہ پستول ایک سنگین واردات میں استعمال ہوا ہے۔ ٹیلی فون یا فیکس کے ذریعہ اس کمپنی سے دریافت کر کے بتلائیں کہ انہوں نے یہ پسٹل کس کو فروخت کیا تھا۔ آپ کے اس تعاون پر ہم انشاء اللہ ان ظالم لوگوں کے گروہ کو ٹریس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ بخش الٰہی کمپنی کے مالک جو ایک شریف

النفس اور نیک شخص معلوم ہو رہا تھا نے میرا نمبر نوٹ کر لیا اور پولیس افسر کو کہا کہ دو دن کے بعد تمام اطلاع فراہم کر دی جائے گی۔ پولیس افسر بہت بے تاب تھا کہ اسے اسی وقت ہی معلوم کر کے بتلایا جائے لیکن کمپنی کے مالک نے دو دن کی مہلت مانگی۔ پولیس افسر مجھے ساتھ لے کر واپس اپنے دفتر چلا گیا اور تھانہ سانده کے افسر انچارج کو بلا کر مجھے اس کے حوالہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ دو دن بعد پھر یہ پسٹل ان کے پاس لایا جائے۔ انچارج تھانہ مجھے اپنے ساتھ تھانہ لے گیا وہاں پھر اس کمرہ میں رکھ دیا گیا جہاں میں نے ایک سال خاموشی کے ساتھ گزارا تھا۔

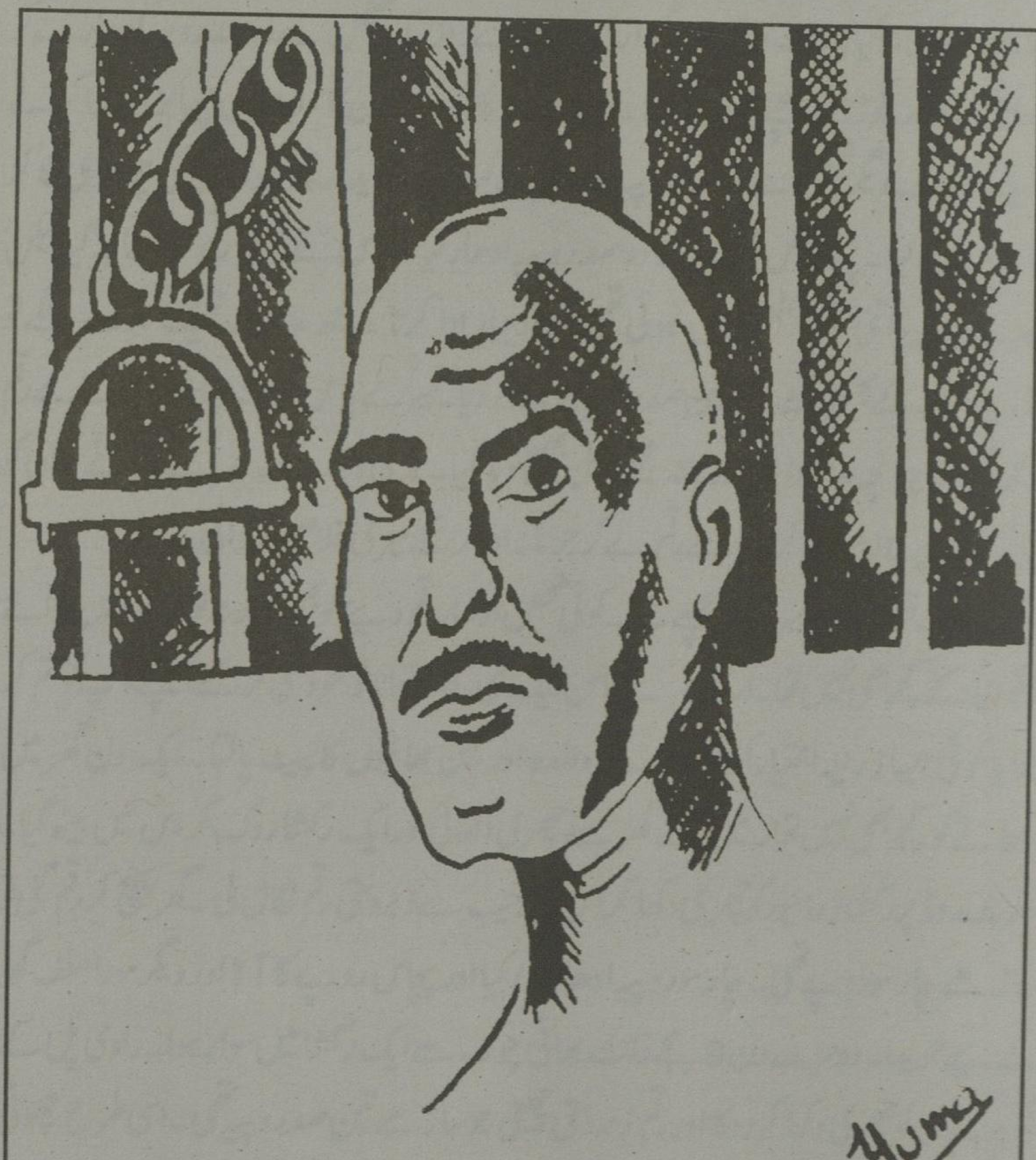
دو دن بعد افسر انچارج نے پھر مجھے نکال کر ہمراہ لیا اور اس پولیس افسر کے پاس لے گیا۔ وہ افسر پھر مجھے سیدھا بخش الٰہی والوں کی دکان پر لے گیا۔ وہاں ہمارے جانے سے پہلے انگلینڈ سے میرے متعلق تمام معلومات بذریعہ فیکس آ چکی تھیں۔ اسلحہ ڈیلر نے فیکس دکھائی جس میں میرے متعلق تحریر تھا کہ فلاں تاریخ کو ڈوسل کمپنی اسلحہ ڈیلر کراچی کو deliver کیا گیا تھا۔ پولیس افسر نے اسی وقت ڈوسل کمپنی کا ٹیلیفون بخش الٰہی والوں سے لے کر ان کے ٹیلیفون سے ڈوسل کمپنی کراچی والوں کو ٹیلیفون کر کے میرا نمبر اور ویبلے کمپنی کا بتا کر دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا کہ فلاں تاریخ کو یہ پستول ویلکم کمپنی اسلحہ ڈیلر مال روڈ لاہور کو فروخت کر کے deliver کیا تھا۔ وہ پولیس افسر فوری طور پر مجھے ویلکم کمپنی کی دکان پر لے گیا۔ مالک دکان کو میرے کوائف بتا کر ریکارڈ چیک کرایا تو وہاں میری آمد ثابت ہوگئی۔ اور آئندہ حاکم علی ساکن سمن آباد لائسنسدار کو فروخت کرنا بتلایا گیا۔ مجھے حاکم علی مذکور کے پاس لے جایا گیا جہاں اس نے آناً فاناً مجھے شناخت کر لیا۔ اس طرح کافی عرصہ کے بعد مالک سے میری ملاقات ہوگئی۔

پولیس افسر کے دریافت کرنے پر حاکم علی نے بتلایا کہ عرصہ تقریباً دو سال قبل تین موٹر سائیکل سوار ڈاکوؤں نے اس کی گاڑی ٹیوٹا کرولا 86 ماڈل چھین لی تھی جس میں دو لاکھ روپیہ اور پستول بھی تھا۔ پولیس افسر نے متعلقہ تھانہ سے اس واقعہ کی رپورٹ ابتدائی منگوائی۔ اس میں سے گاڑی کے کوائف، انجن نمبر اور چیسز نمبر نوٹ کئے اور سیدھا سی آئی اے قلعہ گوجر سنگھ کی سی۔ آر۔ او برانچ میں پہنچ کر ریکارڈ چیک کیا تو وہ پولیس افسر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ متذکرہ گاڑی تھانہ وزیر آباد میں برآمد ہو چکی ہے۔ پولیس افسر نے حاکم علی کو ساتھ لیا اور تھانہ وزیر آباد پہنچ گیا۔ وہاں حاکم علی نے اپنی گاڑی دیکھ کر شناخت کر لی جو کافی خستہ حالت میں تھی۔ تھانہ کے محرر نے پولیس افسر کے دریافت کرنے پر بتلایا کہ تقریباً چھ ماہ ہوئے ہیں کہ اس گاڑی میں دو جوان عمر لڑکوں نے

شراب پی ہوئی تھی گاڑی تیز رفتاری کی وجہ سے ایک بجلی کے کھمبا میں لگی۔ وہاں پولیس کی موبائل پارٹی نے ان دونوں لڑکوں کو پکڑ لیا اور شراب نوشی کے جرم میں مقدمہ درج کر کے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اس کے بعد آج تک وہ گاڑی لینے نہیں آئے۔ گاڑی کے اندر کاغذات وغیرہ نہیں تھے۔ ہم نے گاڑی کے کوائف سی۔آر۔او برانچ میں بھجوا دیئے تھے۔ پولیس افسر نے عدالت میں پہنچ کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ دونوں لڑکوں کے ایڈریس گکھڑ منڈی کے ہیں اور وہ ضمانت پر رہا ہو چکے ہیں۔ عدالت سے ان کے ایڈریس لے کر پولیس افسر گکھڑ منڈی پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس پتہ پر اس نام کے کوئی لڑکے نہیں رہتے۔

پولیس افسر پریشانی کے عالم میں پھر وزیر آباد عدالت میں پہنچا۔ وہاں ان کے ضمانت نامے اور مچلکے دیکھ کر ضامنوں کا پتہ کیا تو وہ بھی جعلی ثابت ہوئے۔ اب پولیس افسر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کو آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس کو کوئی بات سوجھی وہ پھر عدالت میں پہنچا۔ عدالت سے دونوں ملزمان کے مچلکے حاصل کئے۔ ان پر دونوں ملزمان کے انگوٹھے لگے ہوئے تھے۔ وہ مچلکے ساتھ لے کر دفتر فنگر پرنٹ بیورو لاہور پہنچا۔ دفتر کے انچارج کو دکھا کر کہا کہ ریکارڈ چیک کر کے بتایا جائے کہ ان مچلکوں میں درج ملزمان کا کوئی سابقہ ریکارڈ ہے یا نہیں۔ انچارج نے تمام ریکارڈ چیک کرایا اور مچلکے والے انگوٹھوں کا موازنہ کرایا تو اہم انکشاف ہوا کہ تین سال پیشتر تھانہ باغبانپورہ گوجرانوالہ میں یہ دونوں ملزمان ایک ڈاکے کی واردات میں چالان ہوئے تھے۔ وہاں سے ان کے کوائف لے کر پولیس افسر نے ان کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے اور دونوں ملزمان گرفتار کر لئے۔ حاکم علی نے دونوں ملزمان کو دیکھ کر شناخت کر لیا کہ انہوں نے ہی اس کی گاڑی چھینی تھی جس میں دو لاکھ روپیہ اور لائسنسی پستول تھا۔ میں (پستول) نے بھی ان ظالموں کو دیکھ کر پہچان لیا۔ پولیس افسر نے ان کا تیسرا ساتھی بھی پکڑ لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حاکم علی کی واردات کے علاوہ انہوں نے ڈاکے کی چالیس اور وارداتوں کا بھی انکشاف کیا ہے۔ حاکم علی مجھے اور گاڑی کو سپرداری پر اپنے گھر لے گیا۔ مجھے پھر الماری میں رکھ دیا گیا جہاں آج کل میں پُر اَمن طور پر سکون کی زندگی گزار رہا ہوں۔ میں اس پولیس افسر کی پیشہ وارانہ صلاحیت، محنت اور کاوش کی داد دیتا ہوں۔ دیگر پولیس افسر اس کہانی کو پڑھ کر راہنمائی حاصل کریں۔

میں ڈاکو کیسے بنا



مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد غربت کی وجہ سے میرے والدین مجھے مزید تعلیم نہ دلا سکے۔ کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن تھی۔ میں نے بھی اپنے والد کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کا پیٹ پالنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد مین نے لوہاری گیٹ لاہور کے سامنے ریڑھی پر پکوڑے بیچنے شروع کیے۔ مہنگائی کی وجہ سے انتہائی تنگدستی کے ساتھ دن گزر رہے تھے کہ ایک دن میونسپل کارپوریشن کا عملہ آیا اور میری ریڑھی اور پکوڑے گاڑی میں پھینک کر لے گئے۔ میں نے کافی منت سماجت کی لیکن میرا سامان واپس نہ کیا۔ رات فاقہ سے گزاری۔ دوسرے روز ایک شخص سے دوصد روپیہ ادھار لے کر چھابڑی لگا کر پکوڑے بیچنے شروع کیے۔ دو ہفتہ بعد پھر کارپوریشن کا عملہ میری چھابڑی اٹھا کر لے گیا۔ پھر ایک دیگر شخص سے دوصد روپیہ ادھار لے کر سامان خرید کر پھر پکوڑوں کی چھابڑی لگا کر کام شروع کیا۔ پہلا شخص جس سے دوصد روپیہ ادھار لیا تھا اس نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن میرے پاس اتنی رقم اکٹھی نہیں ہوئی تھی کہ ادھار ادا کرتا۔ کچھ حالات ٹھیک ہونے لگے تو کارپوریشن کے مجسٹریٹ نے تین صد روپیہ جرمانہ کر دیا۔ میرے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ چنانچہ عدم ادائیگی جرمانہ مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ میری والدہ نے میرے چھوٹے بھائی کو ایک ہوٹل پر ملازم رکھوا کر ان سے رقم لے کر جرمانہ ادا کر کے میری خلاصی کروائی۔

اب قرض خواہ میرے پیچھے تھے۔ کوئی شخص ادھار رقم دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ گھر میں سوائے فاقوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا یا تو خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لیتا یا کوئی ایسا ذریعہ اختیار کرتا جس سے والدہ اور بہن بھائیوں کا پیٹ پالتا۔ ایک دن گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے گھر سے چھری اٹھائی اور ایک رکشا روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ فورٹ روڈ پر رکشا ڈرائیور کو چھری دکھا کر اس کی جیب سے زبردستی رقم نکال لی۔ گھر پہنچ کر رقم گنی تو ساڑھے چار سو روپے تھی۔ چار سو روپیہ ادھار ادا کیا اور پچاس روپے کا آٹا اور دیگر سودا سلف گھر کے لیے خریدا۔ دوسرے دن 9 بجے رات بھاٹی چوک سے ایک رکشا میں سوار ہوا۔ راوی پل کے قریب اس کو چھری دکھا کر روکا اور رقم زبردستی چھینی جو ساڑھے تین صد روپیہ تھی۔ اسی طرح چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔ پھر ایک پٹھان سے پستول خرید لیا اور لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد اپنا ایک گروہ بنا کر بینک لوٹنے کی وارداتیں کیں۔ بنیادی طور پر ایک شریف مزدور تھا لیکن حالات نے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا۔

حصّہ سوم

- چند یادوں کی جھلکیاں

چند یادوں کی جھلکیاں

اختر رسول اور کلاشنکوف

ان دنوں کی بات ہے جب مرکز میں بینظیر بھٹو کی حکومت تھی اور صوبہ پنجاب میں میاں منظور احمد وٹو وزیراعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے۔ راقم ایس پی سی آئی اے تعینات تھا۔ مجھے آپریٹر نے اطلاع دی کہ آپ کو گورنر پنجاب یاد فرما رہے ہیں، ابھی ابھی گورنر ہاؤس سے ٹیلی فون آیا ہے۔ میں نے صاف ستھری وردی پہنی اور سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا گورنر ہاؤس پہنچ گیا۔ ان دنوں پنجاب اسمبلی کے سیکرٹری حبیب اللہ کو سیاسی وجوہ کی بنا پر اغوا کیا گیا تھا۔ اہم مسلم لیگی رہنماؤں کے خلاف مقدمہ درج ہوا جس کی تفتیش میری نگرانی میں ہو رہی تھی۔ گورنر ہاؤس کے روایتی لباس میں ملبوس ملازم گورنر ہاؤس کے پورچ میں کھڑے تھے۔ ان کے استفسار پر میں نے بتلایا کہ گورنر صاحب نے بلوایا ہے۔ ان میں سے ایک کلاہ نما پگڑی پہنے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر آ کر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دو بڑے کمروں کو کراس کرنے کے بعد سامنے والے کمرہ کا دروازہ کھول کر مجھے کہا کہ آپ اندر چلے جائیں۔ میں اندر گیا تو سامنے صوفے پر گورنر صاحب تشریف فرما تھے۔ دائیں طرف صوفے پر میاں منظور احمد وٹو وزیراعلیٰ پنجاب اور الطاف حسین سینئر منسٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گورنر صاحب کو سلوٹ کیا جنہوں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھ جانے کو کہا۔ گورنر صاحب نے حبیب اللہ کیس کی پراگرس پوچھی میں نے تمام حالات گوش گزار کیے۔ اسی اثنا میں بیرہ چائے لے کر آ گیا۔ چائے پی رہے تھے کہ گورنر صاحب نے مجھے کہا کہ چدھڑ! ایک کام کرو۔ اختر رسول پر کلاشنکوف ڈال کر اس کے خلاف چالان تیار کرو۔ عدالت سے سزا کروا کر اس کی چودھراہٹ ختم کرتے ہیں۔ پنجاب حکومت کے تینوں بڑے برج بیٹھے ہوئے تھے۔ گورنر صاحب کی یہ بات سن کر بظاہر تو محسوس نہ ہونے دیا لیکن اندر سے میں حیران اور پریشان ہو گیا کیونکہ اسی لمحہ اس کا جواب دینا تھا۔ میں نے کہا کہ سر! جلد بازی میں

ہم کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس سے حکومت کی نیکنامی ہونے کی بجائے الٹا بدنامی ہو کیونکہ اصلیت بہت جلد سامنے آ جاتی ہے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ آپ کا تجربہ کافی ہے آپ دیکھ لیں۔ میاں منظور احمد وٹو وزیر اعلیٰ پنجاب اور مخدوم الطاف حسین سینئر منسٹر اس دوران خاموش رہے۔ انہوں نے گورنر پنجاب کی بات کی نہ تو تائید کی اور نہ تردید کی۔ بعد میں مخدوم الطاف حسین سینئر منسٹر نے کہا کہ چدھڑ نے سی آئی اے میں کافی کام کیا ہے اس کو انعام ملنا چاہیے۔ گورنر صاحب نے وٹو صاحب کی طرف دیکھا جنھوں نے کہا کہ وہ آئی جی صاحب سے بات کریں گے۔ گورنر نے کہا شاباش اسی طرح کام جاری رکھیں۔ میں نے اجازت لے کر سلوٹ کیا اور باہر آ گیا۔ اب کلاشنکوف ڈالنے والا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اگر میں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے یس سر کہہ کر چوہدری اختر رسول پر کلاشنکوف ڈال دیتا تو یہ ایک ایسا ایشو بنتا جو حکومت وقت کی بدنامی کا سبب بنتا۔ اگر کسی افسر کو اپنے کسی سینئر افسر کی طرف سے یا حکومت کے کسی بڑے عہدیدار کی طرف سے کوئی ایسا حکم ملتا ہے جسے وہ سمجھتا ہے کہ یہ حکم قانوناً و اخلاقاً غلط ہے تو وہ ہرگز نہیں ماننا چاہیے بلکہ عقلمندی اور طریقے کے ساتھ سینئر کو حقائق اور اس کے نتائج سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے، حکومتیں بدل جاتی ہیں، پھر غلط کام کرنے والے کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے چوہدری ارشد امین کا قتل

مارچ 1996ء میں علامہ اقبال ٹاؤن کے علاقہ میں دن دہاڑے چوہدری ارشد امین کو قتل کر دیا گیا۔ مقدمہ قتل میں باقی ملزمان کے علاوہ میاں محمد ارشد پیپلز پارٹی کے سرکردہ لیڈر جہانگیر بدر کے دست راست کو اعانت کا ملزم رپورٹ ابتدائی میں نامزد کیا گیا۔ مقدمہ کی تفتیش سی آئی اے کے سپرد ہوئی جو چوہدری مسعود عزیز ڈی۔ ایس۔ پی نے میری نگرانی میں شروع کی۔ میں ان دنوں سی۔ آئی۔ اے کا انچارج تھا۔ میاں محمد ارشد کو گرفتار کر کے ریمانڈ جسمانی حاصل کر لیا گیا۔ سیاسی طور پر یہ مقدمہ کافی اہمیت پکڑ گیا۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ محمد عارف نکئی تھے جب کہ سینئر منسٹر ملک مشتاق اعوان تھے۔ میں اپنے دفتر CIA قلعہ گوجر سنگھ میں موجود تھا کہ گیارہ بجے دن ٹیلیفون آپریٹر نے مجھے بتلایا کہ 7 کلب سے ٹیلیفون آیا ہے وزیر اعلیٰ صاحب

آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نے 7 کلب پہنچ کر وزیر اعلیٰ صاحب کو اطلاع بھجوائی جنہوں نے تھوڑی دیر بعد بلا لیا۔ وزیر اعلیٰ صاحب کہنے لگے مسٹر چدھڑ ارشد امین کے قتل کا ایک با اثر ملزم آپ کے پاس گرفتار ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے عملہ نے اسے مہمان بنا کر بٹھایا ہے۔ میں نے کہا سر وہ گرفتار ہے اس کا ریمانڈ جسمانی لیا ہوا ہے اور تفتیش کر رہے ہیں، انشاء اللہ انصاف ہوگا۔ ''اس کو رگڑا ملنا چاہیے'' صاحب موصوف نے ہدایت فرمائی۔ میں سلام کر کے باہر نکلا تو گن مین نے مجھے بتلایا کہ وائرلیس پر اطلاع ملی ہے کہ سینئر منسٹر ملک مشتاق اعوان صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں سیدھا ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ کوٹھی کے باہر لوگوں کا بہت رش لگا ہوا تھا۔ مانی پہلوان مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آیا اور مجھے اندر تیسرے کمرہ میں لے گیا۔ وہاں کمشنر لاہور اور ایک ایم ۔این۔اے ملک صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

چند دنوں بعد 23 مارچ کو یادگار پاکستان میں ایک سیاسی پارٹی کا جلسہ ہونا تھا۔ ملک صاحب نے کمشنر لاہور کو کہا کہ ڈسٹرکٹ کونسل کے فنڈ سے ایم۔این۔اے کو چار لاکھ روپیہ دے دیں اور ساتھ ہی ایم۔این۔اے کو کہا کہ آپ اس رقم سے گاڑیاں اور لوگ اکٹھے کر کے 23 مارچ کے جلسہ میں جلوس لے کر آئیں۔ ایم۔این۔اے نے کہا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ ارشد امین کے قتل کے کیس میں ہمارا ساتھی میاں ارشد CIA میں پکڑا ہوا ہے اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا کہ انشاء اللہ انصاف ہوگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اپنے دفتر CIA قلعہ گوجر سنگھ پہنچا۔ چوہدری مسعود عزیز DSP سے کیس کی پراگرس پوچھی اور میرٹ پر فیصلہ کرنے کی ہدایت کی۔ تفتیش میں میاں ارشد بے گناہ ثابت ہوا۔ جس روز ریمانڈ جسمانی ختم ہونا تھا اس سے ایک دن قبل ڈی۔آئی۔جی لاہور نے اس مقدمہ کی فائل منگوائی اور ساتھ ہی مجھے اور ایس۔ پی لاہور حاجی حبیب الرحمان کو بلوایا۔ ڈی۔آئی۔جی صاحب نے مقدمہ کے حالات مجھ سے پوچھے۔ میں نے تفصیل کے ساتھ حالات بتلائے اور میاں ارشد کی بے گناہی کے متعلق بتلایا۔ ڈی۔آئی۔جی نے پوچھا تو پھر آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے مقدمہ سے ڈسچارج کرا دیا جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں ارشد مالدار آدمی ہے اس کو ڈسچارج کرانے پر پولیس کے ذمہ رشوت کا الزام لگ جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب اگر پولیس رشوت نہیں لے گی تو انشاء اللہ الزام بھی نہیں لگے گا اور یہ کہ صرف رشوت کے الزام کے ڈر سے کسی بے گناہ شخص کو قتل جیسے

سنگین جرم میں ملوث کر دینا بھی سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ حاجی حبیب الرحمان ایس۔ ایس۔ پی نے میری اس بات کی تائید کی۔ دوسرے روز میاں ارشد کو عدالت میں پیش کر کے مقدمہ سے ڈسچارج کروا دیا۔

ہوائی جہاز روک لیا گیا

ہمایوں گوجر ضلع سیالکوٹ کا خطرناک شخص جو مختلف اضلاع میں قتل اور ڈاکہ زنی جیسے سنگین مقدمات میں کافی عرصہ سے اشتہاری مجرم قرار دیا جا چکا تھا نے جمرود ''علاقہ غیر'' میں رہائش رکھ کر خفیہ ٹھکانہ بنا لیا جہاں سے وہ پنجاب کے اضلاع میں آ کر قتل اور ڈاکہ کی واردات کر کے واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔ اس کے اس ٹھکانہ تک پولیس کی رسائی ناممکن تھی کیونکہ قبائلی قانون اور روایات کے مطابق پولیس علاقہ غیر میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ہمایوں گوجر کی گرفتاری پولیس کے لئے ایک معمہ اور چیلنج بن چکی تھی۔ میں بطور ایس۔ پی سی آئی اے تعینات تھا۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں موجود تھا کہ میرے ایک واقف کار نے مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ ہمایوں گوجر لاہور ائیر پورٹ پر دیکھا گیا ہے جس نے کراچی جانے والی فلائٹ کا بورڈنگ کارڈ حاصل کر لیا ہے اور تھوڑی دیر بعد فلائٹ کراچی کیلئے روانہ ہونے والی ہے۔ اس نے ہمایوں گوجر کا مکمل حلیہ اور جو لباس اس نے پہن رکھا تھا اس کی تفصیل بھی بتلائی۔ میں نے چوہدری مسعود عزیز ڈی۔ ایس۔ پی سی آئی اے کینٹ کو کہا کہ فوری طور پر ائیر پورٹ پر پہنچیں اور ہمایوں گوجر کو گرفتار کریں۔ چوہدری مسعود عزیز فوری طور پر اپنی سرکاری گاڑی میں ائیر پورٹ پر پہنچ گئے اور وہاں سے ٹیلیفون کیا کہ کراچی جانے والی فلائٹ کے ڈور کلوز ہو گئے ہیں اور فلائٹ پرواز کیلئے تیار ہے۔ مزید بتلایا کہ پی آئی اے کے ائیر پورٹ مینجر سے بات ہوئی ہے وہ نہیں مان رہے۔ میں نے کہا کہ مینجر کا ٹیلیفون نمبر بتائیں۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون نمبر بتلایا۔ میں نے اس نمبر پر ٹیلیفون کیا تو Engage ملا۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کو وائرلیس کے ذریعہ کہا کہ مینجر صاحب کا ٹیلیفون یہ کہہ کر خالی کرائیں کہ ایمرجنسی کال ہے۔ ٹیلیفون مل گیا۔ ادھر سے مینجر صاحب خود بول رہے تھے۔ میں نے ایمرجنسی میں بتایا کہ کراچی جانے والی فلائٹ میں ایک خطرناک اشتہاری مجرم سوار ہو کر کراچی جا رہا ہے اس کی گرفتاری میں مدد دیں۔ انہوں نے کہا کہ اب یہ ناممکن ہے کیونکہ جہاز پرواز کیلئے بالکل تیار ہے۔ میں نے کہا اطلاع کے مطابق اس کے پاس خطرناک آتشیں مادہ ہے جو جہاز کی تباہی کا



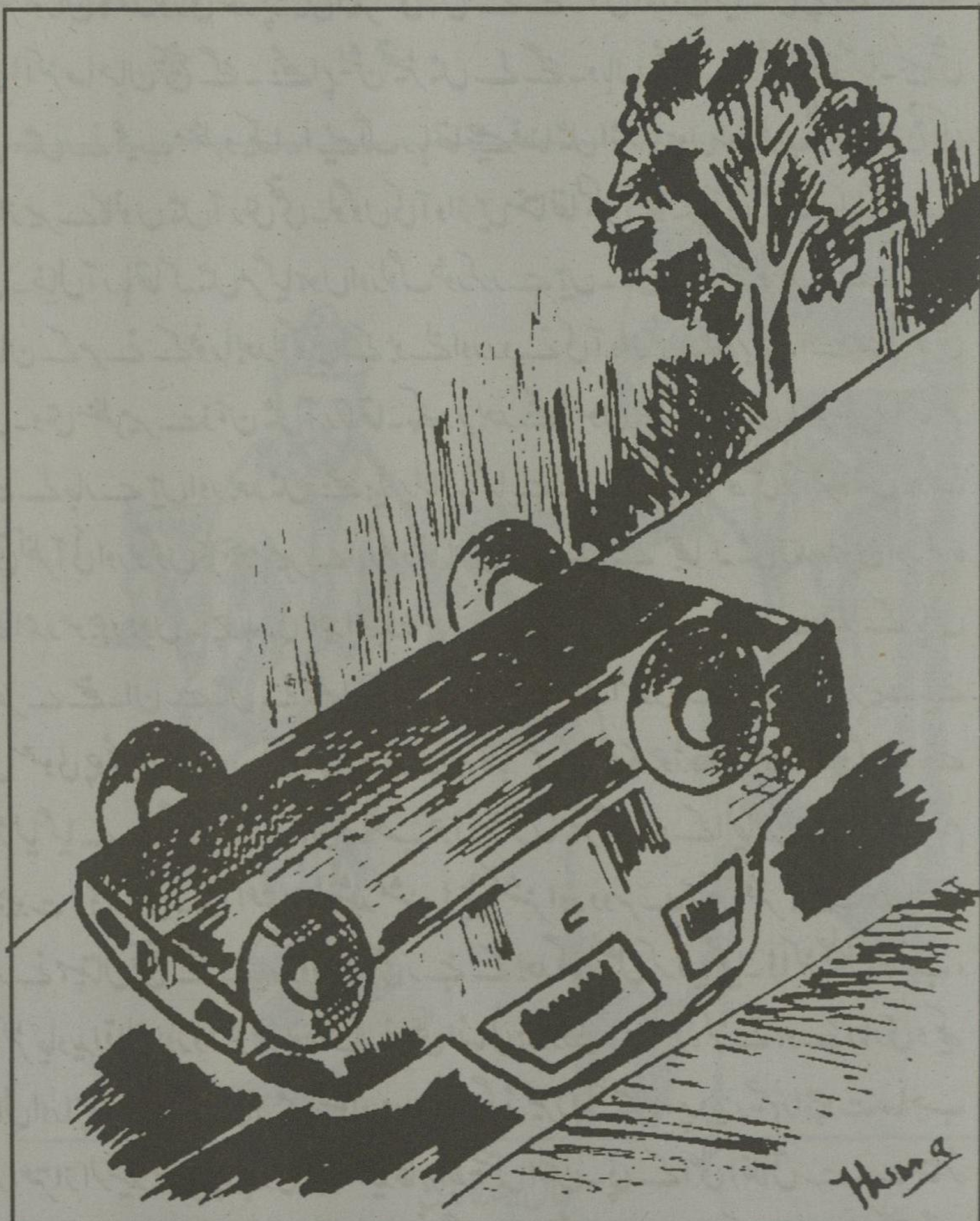
ہوائی جہاز روک لیا گیا

سبب بن سکتا ہے یا جہاز اغوا کیا جا سکتا ہے۔ اس پر انہوں نے ہنگامی طور پر جہاز روک لیا اور چوہدری مسعود عزیز ڈی۔ایس۔پی کو ہمراہ لے کر جہاز کی تلاشی لی۔ ہمایوں گوجر جہاز میں موجود پایا جس کو پکڑ لیا گیا۔ ٹکٹ کی پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بوگس نام پر سفر کر رہا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی نے ائیر پورٹ سے ٹیلیفون پر مجھے اطلاع دی کہ سر جی مبارک ہو ہمایوں گوجر پکڑ لیا گیا ہے۔ میں نے افسران بالا کو اطلاع دی جو انتہائی خوش ہوئے۔ ہمایوں گوجر کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی اور تمام اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ خبر چھپی۔ عوام نے اس کی گرفتاری پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔

حادثہ

مورخہ 30 جنوری 2000ء کو دھوپ میں کوٹھی کے باہر چبوترہ پر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ بیگم نے آ کر کہا کہ آج اتوار کی وجہ سے چھٹی ہے بچوں کو دریا پر سیر کرانے لے چلیں۔ ڈیرہ غازی خان سے دریائے سندھ کا پل غازی گھاٹ تقریباً 18 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے کئی دفعہ دریا کی سیر کر چکے ہیں آج گھر میں بیٹھ کر ٹیلیویژن پر ڈرامہ دیکھیں۔ وہ اندر چلی گئیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد پھر باہر میرے پاس آ کر کہا کہ مریم بیٹی ضد کر رہی ہے کہ آج ضرور سیر کیلئے لے چلیں۔ مجھے مجبوراً ماننا پڑا۔ تین بجے دن ہم اپنے گھر ڈیرہ غازی خان سے ڈبل کیبن ڈالا میں بیٹھ کر پل غازی گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ بیگم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی۔ پچھلی سیٹ پر مریم بیٹی اور نوکرانی اور اس کے دو بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بالکل مناسب رفتار پر گاڑی چلا رہا تھا۔ جب ڈیرہ غازی خان سے 7/8 کلومیٹر گیدڑ والا سے تھوڑا آگے پہنچے تو دیکھا کہ اچانک گاڑی سڑک سے اتر کر بائیں طرف لڑکھڑاتی ہوئی گہرے کھڈے کی طرف جا رہی ہے۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں اور دوسرے لمحے موت کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک گاڑی کھڈے کے دوسرے سرے سے ٹکرائی اور الٹ گئی۔ میں سٹیرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنس گیا۔ اسی اثنا میں کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے جنہوں نے مجھے، بیگم کو اور بچوں کو باہر نکالا۔ میرے سر اور چھاتی پر چوٹیں آئی۔ بیگم کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا جو بیہوشی کے عالم میں پڑی تھی۔ نوکرانی اور بچوں کو معمولی چوٹیں آئیں۔ مریم بھی معمولی زخمی ہوئی۔

ایک شخص نے اپنے ڈالے میں ہمیں فوری طور پر ہسپتال پہنچایا۔ ڈالے سے اترا۔ وہاں

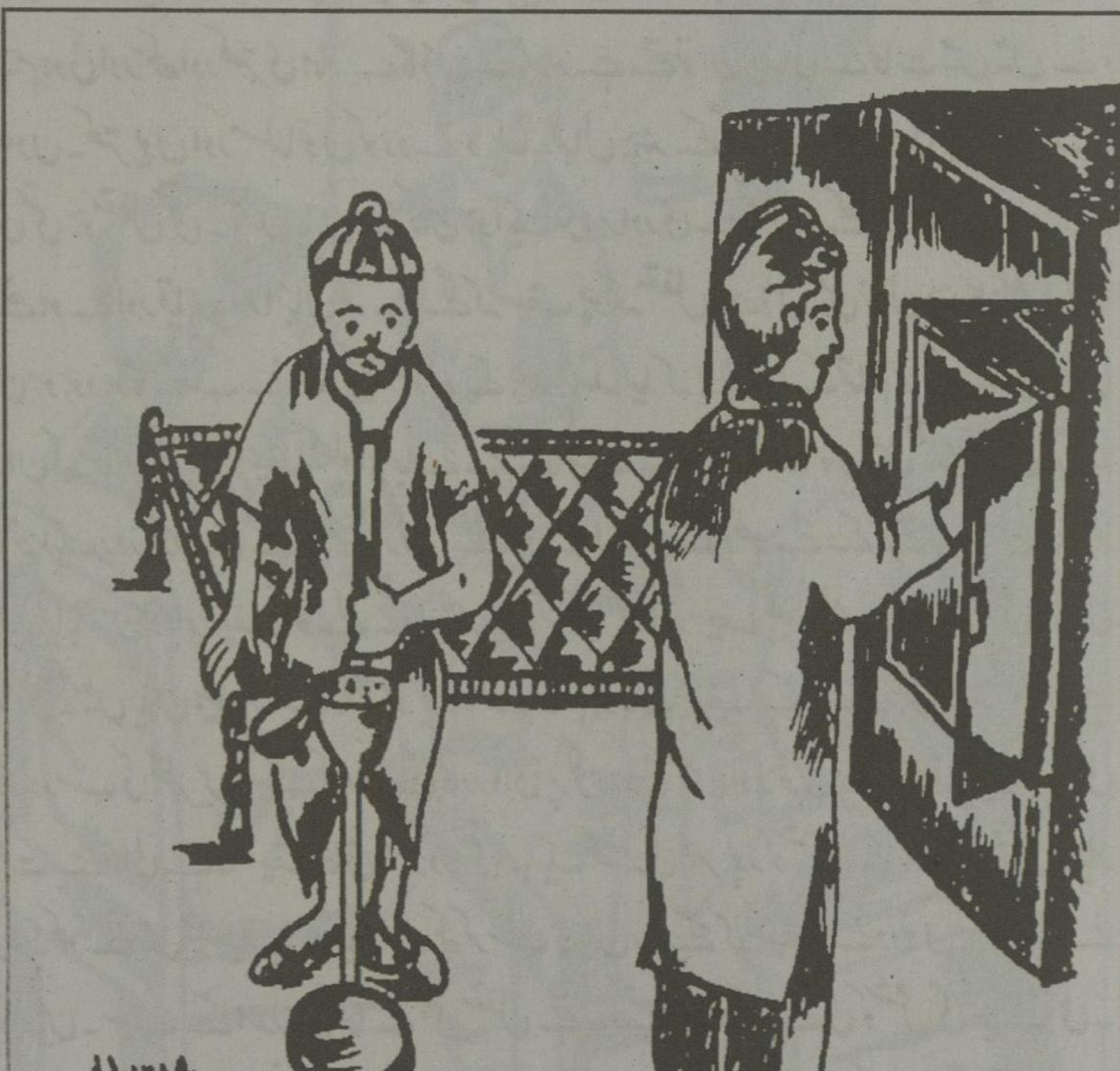


حادثہ

ایک پولیس کانسٹیبل کھڑا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ کہنے لگا سر جی کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ فوری طور پر ایمر جنسی میں گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو بتلایا۔ ڈاکٹر اور ان کا عملہ فوری طور پر ہمیں ایمر جنسی میں لے گئے۔ اس دوران میڈیکل سپر نٹنڈنٹ اور باقی ڈاکٹر صاحبان پہنچ گئے۔ مجھے اپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ وہاں مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ بیہوشی میں، میں نے عجیب منظر دیکھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے فضا میں اڑ رہا ہوں اور عجیب قسم کی گونج کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ لوگوں کی آوازیں سنتا تھا لیکن سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خیال آ رہا تھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ شور کر رہے ہیں۔ میں نے اکثر لوگوں سے سنا تھا کہ انسان کے مرنے کے فوراً بعد لوگوں کے بولنے اور رونے کی آوازیں کچھ دیر تک اسے سنائی دیتی ہیں۔ وہی منظر میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ چارپائی یا سٹریچر پر اٹھا کر مجھے لے جا رہے ہیں اور بعد میں مجھے بیڈ پر لٹا دیا گیا ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو کمرہ میں ٹیوب جلتی نظر آئی اور لوگوں کا ہجوم میرے اردگرد تھا۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ میں زندہ ہوں اور کمرہ کے اندر موجود ہوں۔ چوہدری عبدالحمید طاہر صاحب ایڈیشنل ایس۔ پی میرے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ ان سے میں نے بیگم اور بچوں کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ خیریت سے ہیں معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کا بائیں کولہے کا جوڑ Dislocate ہو گیا تھا جسے جوڑ لیا گیا ہے۔ بریگیڈئر زاہد حسین صاحب جو ڈویژنل مانیٹرنگ ٹیم کے انچارج تھے، پرویز رحیم راجپوت ڈی۔ آئی۔ جی اعتزاز الرشید کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور دوسرے سینئر افسر خیریت دریافت کرنے ہسپتال پہنچ گئے۔ چار روز ہسپتال رہنے کے بعد گھر منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر جلیل ثاقب، ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر محمد یوسف نے اعلیٰ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری دیکھ بھال اور اچھا علاج کیا جن کا میں ممنون ہوں۔ بریگیڈئیر زاہد حسین، پرویز رحیم راجپوت صاحب اور اعتزاز الرشید کمشنر، چوہدری عبدالحمید طاہر ایڈیشنل ایس۔ پی کے اعلیٰ اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ سرکاری ملازمین کے علاوہ عوام کے کافی لوگ میری خیریت دریافت کرنے ہسپتال پہنچ گئے جن کے اظہار ہمدردی اور حسن اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا۔

نہال چند کا دھن

ہندو پاکستان کی تقسیم 1947ء کی بات ہے جب میں پہلی کلاس میں پڑھتا تھا۔ ہمارے



نہال چند کا دھن

گاؤں میں سکھ اور کھتریوں کی کچھ آبادی تھی۔ سکھوں میں جسونت سنگھ، دیوا سنگھ، درشن سنگھ اور جگت سنگھ اور کھتریوں میں رام لال اور نہال چند کے نام آج تک مجھے یاد ہیں۔ گاؤں کے چوک میں ان کی کریانہ کی دکانیں تھیں۔ نہال چند زرگری کا کام کرتا تھا۔ اس کی رہائش ہمارے گھر کے نزدیک تھی اور اپنے گھر میں ہی وہ اپنا کاروبار کرتا تھا۔ سکھ کھتری اور مسلمانوں کا آپس میں اچھا سلوک تھا اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہوئی اور سکھ اور کھتری ہمارے گاؤں سے جا رہے تھے تو ان جدائی کے لمحات میں میں نے، سکھوں۔ کھتریوں اور مسلمانوں کو روتے دیکھا۔ نہال چند کے گھر میں ایک بڑی پیٹی (سیف) پڑی تھی جو مقفل تھی۔ آس پاس کے مکین جو ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے ان کے بزرگ اکٹھے ہوئے اور قیاس آرائیاں کرنے لگے کہ سیف چونکہ مقفل ہے اس میں نہال چند کا جمع کیا ہوا دھن موجود ہوگا۔ سب نے صلاح مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ برادری کے تمام بزرگ اکٹھے ہوں اور ان کی موجودگی میں سیف کھلوایا جائے۔ جو کچھ سیف سے نکلے گا وہ آپس میں تقسیم کریں گے۔ چنانچہ ایک روز برادری کے تمام بزرگ اکٹھے ہو گئے اور سیف کو کھولنے کے لئے بابا حسن لوہار کو بلوایا۔ بابا حسن لوہار سیف کھولنے کے اوزار لے کر پہنچ گیا اور سیف کھولنے کے لئے کوشش شروع کر دی۔ میں پاس بیٹھ کر سب ماجرا دیکھ رہا تھا۔ تمام بزرگ سیف کے سامنے بیٹھ کر حقہ پی رہے تھے اور سب کی نظریں سیف کھولنے کی کارروائی پر لگی ہوئی تھیں اور خوش تھے کہ عنقریب مفت کی دولت ملنے والی ہے۔ سیف کافی مضبوط تھی۔ ایک گھنٹہ کی بھرپور کوشش کے بعد بابا حسن لوہار سیف کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ سیف کے دونوں بڑے خانے خالی ہیں۔ سیف کے اندرونی خانے بھی مقفل تھے۔ اب ان کو کھولنے کی کوشش کی جانے لگی۔ سب پر امید تھے کہ اندرونی خانوں میں ضرور مال ہوگا۔ جب اندرونی خانے کھولے گئے تو ان میں سے ایک خانہ خالی تھا اور دوسرے خانہ میں زیورات رکھنے والے ڈبے پڑے تھے۔ ڈبوں کو دیکھ کر سب خوش ہوئے کہ ان میں زیورات ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر سب کی امیدوں اور خوشیوں پر پانی پھر گیا کہ تمام ڈبے خالی تھے۔

قمار بازی یا سیاسی میٹنگ

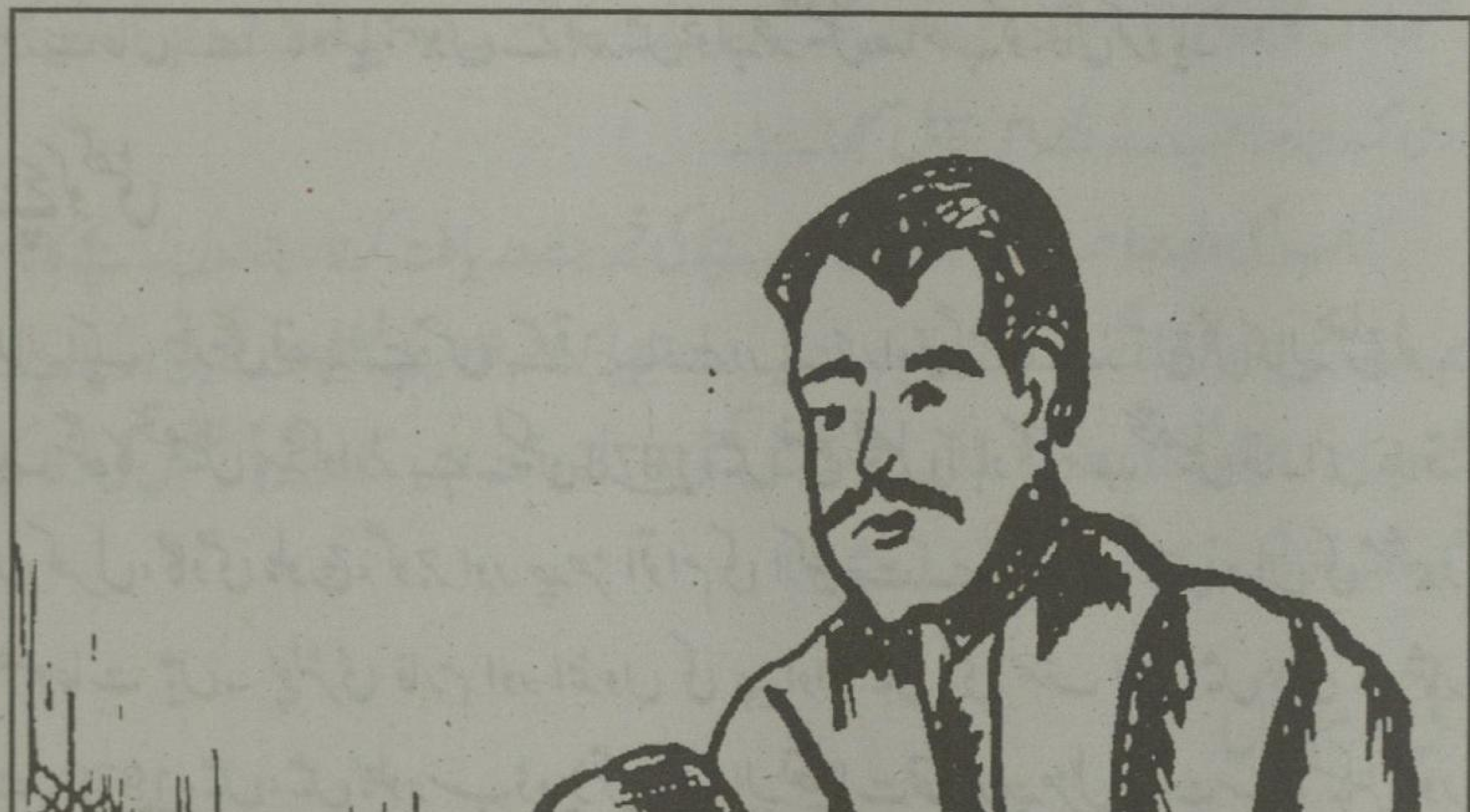
1975ء میں خواجہ محمد طفیل بطور ایس۔ پی میانوالی تعینات تھے اور راقم بطور ایس ایچ او



قمار بازی یا سیاسی میٹنگ

تھانہ موچھ ضلع میانوالی فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میانوالی شہر کے محلّہ پنوں خیل میں ان دنوں قمار بازی کا ایک بہت بڑا اور بدنام اڈا امیر خان پنوں خیل اور اس کے بھائی مسکین اللہ پنوں خیل کی زیر سرپرستی چلایا جارہا تھا جہاں لاکھوں روپے کی رقم داؤ پر لگائی جاتی تھی اور دور دراز سے بدنام قمار باز آ کر اس میں شرکت کرتے۔ مسکین اللہ پنوں خیل ایک بڑی سیاسی پارٹی کا میانوالی کا سیکرٹری جنرل بھی تھا۔ خواجہ محمد طفیل کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا۔ وہ ایک دیانتدار منصف مزاج اور مضبوط قسم کا پولیس افسر تھا۔ خواجہ صاحب کو بھی اس کی قمار بازی کے اڈے کی اطلاع مل چکی تھی کہ یہاں لاکھوں روپے کا جوا ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹھان لی کہ اس اڈے کو ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے ایک ورکر کو اعتماد میں لے کر مکمل معلومات حاصل کیں اور ایک دن جب قمار بازی زوروں پر تھی دو بجے دن ایس۔ پی صاحب کی ہدایت پر پولیس نے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ عمارت کا گیٹ مضبوط اور قلعہ نما دیواروں کی وجہ سے پولیس کو حویلی کے اندر داخل ہونے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس سے حویلی کے اندر موجود لوگوں کو مہلت مل گئی اور اس اثنا میں انہوں نے قمار بازی کے آلات اور رقم وغیرہ ادھر اُدھر چھپا دی۔ اور حویلی کے اندر کرسیاں اور چارپائیاں اسی انداز میں ڈال دیں جیسے لوگ بیٹھ کر کوئی میٹنگ کر رہے ہوں۔ یہ سب کچھ دروازہ کے اندر ایک چھوٹے سے سوراخ سے نظر آ رہا تھا اور بھگدڑ مچنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریڈنگ پارٹی کی قیادت چوہدری جہانگیر ڈی۔ ایس۔ پی کر رہے تھے۔ پولیس پارٹی دروازہ زور سے کھٹکھٹاتی رہی۔ جب اندر سے سب کچھ ٹھیک کر لیا گیا تو بڑی سیاسی پارٹی کا سیکرٹری جنرل مسکین اللہ پنوں خیل 15/20 آدمیوں کے ہمراہ گیٹ پر آ گیا اور اندر سے گیٹ کھولتے ہی زور زور سے چلانا شروع کر دیا کہ ایس۔ پی خواجہ محمد طفیل جماعت اسلامی کے آدمی ہیں۔ اندر ہماری پارٹی میٹنگ ہو رہی تھی انہوں نے ہماری پارٹی میٹنگ خراب کرنے کے لئے جماعت اسلامی کے اشارے پر چھاپہ مروایا ہے۔ چوہدری جہانگیر ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا کہ اندر تو جواء ہو رہا تھا اور آپ کہتے ہیں کہ پارٹی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ''چور نالے چتر''۔ اس پر حالات خراب ہونے لگے لیکن ڈی ایس پی کی صبر آزما پالیسی کی وجہ سے بچ بچاؤ ہو گیا اور پولیس پارٹی ناکام واپس لوٹ گئی۔

مسکین اللہ پنوں خیل نے غلام مصطفیٰ کھر گورنر پنجاب کو اطلاع دی کہ ایس پی میانوالی نے



بچے کو گھٹی

جماعت اسلامی کے اشارے پر ہماری پارٹی میٹنگ پر پولیس کا چھاپہ مروا کر اسے خراب کر دیا ہے۔ جناب کھر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً خواجہ محمد طفیل کی محکمہ سے برخواستگی کے آرڈر جاری کر دیئے۔ اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس نے جناب ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کر کے اصل صورت حال سے آگاہ کیا جنہوں نے بعد میں خواجہ محمد طفیل صاحب کو بحال کر دیا۔

بچے کو گھٹی

کمالیہ ایک تاریخی قصبہ ہے جس کے قریب سے دریائے راوی گزرتا ہے۔ آج کل کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کا تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ لیکن 1978ء میں ضلع فیصل آباد کی سب تحصیل تھا۔ اس علاقہ میں کھرل، گادھی بلوچ، گوجر اور چدھڑ اقوام کی اکثریت ہے۔ دریاں کھیس وہاں کی مشہور مصنوعات ہیں۔ پولٹری فارم اور انڈوں کی پیداوار میں بھی صف اول میں اس کا شمار ہے۔ 1978ء میں، میں بطور سب ڈویژنل افسر کمالیہ تعینات تھا۔ راجہ مزمل حیات سب انسپکٹر بطور ایس ایچ او تھانہ کمالیہ تعینات تھا۔ بہادر، نڈر، راست گو اور دلیر پولیس افسر تھا۔ سردیوں کے موسم میں ایک سخت سرد رات جس میں ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی، تقریباً ایک بجے رات اردلی نے دروازہ پر آ کر گھنٹی بجائی۔ میں نے اندر سے ہی بغیر دروازہ کھولے اس سے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ راجہ صاحب انچارج تھانہ کمالیہ باہر آئے ہیں اور وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اتنے خراب موسم اور بے گاہ وقت میں ایس ایچ او کا آنا خطرے سے خالی نہیں ہے، ضرور کوئی نہ کوئی سنگین واقعہ ہو گیا ہوگا۔ میں گرم چادر اوڑھ کر جلدی سے باہر آیا تو دیکھا کہ راجہ صاحب کمبل اوڑھنے کے باوجود سردی سے کانپ رہے ہیں۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ راجہ صاحب خیریت تو ہے۔ انہوں نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتلایا کہ سر مبارک ہو میرے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں نے زچہ بچہ کی خیریت دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ زچہ بچہ بالکل ٹھیک ہیں آپ کو اس بے گاہ وقت میں اس لیے تکلیف دی ہے کہ بچہ کو ''گھٹی'' آپ نے دینی ہے۔ (گھٹی وہ خوراک ہوتی ہے جو بچہ کو پیدا ہونے کے بعد پہلی دفعہ کھلائی جاتی ہے میں خوشی خوشی راجہ صاحب کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ خوبصورت، پیارا، چاند سا بیٹا تھا جو دنیا کی پہلی خوراک حاصل کرنے کیلئے بے قرار نظر آ رہا تھا۔ میں نے بسم اللہ کر کے بچے کے

منہ میں گھٹی ڈالی۔اسے پیار کیا اور مستقبل روشن اور درازی عمر کی دعا کی۔

راجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ کافی عرصہ آپ کے ساتھ کام کرنے کے بعد آپ کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ میری یہ خواہش تھی کہ جب بچہ پیدا ہوگا تو گھٹی آپ کے ہاتھوں سے کھلواؤں گا اور اس کا نام بھی احمد رکھوں گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مجھے انتہائی خوشی بھی ہوئی کہ راجہ صاحب نے مجھے اس قابل سمجھا ہے۔

جب بھی راجہ صاحب مجھے ملتے ہیں میں بچے کی خیریت دریافت کرتا رہتا ہوں۔ بچے کا نام میرے نام پر احمد رکھا۔گزشتہ دنوں راجہ صاحب نے بتلایا کہ احمد فلائیٹ لیفٹیننٹ بھرتی ہوگیا ہے۔ مجھے یہ سن کر انتہائی خوشی ہوئی کہ میں نے منہ میں گھٹی ڈالتے وقت اس کے روشن مستقبل کی دُعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی۔(آمین)

نسلی بدمعاش

ذوالقرنین عرف یوکا سوتر منڈی لوہاری کا رہائشی ہے۔ یہ ایک بدنام چور اور نقب زن ہے۔ یہ عام طور پر بڑے شہروں کی مشہور مارکیٹوں میں واردات کرتا تھا۔اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ مارکیٹ کی ریکی کر کے کسی دکان کو اپنا ٹارگٹ بنالیتا۔صبح کو اذان سے کچھ دیر پہلے گاڑی دکان کے سامنے کھڑی کرلیتا اور گینتی سے دکان کے تالے توڑ کر اندر سے تمام مال گاڑی میں رکھ کر رفو چکر ہوجاتا۔فورٹریس سٹیڈیم مارکیٹ لاہور، راجہ بازار راولپنڈی اور ملتان میں اس نے نقب زنی کے ذریعہ کئی دکانوں سے مال چوری کیا۔ پاسپورٹ کے ذریعہ وہ دیگر ممالک جا کر بھی گھڑیوں کی دکانوں میں چوری کی واردات کرتا۔

ستمبر 1978ء میں، میں بطور انچارج تھانہ پیپلز کالونی تعینات تھا کہ ایک روز صبح سویرے فیصل آباد کی مشہور مارکیٹ ڈی گراؤنڈ کے تاجروں کا وفد میرے پاس آیا اور بتلایا کہ ڈی گراؤنڈ کی ایک الیکٹرانکس کی دکان میں رات کو چوری ہوگئی ہے اور چور دکان میں پڑی تمام اشیاء اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں ان کے ہمراہ موقع پر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دکان کے اندر بچھے ہوئے قالین کے علاوہ تمام اشیاء مجرماں دکان کے تالے توڑ کر اٹھا کر لے گئے ہیں۔ان اشیاء میں وی۔سی آر، ٹیپ ریکارڈر اور ڈیک وغیرہ شامل تھے۔

دُکان کے مالک کے بیان پر تھانہ پیپلز کالونی میں نقب زنی کا مقدمہ درج کیا۔ میرے لئے یہ واردات ایک چیلنج تھی۔ مقامی اور گردونواح کے چوراور نقب زن شامل تفتیش کئے لیکن کوئی سراغ نہ چلا۔ اسی دوران میں سے تمام مسروقہ سامان کی فہرست تیار کی جس میں ہر آئٹم کی کمپنی اور نمبر تحریر کیا اور فہرست کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں تیار کر کے اپنے ملازمین کے ذریعہ فیصل آباد، ملتان، کراچی، لاہور اور راولپنڈی کی الیکٹرانکس کی مارکیٹوں میں ہر دکان پر تقسیم کرائیں۔ فہرست میں اشیاء کی تفصیل کے علاوہ مقدمہ نمبر، کیسے اور کہاں سے چوری ہوئیں اور نیچے اپنا پتہ، ٹیلیفون نمبر تحریر کر کے اطلاع دینے والے کے لیے انعام مقرر کیا۔

چند یوم گزرے مجھے مال روڈ لاہور کے ایک دکاندار نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ چوری شدہ سامان کی جو فہرست آپ نے Circulate کی ہے اس کے متعلقہ ایک ٹیپ ریکارڈر ایک شخص فروخت کرنے کے لیے ان کی دکان پر کل لایا تھا۔ اس نے خریدا نہیں اور وہ شخص سامنے والی دکان پر فروخت کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد شام کو پھر وہ شخص گاڑی میں کچھ سامان لایا جو اسی دکان پر دے گیا۔ آپ فوری طور پر چیک کر لیں۔ دکاندار نے اس دکان کا نام بھی مجھے بتلایا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اس کا نام صیغہ راز میں رکھا جائے۔ چونکہ یہ ایک اہم واردات تھی انجمن تاجران اور اپنے سینئر افسران کا واردات کو ٹریس کرنے کے لیے کافی دباؤ تھا۔ میں یہ اطلاع سنتے ہی بہت خوش ہوا۔ ایس ایس پی کو اطلاع دے کر مدعی مقدمہ اور چار ملازمین ہمراہ لے کر فوری طور پر لاہور روانہ ہو گیا۔

گیارہ بجے دن لاہور پہنچے۔ ریگل چوک میں ایچ کریم بخش کی دکان کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور مقدمہ کے مدعی کو دکان کا ایڈریس دے کر ہال روڈ پر بھیجا اور اسے سمجھایا کہ متعلقہ دکان پر پہنچ کر ٹیپ ریکارڈر خریدنے کے بہانے اپنا سامان دیکھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد وہ خوشی خوشی واپس آیا۔ اس نے بتلایا کہ میں نے دکاندار کو ٹیپ ریکارڈر خریدنے کا کہا تو اس نے مختلف قسم کے ٹیپ ریکارڈر مجھے دکھائے۔ ان میں میرا ٹیپ ریکارڈر بھی تھا جو میں نے دکاندار سے خرید کر کے آدھی رقم ادا کر دی ہے اور آدھی رقم تھوڑی دیر کے بعد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میرا ٹیپ ریکارڈر دکان پر موجود ہے۔ میں نے ہال روڈ کے متعلقہ تھانہ گوجر سنگھ اطلاع دے کر ایک ہیڈ کانسٹیبل بلوالیا جس کو اور اپنے ملازمین کے ہمراہ لے کے دکان پر ریڈ کیا۔ متعلقہ ٹیپ ریکارڈر

قبضہ میں لے لیا جو مدعی نے درست طور پر شناخت کیا۔ رپورٹ ابتدائی میں اس کی تفصیل درج تھی۔ اب دکاندار سے بقایا مال کا مطالبہ کیا۔ اسی اثنا میں ہال روڈ کے انجمن تاجران کے صدر ملک عاشق اور ان کے ساتھی آ گئے۔ ابتدا میں تھوڑی سی تلخی ہوئی لیکن جب میں نے ان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ان کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ قانون کے احترام میں ہی عافیت ہے تو وہ مجھے اپنے یونین کے دفتر لے گئے۔ ملک عاشق فطرتاً ایک اچھا انسان تھا۔ اس کو میں نے سمجھایا کہ ہمارے چوری شدہ سامان کا اصل ٹیپ ریکارڈر دکان سے مل گیا ہے۔ اب ایک تو ہمیں بقایا مال دیں دوسرے مال بیچنے والے کے کوائف بتلائے جائیں۔ دکاندار اور یونین والوں نے علیحدہ میٹنگ کی۔ تھوڑی دیر بعد ملک عاشق نے کہا کہ وہ تمام سامان بھی دیتے ہیں اور سامان بیچنے والے کا نام و پتہ بھی بتلاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ جس دکان سے ٹیپ ریکارڈر برآمد ہوا ہے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ میں نے ان کی یہ شرط منظور کر لی۔ میں نے ملک عاشق صدر یونین کو کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ مجرمان پولیس کی اطلاع پا کر فرار نہ ہو جائیں، اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان کو قابو کیا جائے۔ انہوں نے بتلایا کہ اس نے پتہ کر لیا ہے جس شخص نے ان کو سامان فروخت کیا ہے اس کا نام ذوالقرنین عرف یوکا ہے اور وہ سوتر منڈی تھانہ لوہاری گیٹ کا رہائشی ہے۔ اس نے بقایا کچھ رقم ہمارے دکاندار سے لینی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ اپنے دکاندار سے کہیں کہ ذوالقرنین عرف یوکا کو رقم لینے کے لیے ٹیلیفون کر کے بلائیں۔ چنانچہ ذوالقرنین عرف یوکا کو ٹیلیفون کرایا تو اس نے کہا کہ وہ آٹھ بجے رات شیزان ہوٹل میں رقم لینے پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مقررہ وقت پر شیزان ہوٹل میں رقم لینے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی پلاننگ مکمل کر کے سفید کپڑوں میں اپنے جوان شیزان ہوٹل کے باہر لگا دیئے تھے۔ دکانداروں کے ایک آدمی نے اس کی طرف اشارہ کر کے شناخت کرا دی۔ جب وہ ہوٹل سے باہر نکلنے لگا تو اسے قابو کر لیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کئی دیگر مقدمات میں مجرم اشتہاری ہے اور عرصہ دراز سے مقامی پولیس اس کا پیچھا کر رہی ہے۔

دس بجے رات ملک عاشق نے ہمارا تمام سامان واپس دلوا دیا۔ ہم سامان اور ملزم لے کر واپس فیصل آباد پہنچ گئے۔

دوسرے روز جب ذوالقرنین عرف یوکا کے وارثان کو پتہ چلا تو انہوں نے میرے خلاف

عدالت عالیہ میں حبس بیجا کی رٹ دائر کر کے بیلف کو ملزم کی بازیابی کے لیے مامور کرالیا۔ میں نے تھانہ لوہاری سے اس خاندان کی مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں جہاں سے مجھے پتہ چلا کہ ذوالقرنین عرف یوکا تھانہ لوہاری گیٹ کا ہسٹری شیٹر ہے۔ اس کا باپ اسد اللہ خان بھی تھانہ لوہاری کا ہسٹری شیٹر اور دادا جھنڈے خان بھی اسی تھانہ کا ہسٹری شیٹر رہ چکا ہے۔

ذوالقرنین عرف یوکا کی دادی زینت بی بی کی طرف سے رٹ دائر کی گئی تھی۔ تمام خاندان جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے انتہائی ہوشیار اور چالاک ہے۔ ان کا خیال تھا کہ فیصل آباد پولیس کچھ دنوں کے بعد ضابطہ کے تحت گرفتاری ڈالے گی وہ فوراً اس کو پولیس کی حراست سے رہا کرا لیتے ہیں۔

عدالت عالیہ کے بیلف نے تھانہ پیپلز کالونی فیصل آباد میں چھاپہ مارا۔ ملزم ضابطہ کے تحت گرفتار ہو چکا تھا کیونکہ ہمیں یہ علم ہو چکا تھا کہ یہ خاندان عادی جرائم پیشہ ہے اور پولیس کے خلاف کوئی نہ کوئی کارروائی کریں گے۔ بیلف نے روزنامچہ میں رپورٹ درج کی اور دوسرے روز عدالت عالیہ میں پیش ہونے کی ہدایت کی۔

دوسرے روز جب میں عدالت عالیہ میں پہنچ کر معزز جج صاحب کے پیش ہوا تو اُن کے وکیل نے مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی اور مجھے ظالم اور سفاک پولیس افسر ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ساتھ ہی پر جوش لہجہ میں عدالت کو کہا کہ سر! وہ سامنے بڑھیا ضعیفہ بیٹھی ہے۔ یہ ملزم کی دادی ہے اور ساتھ ہی اسے اشارہ کیا کہ وہ اٹھ کر جج صاحب کے سامنے آئے۔ بڑھیا جھک کر لاٹھی کے سہارے جج صاحب کی طرف چلنے لگیں تو پھر وکیل صاحب نے جذباتی انداز میں کہا کہ سر جی دیکھیں اس عمر میں یہ بیچاری مظلومہ ذلیل ہو رہی ہے۔ معزز جج صاحب کے تیور بدلنے لگے اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمودار ہونے لگے تو میں فوراً بولا کہ سر جی مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں۔ سب سے پہلے میں نے مختصر مقدمہ کے حالات، مال کی برآمدگی اور ملزم کی گرفتاری وغیرہ کے متعلق بتلایا۔ پھر میں نے کہا کہ جناب عالی وکیل صاحب جو اس بڑھیا عورت کو بیچاری اور مظلومہ بیان کر رہے ہیں اس عورت کا خاوند جھنڈے خان تھانہ لوہاری گیٹ کا ہسٹری شیٹر ہے۔ اس بیچاری مظلومہ کا بیٹا اسد اللہ خان (ملزم کا والد) تھانہ لوہاری گیٹ کا ہسٹری شیٹر ہے اور اس بیچاری مظلومہ کا پوتا ذوالقرنین عرف یوکا اس تھانہ کا ہسٹری

شیٹر ہے۔ یہ سارا خاندان عادی جرائم پیشہ اور نسلی بدمعاش ہیں۔ جج صاحب نے حیران ہو کر ان کے وکیل کو مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ درست ہے۔ وکیل صاحب پہلے سے ذرا دھیمے لہجہ میں فرمانے لگے کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ میں نے عدالت سے کہا کہ ابھی تھانہ لوہاری گیٹ سے تصدیق کرائی جاسکتی ہے۔ تصدیق کرانے پر میری بات درست ثابت ہوئی اور عدالت نے ان کی رٹ خارج کر دی۔

میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل

بھٹو خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے عجیب حالات وواقعات سامنے آتے ہیں۔ کمال اور زوال کی داستان میں کئی اہم راز پنہاں ہیں۔

20 ستمبر 1996ء کو میر مرتضیٰ بھٹو قریب 9 بجے رات اپنے گھر 70 کلفٹن سے تھوڑے فاصلہ پر پولیس کی فائرنگ سے زخمی ہوئے جب کہ وہ سرجانی گاؤں ایک سیاسی جلسہ سے واپس 70 کلفٹن آرہے تھے۔ زخمی حالت میں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں وہ انتقال کر گئے۔

اس واقعہ کے متعلق ملک کی سطح پر ایک تفتیشی ٹیم تشکیل دی گئی جس میں پنجاب پولیس کی طرف سے میرا انتخاب ہوا۔ اس وقت میں بطور ایس پی سی آئی اے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ تین بجے دن مجھے ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع ملی کہ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب ذوالفقار علی قریشی کا حکم ہے کہ آپ فوری طور پر ان کی رہائش گاہ پر پہنچ جائیں۔ میں ان کی رہائش گاہ واقع جی۔او۔آر (I) پہنچا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے کہ آپ کو پنجاب پولیس کی طرف سے میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کی تفتیش کے لیے منتخب کیا گیا ہے، آج ہی ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی پہنچ جائیں۔ ٹکٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔ ائیر پورٹ پر ٹکٹ لے کر آدمی آپ کے انتظار میں ہوگا۔ میں سیدھا گھر پہنچا۔ کپڑوں کا بیگ لیا اور ائیر پورٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں انچارج چوکی پولیس ائیر پورٹ میری ٹکٹ او کے کرا کے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ٹکٹ میرے حوالے کی۔ شام کی فلائٹ پر میں کراچی پہنچا۔ ایک ڈی ایس پی مجھے لینے کے لئے ائیرپورٹ پر پہنچے ہوئے تھے۔ وہ مجھے سیدھا پولیس کلب لے گئے۔ دوسرے روز تک ٹیم کے دوسرے ممبران بھی آگئے جس میں آئی بی۔ آئی

ایس آئی اور ایف آئی اے کے افسران بھی شامل تھے۔ شام کو اطلاع ملی کہ کل 10 بجے دن جناب ممتاز علی بھٹو وزیراعلیٰ سندھ نے تفتیشی ٹیم کی میٹنگ بلائی ہے۔ یاد رہے کہ ان دنوں مقتول کی ہمشیرہ بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم تھیں۔ وفاقی وزیرداخلہ نصیر اللہ بابر اور کراچی کے ڈی آئی جی جناب ڈاکٹر محمد شعیب سڈل تھے۔ محمد شعیب سڈل ایک دراز قد، سمارٹ، خوبصورت وضعدار شخصیت اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک پولیس آفسر ہیں۔ وزیراعلیٰ سندھ نے تفتیشی ٹیم کے ساتھ میٹنگ کی جس میں، میں بھی شامل تھا۔ انہوں نے ٹیم کو مختصر سے خطاب میں کہا کہ آپ کی ٹیم سارے ملک سے منتخب کی گئی ہے۔ ہم صرف صحیح حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ واقعہ کیسے اور کیوں ہوا اور اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر ہم نے اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے ابتدائی رپورٹ اور فائل کا مطالعہ کیا۔ ایک خاص بات ہمارے سامنے یہ تھی کہ اس واقعہ کے متعلق تین ابتدائی رپورٹیں درج ہو چکی تھیں۔

پہلی رپورٹ ابتدائی مورخہ 20 ستمبر 1996ء کو حق نواز سیال انسپکٹر انچارج تھانہ کلفٹن کراچی ساؤتھ کے بیان پر درج ہوئی جس کا نمبر 382 جرم 353/427/186/147/148 تعزیرات پاکستان ہے جس میں تحریر ہے کہ آج وہ زیر نگرانی محمد طاہر درخشاں، شاہد حیات خان اے ایس پی صدر سب انسپکٹر شبیر احمد ایس ایچ او تھانہ گارڈن آغا مہد جمیل ایس ایچ او تھانہ نیپئر اس اطلاع پر کہ مشتبہ گان مطلوبہ 106/96 جرم 452/225/353/149/148/147 تعزیرات پاکستان تھانہ نیپئر کراچی جو کہ شہید بھٹو گروپ کے سربراہ میر مرتضیٰ بھٹو کے محافظ ہیں کی مختلف گاڑیوں میں 70 کلفٹن آمد متوقع ہے۔ سنیئر افسران کی اجازت سے ان کو شامل تفتیش کرنے کے لیے نیو کلفٹن گارڈن موجود تھا کہ وقت 9 بجے رات مشتبہ گان چار گاڑیوں پر متذکرہ جگہ پہنچے۔ حق نواز انسپکٹر نے ہمراہی پولیس کی مدد سے روکنے کا اشارہ کیا۔ ملزمان نے اپنی گرفتاری کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنے زیر استعمال گاڑیوں ڈبل کیبن، پجاور جیپ کے اندر اور باہر سے اسلحہ تان لیا۔ دوسرے نمبر پر پجارو کی فرنٹ پر موجود میر مرتضیٰ بھٹو صاحب نے اپنے مسلح محافظوں کو بلند آواز میں حکم دیا کہ ان پولیس کے کتوں کو مارو جس پر گاڑیوں میں موجود اسلحہ برداروں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ حق نواز انسپکٹر اور اے ایس پی صدر گولیاں لگنے سے زخمی ہو گئے۔ پولیس کی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ حفاظت خود اختیاری و ملازمان کی گرفتاری کے پیش نظر پولیس پارٹی نے

بھی جوابی فائرنگ کی جس سے مذکورہ گاڑیوں کے اندر اور باہر موجود ملازمان زخمی ہوئے۔

دوسری رپورٹ ابتدائی اس واقعہ کے متعلق مورخہ 24 ستمبر 1996ء کو اصغر علی ولد کریم بخش ساکن 70 کلفٹن کراچی نے مقدمہ 399 جرم 302/319/324 تھانہ کلفٹن کراچی ساؤتھ درج کروائی۔ جس میں انہوں نے بیان دیا کہ میں میر مرتضیٰ بھٹو کا ذاتی ملازم ہوں۔ مورخہ 20 ستمبر 1996ء بروز جمعہ 6 بجے شام میں میر صاحب کے ہمراہ ان کی پجارو میں 70 کلفٹن سے مسیحی برادری والوں کے پاس سرجانی ٹاؤن گئے۔ میر صاحب نے وہاں دفتر کا افتتاح کیا اور تقریر کی۔ اس کے بعد سندھیوں کے گاؤں گئے۔ وہاں سیاسی جلسہ کیا اور ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ اس کے بعد میر صاحب نے عاشق جتوئی، ڈاکٹر مظہر میمن، اسماعیل، آصف، اختر علی، محمود، غلام مصطفیٰ قیصر، رحمان بروہی، عبدالستار، یار محمد بلوچ، سجاد حید، وجاہت، جوکھیو، امیر بخش اور ابراہیم گبول کے ہمراہ گاڑیوں میں 70 کلفٹن کے لیے روانہ ہوئے۔ اس پجارو میں میر صاحب کے علاوہ عاشق جتوئی تھا جو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میر صاحب فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ یار محمد بلوچ پیچھے والی سیٹ میں اور آصف سامان والی جگہ پر بیٹھے تھے ایک پولیس موبائل ان کے ساتھ چلتی رہی۔ جب یہ دوتلوار والے چوک سے آگے کلفٹن گارڈن کراس کر رہے تھے تو پولیس ان کے سامنے آگئی اور انہیں روک لیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی ''کوئی فائر نہیں کرے گا''۔ دو منٹ بعد فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے سیٹ کے نیچے لیٹ گیا۔ دس منٹ بعد میر صاحب کو آواز دی۔ بابا آپ خیرت سے ہیں''؟ میر صاحب نے ''اوں'' میں جواب دیا۔ ''اوں'' کا جواب سن کر میں گھبرا گیا اور ان کی طرف دیکھا تو میر صاحب کے منہ سے خون بہ رہا تھا۔ اور عاشق جتوئی گاڑی کے سٹیرنگ پر گرا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا کہ ایمبولینس منگواؤ۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر کہا کہ خدا کے واسطے فائرنگ بند کردیں۔ اس دوران مجھے بھی گولی لگی اور زخمی ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ بعد بکتر بند گاڑی کی آواز سنی جو ہماری گاڑی کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ اور ایک آواز آئی کہ ادھر آؤ میر صاحب کو نکالنا ہے۔ پولیس میر صاحب کو گاڑی سے نکال رہی تھی کہ میں بھی گاڑی سے نکل آیا اور کہا کہ زخمی ہوں ہسپتال پہنچاؤ۔ مگر انہوں نے مجھے ساتھ نہیں لیا اور میری تلاشی لینی شروع کردی۔ میں نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر پولیس والوں نے کہا کہ تم نیچے لیٹ جاؤ اور پھر ایک طرف لے جا کر فٹ پاتھ پر دوسروں

کے ساتھ لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھوں پر کپڑا رکھ کر کلفٹن تھانہ لے گئے اور تھانہ کی لاک اپ میں بند کر دیا۔ پھر جناح ہسپتال لے گئے۔ علاج معالجہ کے بعد ہتھکڑی لگا دی۔ وہاں پتہ چلا کہ میر صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ عاشق جتوئی، وجاہت جوکھیو، یار محمد بلوچ، سجاد حیدر گاکھڑ، عبدالستار اور رحمان بروہی بھی مارے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر میمن اور اسماعیل بھی گولیوں سے زخمی ہیں۔ دو راتوں بعد پولیس کی حراست میں تھانہ کلفٹن آیا۔ یہاں پر غلام مصطفیٰ، محمود، آصف، وقار، قیصر اور اصغر علی بھی بند تھے۔ آج سنتری کے ذریعہ تھانیدار سے بات کی کہ اس کی طرف سے واقعہ کی رپورٹ درج کی جاوے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پولیس نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے فائرنگ کی اور میر صاحب اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا اور اسے اور دوسروں کو زخمی کر دیا۔

اِس واقعہ کے متعلق تیسری رپورٹ ابتدائی مورخہ 9 نومبر 1996ء کو مقدمہ 443 جرم 120/AB 324/302 تعزیرات پاکستان تھانہ کلفٹن ساؤتھ کراچی عدالت عالیہ کے حکم پر درج ہوا۔ اس طرح سے اس واقعہ کی تین ابتدائی رپورٹیں مرتب ہوئیں۔

تینوں رپورٹ ابتدائی اور فائل کا بغور مطالعہ کیا۔ میں نے اور مسٹر اختر علی جھانوری ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے نے موقع کا ملاحظہ کیا۔ اور مسز غنویٰ بھٹو بیوہ میر مرتضیٰ بھٹو سے 70 کلفٹن میں ملاقات کر کے ان کا موقف معلوم کیا۔ راؤ عبدالرشید سابقہ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب بھی وہاں موجود تھے۔ 70 کلفٹن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔

تمام حالات و واقعات کی تفصیلات کے بعد دو اہم نکات ہمارے سامنے تھے۔

الف۔ یہ واقعہ پولیس کے افسران کی Misplanning اور Mishandling کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کے ذمہ دار کون کون ہیں۔

ب۔ یہ واقعہ کسی پیشگی منصوبہ بندی اور سازش کا نتیجہ ہے جو پولیس کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔ یا پولیس کو لاعلمی میں کسی خفیہ ہاتھ نے استعمال کر لیا ہے۔

جہاں تک جز الف کا تعلق ہے حالات و واقعات اور چشم دید شہادت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ واقعہ پولیس افسران کی Misplanning اور Mishandling سے ہوا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے گن مینوں کی طرف سے فائرنگ کی ابتدا ہوئی ہے تو اس فائرنگ کی سنگینی اس حد تک نہیں تھی کہ جوابی فائرنگ میں ان پر گولیوں کی سیدھی بوچھاڑ کر دی

جائے۔ پولیس کی ٹریننگ اور نظم وضبط ہرگز اجازت نہیں دیتا بلکہ پولیس سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ ایسے حالات میں وہ اتنا بڑا غلط قدم اٹھائے۔

موقع پر اس اپریشن کی نگرانی براہ راست واجد درانی ایس ایس پی ساؤتھ کراچی کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپریشن پر مامور افسران کو صحیح طریقہ سے بریف نہیں کیا تھا اور جلد بازی میں ہی یہ سب کچھ ہو گیا۔ باقی افسران و ملازمان جنہوں نے موقع پر فائرنگ کی ایکسپرٹ کی رپورٹ کے مطابق جن جن کے اسلحہ سے فائرنگ کی گئی وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔

جہاں تک جزب کا تعلق ہے مسٹر مسعود شریف سابق ڈائریکٹر جنرل آئی بی اور مسٹر واجد درانی سابق ایس ایس پی ساؤتھ کراچی جو کہ مقدمہ 443/96 جرم 302 تعزیرات پاکستان میں گرفتار تھے سے انٹروگیشن کی گئی تھی اور بقایا پولیس افسران جن میں ڈاکٹر محمد شعیب سڈل سابق ڈی آئی جی کراچی بھی شامل ہیں کے بیانات حاصل کے گئے تھے انٹروگیشن بیانات اور تفتیش سے بظاہر کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے اس واقعہ میں کسی پولیس افسر کی ملی بھگت پائی جاوے۔

کچھ عرصہ قبل کراچی شہر کے حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ عام شہری کی صرف مال و جان ہی نہیں بلکہ عزت بھی محفوظ نہیں تھی۔ قتل و غارت، اغوا برائے تاوان، ڈکیتی، راہزنی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ اس سے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ حکومت کی مقتدر شخصیات نے فیصلہ کیا کہ جب تک کراچی پولیس کو Free Hand نہیں دیا جائے گا یہاں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کراچی پولیس کو فری ہینڈ دے دیا گیا۔

فری ہینڈ ملنے سے کراچی پولیس کو سابق وزیر داخلہ نصیر اللہ خان بابر، وزیر اعلیٰ سندھ سید عبد اللہ شاہ اور آصف علی زرداری کی آشیرباد حاصل ہو گئی۔ حتیٰ کہ سابق وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کی نیک خواہشات بھی پولیس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔

پولیس کو فری ہینڈ دینے سے بلاشبہ کئی خطرناک اور بدنام شر پسند عناصر جنہوں نے کراچی شہر کا امن تباہ کر رکھا تھا وقتاً فوقتاً پولیس کے ساتھ مقابلوں میں مارے گئے اور متعدد گرفتار بھی ہو گئے۔ اس سے کراچی شہر میں دن بدن امن کی فضا پیدا ہوتی گئی اور شہر میں کرائم کا گراف بھی کافی نیچے آ گیا جس سے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کا کریڈٹ ڈاکٹر محمد شعیب سڈل اور ان کی ٹیم کو جاتا

ہے۔

دوسری طرف پولیس کو فری ہینڈ دینے سے جہاں مثبت نتائج برآمد ہوئے وہاں ایک منفی پہلو یہ سامنے آیا کہ کراچی پولیس مقابلوں میں جوابی فائرنگ میں اپنی حدود سے نہ صرف تجاوز کرنے لگی بلکہ اپنے اصل اختیارات کو بھول گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے گن مینوں کی طرف سے 1/2 فائر کے جواب میں ان پر سیدھی گولیوں کی بوچھاڑ کردی گئی۔ اِس کے نتیجہ میں نہ صرف اتنا بھاری جانی نقصان ہوا بلکہ حکومت کو شدید اور ناقابل تلافی دھچکا لگا جس کے اثرات انتہائی خطرناک ثابت ہوئے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کے گن مینوں نے 3/4 مواقع پر رینجرز اور پولیس کے روکنے پر رائفلیں کاک کر کے سیدھی کرلیں جس سے رینجرز اور پولیس پیچھے ہٹ جاتی۔ اس سے گن مینوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے جس سے پولیس کے افسران و ملازمین پر نفسیاتی دباؤ بڑھ چکا تھا۔ اور اس بات کا ان کو یقین تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے گن مین روکنے پر پولیس پر فائرنگ کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس لئے انہوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کے گن مینوں کی طرف سے 1/2 فائر کرنے پر ان پر گولیاں برسادیں۔ عام طور پر ناتجربہ کار اور بزدل لوگ خوف زدہ ہوکر ایسا کر گزرتے ہیں۔

موقع پر موجود افسران و ملازمین پر اپنے سینئر افسران کی طرف سے دباؤ تھا کہ گن مینوں کو روک کر چیک کرنا ہے جب کہ ان افسران کی خواہش نہیں تھی لیکن اپنے سینئر افسران کے خوف سے بادل نخواستہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ایسے حالات میں انسان پر اعتماد ہوکر اپنا کام صحیح طور پر نہیں کرپاتا۔

دونوں اے ایس پی صاحبان راؤ طاہر اور شاہد حیات کی سروس بہت کم تھی اور تجربہ بہت کم تھا۔ ان کے ساتھ جو فورس تھی ان میں اکثریت نئے نوجوانوں کی تھی جو تھوڑا عرصہ ہوا ٹریننگ کر کے واپس آئے تھے اور ان کو عملی زندگی میں کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ان سب کو SMG رائفل سے لیس کردیا گیا تھا۔ انہوں نے 1/2 فائر ہونے پر درختوں کے ساتھ پوزیشنیں لے لیں اور سیدھی گولیاں میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی گاڑیوں پر مارنی شروع کردیں۔

تجربہ کار افسر حالات کے مطابق "Situation" کو کنٹرول کرلیتے ہیں۔ ایسے حالات میں صبر، حوصلہ اور بردباری سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اے ایس پی اور ایس ایچ او کلفٹن

زخمی ہو بھی گئے تھے تو پولیس کو حوصلہ اور بردباری سے کام لے کر ضرورت کے مطابق کارروائی کرنی چاہیے تھی۔

واجد علی درانی ایس ایس پی ساؤتھ کراچی جو اس آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے کو اچھی طرح علم تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو نہ صرف پرائم منسٹر کا بھائی ہے بلکہ وہ خود ایم پی اے ہے اور ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ بھی ہے۔ اس کی موجودگی میں اگر اس کے گن مینوں کو روک کر چیک کیا گیا تو وہ ضرور مداخلت کرے گا جس کے نتائج خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا نہ ہی جگہ کا تعین درست کیا گیا تھا اور نہ ہی آپریشن کا وقت مناسب تھا۔ انہوں نے جلد بازی میں ناتجربہ کار افسران کی ڈیوٹی لگا کر اور مناسب طریقہ سے بریفنگ اور پلاننگ نہ کر کے نہ صرف اپنے آپ کو رسوا کیا ہے بلکہ اس سے تمام پولیس فورس بدنام ہوئی ہے۔ اور اس واقعہ نے ملک کی سیاست پر گہرے اور ان مٹ منفی اثرات چھوڑے ہیں۔

ان تمام زیر بحث حالات و واقعات کی روشنی میں پایا گیا کہ ڈیوٹی پر موجود پولیس ارادتاً یا دانستہ طور پر اس واقعہ میں ملوث نہیں ہے۔ البتہ یہ واقعہ پولیس افسران کی Misplaning اور Mishandling اور حفاظت خود اختیاری کی حدود سے سراسر تجاوز کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک حق نواز سیال انسپکٹر انچارج تھانہ کلفٹن کی موت کا تعلق ہے وہ بلاشبہ خودکشی ہے۔

ہاں البتہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ پہلے سے ہی کسی خفیہ ہاتھ نے پولیس کے کسی ملازم کو Hire کر رکھا ہو اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہو۔ تفتیش کے دوران ایک بات یہ بھی سامنے آئی تھی کہ مسٹر مرتضیٰ بھٹو کو آصف علی زرداری سے سخت نفرت تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے واش روم میں آصف علی زرداری کا پورٹریٹ لگایا ہوا تھا۔

والدہ کا انتقال

2000ء میں، میں بطور ایس ایس پی ڈیرہ غازی خان تعینات تھا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ جو میرے ساتھ پیش آیا یہ تھا کہ میری پیاری ماں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ میری ماں میرے پاس ڈیرہ غازی خان رہ رہی تھیں۔ ان کے زیر سایہ میرا وقت پُرسکون گزر رہا تھا۔

8 مارچ 2000ء کو میری والدہ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمانے لگیں کہ ''پتر زندگی دا کوئی

پتہ نہیں۔ مرن حق دا راہ اے۔ میرا خیال اے کہ میں عید قربانی اپنے چک وچ کراں جتھے دوجے پتر، دھیاں تے بھین بھراواں نوں وی مل لواں“۔ یاد رہے کہ 18 مارچ کو عید قربانی تھی۔ میں نے کہا اماں جی میرا دل تو نہیں چاہتا کہ آپ گاؤں چلی جائیں لیکن آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے جیسے آپ حکم کریں۔ چنانچہ 13 مارچ بروز اتوار اماں جی کو ان کی خواہش پر اپنے گاؤں چک نمبر 152 شمالی ضلع سرگودھا پہنچایا گیا۔ مورخہ 28 مارچ کو مجھے ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع ملی کہ اماں جی کی طبیعت ناساز ہے۔ میں رخصت لے کر 29 مارچ کو ساڑھے چھ بجے صبح گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ دو بجے دن گاؤں پہنچا۔ اماں جی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں میں نے اماں جی کو سلام کیا انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے پیار کیا اور میرا ماتھا چُوما۔ دوسرے دن اماں جی کی طبیعت سنبھل گئی۔ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور مجھے کہا کہ ”پتر ہن میں بالکل ٹھیک آں“۔ میں نے اماں جی سے اجازت لی اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں سلانوالی سے کچھ دوائیاں لے کر بھجوا دیں اور تین بجے دن لاہور پہنچ گیا۔ محمد اشرف بڑا بیٹا بھی ہمراہ تھا۔

یکم اپریل کو چار بجے شام لاہور سے ڈیرہ غازی خان کے لیے اپنی اہلیہ اور بیٹی مریم کے ہمراہ روانہ ہو کر ڈیڑھ بجے رات ڈیرہ غازی خان پہنچ گئے۔ اسی رات ساڑھے چھ بجے صبح میرے بیٹے محمد اشرف نے فون پر اطلاع دی کہ دادی اماں اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں ”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“۔ مجھے ماں کے انتقال کی خبر سن کر شدید صدمہ ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اب دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ ٹیلیفون بند کیا تو میری اہلیہ نے پوچھا کہ خیریت تو ہے۔ میں نے اس کو والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ ہم فوری طور پر تیار ہو کر گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ دو بجے دن گاؤں پہنچ گئے۔ محترمہ والدہ مرحومہ کی زیارت کی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سکون سے سو رہی ہیں اور ابھی نیند سے اٹھ کر میرا ماتھا چوم لیں گی۔ میں نے اماں جی کو آواز دی جواب نہ ملا پھر آواز دی پھر کوئی جواب نہ ملا۔ جواب کیسے ملتا اتنی باہمت، بلند حوصلہ اور مضبوط اعصاب والی ماں موت کے آگے بے بس ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی بسم اللہ کہنے والی اور ہر سانس پر دُعائیں دینے والی ماں شاید بے خبر تھی کہ ان کا بیٹا ڈیرہ غازی خان سے گاؤں پہنچ چکا ہے۔ دُعاؤں کا منبع ختم ہو گیا۔ میں غم سے نڈھال ہو چکا تھا لیکن ”ان اللہ مع الصابرین“ اور ”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“ بار بار پڑھ کر اپنے آپ کو تسلی اور سہارا دیتا رہا۔

عزیز و اقارب دوست احباب اطلاع پا کر پہنچ گئے لاہور سے میرے بیٹے محمد اشرف، شاہد

احمد، عمران احمد بمعہ اپنی بہنوں اور بیوی بچوں کے بھی پہنچ چکے تھے۔ بعد نماز عصر نماز جنازہ پڑھی گئی اور مغرب کی نماز سے کچھ دیر قبل پیاری ماں کو سپرد خاک کیا۔ عجب سماں تھا۔ ادھر سورج غروب ہو رہا تھا اور ادھر میری ماں کی مرقد پر مٹی ڈالی جا رہی تھی۔ تجہیز و تکفین کا کام مکمل ہو گیا۔

اللہ کی رضا کے سامنے بے بس بیٹے اپنی ماں کو اللہ کے حوالہ کر کے واپس اپنے گھر لوٹے مہمانوں کو کھانا کھلایا۔ تمام عزیز و اقارب اور احباب کے ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا اور ان کی شفقتوں کو یاد کر رہا تھا۔ اب گھر میں میرا اور میرے ٹیلیفون کا انتظار کون کرے گا۔ قدم قدم پر دُعائیں کون دے گا۔ میری ماں اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

مرقد پہ تیری ہو رحمت کا نزول
ساتھی ہو تیرا خدا اور اس کا رسول

تمام عمر میری یہ خواہش رہی کہ میری ماں زیادہ عرصہ میرے پاس رہیں تاکہ مجھے اُن کی خدمت کا موقع ملتا رہے۔ میری ماں صوم و صلوٰۃ کی پابند، انتہائی نیک خاتون تھیں۔ ان کی عمر نوے برس تھی۔ بغیر کسی سہارے کے چل پھر سکتی تھیں۔ نماز پنجگانہ خود وضو کر کے ادا کرتیں۔ اکثر میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے بیدار کر دیتیں۔ ماں الفت، پیار، ایثار، قربانی اور نصرت و کامرانی کا مرقع ہے۔ ماں دعاؤں کا منبع ہے۔ ماں ایک ایسا پھول ہے جس کی خوشبو سارے گھر کو معطر کر دیتی ہے۔ ماں ایک انمول ہیرا اور نایاب تحفہ ہے۔ ماں ایک ایسی ہستی ہے جو تمام بلاؤں اور آفات کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ماں ایک ایسا استاد ہے جس کی تعلیم و تربیت سے انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ماں پیر بھی ہے اور مرشد بھی۔ ماں کائنات میں ایک ایسی ہستی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ماں وہ شفیق ہستی ہے جس کے پاؤں تلے جنت ہے۔ ماں ایک ایسا درخت ہے جس کی چھاؤں تلے ٹھنڈک اور راحت ملتی ہے۔ ماں ایک ایسا محور ہے جس کے گرد سارا خاندان گھومتا ہے۔ نظام ہستی میں ماں کا مقام اعلیٰ و ارفع ہے۔ ماں دنیا میں سب سے مہنگی اور قیمتی چیز ہے۔ ماں ہر شخص کو دُنیا میں صرف ایک بار ملتی ہے۔ ماں دنیا سے رخصت ہو جائے تو دوسری دفعہ کسی صورت میں نہیں مل سکتی۔ ماں الفت، پیار، محبت، شفقت، ایثار و قربانی کی عظمتوں کا پیکر ہے۔ ماں کا دل اولاد کے لیے پیار و محبت کا سب سے بڑا مسکن ہے۔ ماں ایک ایسی ہستی

ہے جس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی دُعاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ماں مرنے کے بعد بھی اولاد سے اپنا رشتہ قائم رکھتی ہے۔

اخبار ''روزنامہ خبریں'' مورخہ 19 اپریل 2000ء کے سنڈے میگزین میں ''ممتا کا کرشمہ'' کے عنوان سے اے ایم انصاری دامان روڈ شکر گڑھ نارووال نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو ملاحظہ فرمائیں۔

''میری والدہ محترمہ کو فوت ہوئے ایک طویل مدت بیت گئی ہے۔ والد محترم میرے بچپن میں ہی رحلت فرما گئے تھے۔ میں سکول میں لائق اور ذہین طالب علم تھا۔ ان ہی دنوں مجھے ضعف دماغ اور دائمی دردسر کا مرض لگ گیا۔ والدین کی موت کا غم اس پر سر درد کی تکلیف میں نے مجبوراً سکول چھوڑ دیا۔ میرا ہینڈ رائٹنگ بہت اچھا تھا سو خطاطی میرا ذریعہ معاش بن گیا۔ میں نے ابھی تک شادی نہ کی تھی تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ ایک رات اچانک میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا اور شدت درد سے میں بُری طرف تڑپنے لگا۔ باہر موسم خراب تھا بارش اور اندھیرا تھا اور جسم کو سن کر دینے والی یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسی خراب موسم میں ڈاکٹر کو کون بلاتا۔ میں نے بڑی ہمت سے ایک دوبار اُٹھ کر ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں آخری سانس لیتا ہوا قریب المرگ تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ہمارے شہر کے مشہور ڈاکٹر صاحب اپنا بیگ اٹھائے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے چیک کیا۔ دوا دی اور ٹیکہ لگایا۔ چند ہی لمحوں میں میں نے کافی افاقہ محسوس کیا۔ ہوش درست ہونے پر میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ آپ کو میری بیماری کی اطلاع کس نے دی۔'' یہ بزرگ خاتون غالباً آپ کی والدہ صاحبہ تھیں جو میرے کلینک پر مجھے بلانے گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میرا بیٹا شدید تکلیف میں ہے اس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔ جلدی سے میرے ساتھ چلو اور مجھے اپنے ساتھ یہاں لائی ہیں۔ اور اب کہاں ہیں؟ میں نے جلدی سے بڑے تجسس اور حیرانی سے پوچھا۔

ابھی چند منٹ پہلے تو یہ بزرگ خاتون یہاں برآمدے میں کھڑی تھیں معلوم نہیں اب کہاں غائب ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر نے خود بھی حیران اور پریشان ہو کر برآمدے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ حیران ہو کر ڈاکٹر صاحب پھر کمرے کے اندر آ گئے۔ اندر آ کر ان کی نظر اچانک میری الماری پر رکھے

فریم پر پڑ گئی۔ "یہ ہیں وہ بزرگ خاتون جو مجھے میرے کلینک پر ابھی آپ کی بیماری کی اطلاع دینے گئی تھیں اور اپنے ساتھ مجھے یہاں آپ کے گھر لائی ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے فریم میں تصویر کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے حیرانی اور تجسس سے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر صاحب یہ تو میری والدہ مرحومہ ہیں جنہیں فوت ہوئے کئی سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر صاحب تو اس عجیب اور پراسرار بات پر حیران ہوئے اپنا بیگ لے کر چلے گئے اور میں والدہ مرحومہ کی تصویر کو سامنے رکھے کتنی ہی دیر تک پیار و محبت اور عقیدت سے دیکھتا ہوا سوچتا رہا کہ یہ یقیناً میری مرحومہ والدہ کی روح تھی جو اس مصیبت کے وقت ممتا کے لافانی جذبے کے تحت روحانی طاقت سے اپنی اولاد سے رشتہ قائم رکھتی ہے اور مر کر بھی اولاد کے لیے حفاظت اور تحفظ کا حصار بنی رہتی ہے"۔

انسان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی باقی جاندار مخلوق حیوانات چرند، پرند اور درندوں میں ہر ایک ماں اپنے بچوں سے اسی انداز میں پیار کرتی ہے جیسے انسان۔ آپ گھونسلے میں چڑیا کے بچے کو چھیڑ کر دیکھیں تو یہ نحیف اور کمزور پرندہ کس طرح چیخ و پکار کرتا ہے۔ کوے کے بچے کو چھیڑیں تو وہ کائیں کائیں کر کے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی تمام جاندار مخلوق میں ماں کا کردار انتہائی اہم ہے۔

مڈل کلاس سلانوالی سے پاس کرنے کے بعد جب نویں کلاس میں داخل ہونے کے لیے داخلہ فیس مانگی تو والد صاحب فرمانے لگے کہ آٹھ جماعتیں کافی ہیں۔ مالیہ کی پرچی دیکھنے کے قابل ہو گئے ہو مزید تعلیم کے لیے وہ خرچہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس زمانہ میں گاؤں میں جو شخص مالیہ کی پرچی پڑھ لیتا تھا اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگ خط پڑھانے کے لیے پڑھے لکھے شخص کی تلاش میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا کر خط پڑھاتے تھے۔ میں نے ماں جی کو کہا کہ میں آئندہ تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں آپ والد صاحب سے کہیں کہ وہ مجھے داخلہ فیس کے لیے پیسے دیں۔

قارئین کرام! میں اپنی ماں کے ان جذبات کا اظہار کن الفاظ میں بیان کروں جو اس وقت میں نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھے۔ اللہ اللہ ماں بھی کیا ہستی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اولاد کے لیے کس قدر تڑپ پیدا کر دی ہے۔ بالآخر اماں جی نے والد صاحب کو رضامند

کرلیا۔ والد صاحب نے فیس کی رقم 5 روپے نو آنے میرے حوالہ کی اور ساتھ ہی ازراہ تمسخر فرمانے لگے کہ دیکھتے ہیں تم پڑھ کر کیسے مچھریٹ (مجسٹریٹ) بن جاتے ہو۔

میں نے چک 34 جنوبی ہائی سکول میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا اور اس طرح تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ فیس کی ادائیگی میں مشکلات پیش آتی رہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور پیاری ماں کی دُعاؤں سے سلسلہ چلتا رہا۔ وہ پیسہ پیسہ بچا کر ایک مٹی کے برتن (ڈولی) میں رکھتی رہتیں جب والد صاحب کے پاس پیسے نہ ہوتے تو والدہ صاحبہ سہارا بن جاتیں۔ میں نے بچت کرنے کی عادت اپنی ماں سے ہی سیکھی ہے۔

ایف اے تک گورنمنٹ کالج سرگودھا سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ملازمت تلاش کی۔ پولیس میں بھرتی ہو کر انتہائی چھوٹے عہدہ یعنی کانسٹیبل سے ملازمت کا آغاز ہوا لیکن اس پر بھی میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اماں جی کہتیں ''پتر وڈیاں عہدیاں وچہ کجھ نہیں پیا بندے نوں بندہ ٹھیک ہونا چاہی دا اے''۔ اماں جی کے ان الفاظ سے میری ڈھارس بندھ جاتی۔ ویسے بھی میری سوچ کے مطابق عزت بڑے عہدوں میں نہیں بلکہ اچھی انسانیت میں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک ایک بااصول اور باکردار کانسٹیبل ایک بے اصول اور بدکردار ایس پی سے بدرجہا بہتر ہے۔

1973ء میں میرے والدین حج پر گئے ۔ جب وہ حج سے واپس آئے تو میں سوبھاگہ ریلوے سٹیشن پر باقی عزیزوں کے ساتھ اُن کے استقبال کے لئے پہنچا۔ والدین ٹرین سے اترے تو ایسے لگا جیسے جنت کی ہواؤں نے اِدھر کا رُخ کرلیا ہے۔ اماں جی سے ملا جنہوں نے ماتھا چوما پھر والد صاحب نے دستِ شفقت سر پر پھیرا۔ اس وقت ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام کائنات کی خوشیاں سمٹ کر یہاں آگئی ہیں۔

سروس کے دوران مجھے اکثر حسرت رہتی کہ اماں جی کچھ وقت میرے پاس گزاریں تاکہ ان کی خدمت کا موقع ملے لیکن گاؤں کے ماحول سے وہ بہت زیادہ مانوس تھیں۔ ویسے بھی باقی بیٹے بیٹیاں، بھائی بہن اور دوسرے عزیز واقارب گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ اپنی بڑی بیٹی سے انہیں جنون کی حد تک محبت تھی جو اماں جی کے پاس ہی رہتی تھی۔ اماں جی کو میں اپنے پاس لے آتا لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ گاؤں جانے کی خواہش کرتیں۔ میں اُن کو خوش رکھنا چاہتا تھا چنانچہ ان کی

خواہش پر عمل کر کے انہیں گاؤں بھیج دیتا۔ گاؤں جاتے ہوئے مجھے حکم دے جاتیں کہ روزانہ شام کو ٹیلیفون کرنا ہے۔ میں اُن کے حکم کی تعمیل کرتا۔ جب کبھی مصروفیت کی وجہ سے ٹیلیفون نہ کر پاتا تو دوسرے روز باقاعدہ جواب طلبی ہوتی کہ ٹیلیفون کیوں نہیں کیا تھا۔ ماں ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو اولاد کے لئے بے تاب رہتی ہے۔ اولاد کو بھی ہر دُکھ اور مصیبت میں ماں ہی یاد آتی ہے کیونکہ یہ ایسا رشتہ ہے جو انسان کے تمام دُکھوں کا مداوا بنتا ہے۔

لاہور میں تعیناتی کے دوران میں اماں جی کو گاؤں سے لاہور اپنے پاس لے آتا اور چھٹی والے دِن تاریخی مقامات، چڑیا گھر، شاہی قلعہ، شاہی مسجد اور مختلف پارکوں کی سیر کراتا۔ فورٹریس سٹیڈیم میں بڑا جھولا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتیں۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ساری کائنات میرے ساتھ ہے۔

ایک دفعہ جبکہ میں لاہور ہی میں تعینات تھا، گرمیوں کا موسم تھا۔ فلیٹ نمبر 6، سول لائنز میں رہائش تھی۔ اماں جی کہنے لگیں ''پترا ایہہ دَس کہ وڈے لوک مری کیوں جاندے نیں؟'' میں نے بتلایا کہ مری کا پہاڑ کافی اونچا ہے۔ اس کی چوٹی پر مری شہر آباد ہے۔ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے وہاں ٹھنڈ رہتی ہے اور لوگ گرمیوں میں اس ٹھنڈے علاقہ میں چلے جاتے ہیں۔ ''نہیں پترا ایہہ کس طرح؟ اُچا علاقہ تاں دیہوں دے زیادہ نیڑے ہوندا اے او تھے تاں زیادہ گرمی ہونی چاہی دی اے'' اماں جی نے کہا۔ میں نے جواباً بتلایا کہ جتنا اوپر چلے جائیں اتنی ٹھنڈ زیادہ ہوتی جائے گی۔ ''اچھا پتر اللہ دیاں اللہ ہی جانے'' ماں جی نے کہا۔ میں نے اماں جی سے پوچھا کہ آپ مری دیکھنا چاہتی ہیں۔ جس پر اماں جی خوشگوار موڈ میں فرمانے لگیں ''پُتر زندگی دا کوئی پتہ نہیں ہے۔ مری دی سیر کرادیو تاں میں وی پنڈ وچ جاکے آکھساں کہ میرے پُتر مینوں مری دی سیر کرائی اے۔'' میں نے دوسرے روز سات یوم کی رخصت لے لی۔ اماں جی اور بیوی بچوں کو ہمراہ لے کر مری چلا گیا۔ وہاں مری کی سیر کرائی۔ پھر پتریاٹہ چلے گئے اور جھولوں کا نظارہ کیا۔ تین دن سیر کرنے کے بعد واپس لاہور آ گئے۔

اماں جی جب لاہور آتیں تو اکثر حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف کی زیارت کی فرمائش کرتیں۔ اُن کو مزار شریف کی زیارت کرائی جاتی جہاں نفل وغیرہ پڑھ کر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتیں۔

ماں ایک نظر سے اپنی اولاد کے اندر جھانک کر دیکھ لیتی ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ ''موہن نامی ایک شخص کو اپنی ماں سے بہت پیار تھا اور وہ بھی ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ایک دِن اپنی ماں سے کہا ماں جی میں نے دنیا کے تمام علوم کی ڈگریاں حاصل کر لی ہیں۔ جس عالم اور سکالر کے ساتھ علم کا مناظرہ کرتا ہوں جیت جاتا ہوں۔ ماں نے کہا بیٹا اور علم حاصل کرو۔ کچھ دن بعد موہن پھر اپنی ماں کو وہی بات کہنے لگا۔ ماں نے پھر کہا نہیں بیٹا اور علم حاصل کرو۔ تیسری مرتبہ جب ماں کو پھر وہی الفاظ کہے تو ماں نے کہا اچھا بیٹے اگر تمہیں اپنے علم پر ناز ہے تو ایسا کرو کہ فلاں گاؤں کے راستے میں ایک جھونپڑی میں فقیر رہتا ہے جس کا نام میاں کبیر ہے۔ اس کے ساتھ جا کر مناظرہ کرو۔ اگر تم اس فقیر سے جیت گئے تو پھر میں مان لوں گی کہ تم نے تمام علوم پر عبور حاصل کر لیا ہے۔

موہن سیدھا جھونپڑی میں فقیر کے پاس پہنچا اور اُسے مناظرہ کی دعوت دی۔ فقیر میاں کبیر نے اُسے کہا کہ بھئی مناظرے کی کوئی ضرورت نہیں، تم جیت گئے اور میں ہار گیا۔ موہن کہنے لگا کہ مجھے لکھ کر دیں تاکہ اپنی ماں کو دکھا سکوں۔ میاں کبیر نے اُسے لکھ کر دیا کہ ''موہن جیتا کبیر ہارا''۔ وہ یہ تحریر لے کر خوشی خوشی سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور اُنہیں تحریر دکھائی۔ ماں نے کہا کہ بیٹا مجھے پڑھ کر سناؤ۔ جب موہن نے تحریر پڑھی تو اس پر لکھا تھا موہن ہارا کبیر جیتا۔ ماں نے کہا پھر تو تم ہار گئے ہو۔ ''نہیں ماں لکھنے میں غلطی لگ گئی ہو گی'' موہن بولا اور وہ پھر دوڑا دوڑا سیدھا میاں کبیر کے پاس گیا اور کہا کہ جناب لکھنے میں غلطی لگ گئی ہے اس کو درست کر دیں۔ میاں کبیر نے کہا کہ کیا غلطی ہو گئی ہے پڑھ کر سناؤ۔ موہن نے تحریر پڑھی تو اس پر لکھا تھا کہ موہن جیتا کبیر ہارا۔ موہن دوڑتا ہوا پھر ماں کے پاس آیا۔ ماں کے کہنے پر پھر تحریر پڑھی تو اس پر پھر یہ لکھا تھا کہ موہن ہارا کبیر جیتا۔ تیسری مرتبہ جب پھر اسی طرح ہوا تو موہن اپنی ماں کے قدموں پر گر پڑا۔ ماں نے کہا جاؤ بیٹا میاں کبیر کے سامنے ہار تسلیم کر کے معافی مانگو۔ چنانچہ موہن جا کر میاں کبیر کے قدموں پر گر پڑا اور کہا کہ اسے اب پتہ چلا ہے کہ اصل علم تو صرف اللہ کے بندوں کے پاس ہوتا ہے۔''

ماں کا پیار سمندر کی مانند ہے جو ہر وقت جوش میں رہتا ہے۔ اگر جنت کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس میں دودھ کی نہریں ہیں تو پھر ماں اپنے بچے کے لئے جنت ہے۔ جو لوگ ماؤں کے نافرمان ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ کے بھی نافرمان ہو جاتے ہیں۔

میری ماں کی زندگی میں ایک غیبی طاقت میرا ساتھ دیتی رہی اور زندگی کے ہر موڑ پر میری راہنمائی کرتی رہی۔ مشکل سے مشکل وقت، سخت سے سخت ڈیوٹی اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمات کی تفتیشوں میں اس غیبی طاقت نے ہر لمحہ میری اِمداد کرتے ہوئے مجھے درست سمت پر چلایا اور ایسا راستہ دکھایا جاتا جو کامیابی کی طرف جاتا۔ میرا ایمان اور پختہ یقین ہے کہ وہ غیبی طاقت جو میری راہنمائی کر کے درست سمت پر چلاتی رہی وہ میری پیاری ماں کی دعائیں تھیں۔

یہ کامیابیاں یہ عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے وہ مقام تم سے ہے
کہاں بساط جہاں اور میں کمیں ناداں
یہ میری جیت کا سارا اہتمام تم سے ہے

ضمیر جعفری مرحوم کا شعر ہے

یہ نعمتیں یہ راحتیں یہ عزتیں یہ شہرتیں
دنیا میں جو کچھ بھی ملا تیری دعاؤں سے ملا

اسلامی قومی اتحاد

میں نے اپنی چالیس سالہ سروس کے دوران کئی سیاسی، مذہبی، طلباء اور مزدوروں کی تنظیموں کے احتجاجی جلوس اور تحریکیں دیکھی ہیں جن میں امن وامان قائم رکھنے کیلئے ڈیوٹی بھی دیتا رہا ہوں، لیکن جتنی پرجوش اور منظم تحریک 1977ء میں قومی اتحاد (نوستارے) کی ذوالفقار علی بھٹو، جو اس وقت ملک کے سربراہ تھے، کے خلاف تھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ روزانہ ہر شہر میں بڑے بڑے جلوس نکلتے اور گرفتاریاں پیش کی جاتی تھیں۔ یہ تحریک گزشتہ الیکشن میں دھاندلی کے خلاف تھی۔

ان دنوں میں بطور انسپکٹر انچارج تھانہ گلبرگ فیصل آباد میں تعینات تھا۔ تھانہ کی عمارت غلام محمد آباد موڑ قبرستان کے سامنے گلشن کالونی میں شفٹ کر لی تھی۔ اس سے پہلے گلشن کالونی کے اندر ملک اللہ دتہ کی کوٹھی میں تھانہ تھا۔

ہمارے علاقہ مجسٹریٹ عزیز احمد خان جو انتہائی اچھے انسان تھے اور میں دونوں اکٹھے اپنی فورس کے ہمراہ ڈیوٹی دیتے تھے روزانہ صبح سویرے نڑ والا چوک نزد دھوبی گھاٹ پہنچ جاتے اور

جلوسوں میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے اپنے فرائض سرانجام دیتے۔ گرفتاریوں' لاٹھی چارج اور ٹیئر گیس کے استعمال کے باوجود دن بدن تحریک زور پکڑتی گئی۔ نعرۂ تکبیر پر دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کا مجمع جمع ہو جاتا اور اللہ اکبر کی آوازیں فضا میں گونجنے لگتیں۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی غیبی طاقت ان کا ساتھ دے رہی ہے۔

ایک روز میں اور عزیز احمد خان مجسٹریٹ بمعہ اپنی فورس کے نڑوالا چوک میں موجود تھے۔ ملک امجد مجسٹریٹ نے وائرلیس پر کنٹرول کو اطلاع دی کہ ایک بہت بڑے جلوس نے اُس کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ وہ گھنٹہ گھر کے مینار کے ساتھ چھپ کر کھڑا ہے لوگ اس کی طرف روڑے پھینک رہے ہیں۔ پولیس فورس پیچھے چلی گئی ہے فوراً فورس بھجوائی جاوے۔ میں نے یہ پیغام وائرلیس پر سُن کر کنٹرول کو کہا کہ جناب امیر صاحب (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) اور جہانگیر صاحب (ایس ایس پی) کو کہیں کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں اور مجسٹریٹ صاحب اپنی فورس لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ہمیں وائرلیس کے ذریعہ وہاں پہنچنے کی اجازت مل گئی۔ ہم نے اپنی فورس کے ہمراہ بھوانہ بازار سے گزر کر جلوس جو گھنٹہ گھر کی طرف پتھراؤ کر رہا تھا، کو وارننگ دے کر پیچھے سے لاٹھی چارج شروع کر دیا اور ساتھ ہی ٹیئر گیس کی شیلنگ کی۔ لوگوں نے ہم پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ میری چھاتی پر بھی دو روڑے لگے لیکن ہم جلوس کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ملک امجد مجسٹریٹ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اُن کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ کہنے لگے کہ اگر آج آپ وقت پر نہ پہنچتے تو میری جان خطرے میں تھی۔

ایک روز ایک بہت بڑا جلوس تھانہ گلبرگ کے سامنے موڑ قبرستان پر پہنچا۔ جلوس کے شرکاء میں سے کسی شرپسند نے پولیس کے ٹرک پر خود ساختہ بم پھینکا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے ملازمین میں سے ایک ملازم کے پیٹ کے نیچے نازک حصہ پر لگا جس سے وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کو پک اَپ میں ڈال کر فوراً ہسپتال بھجوایا گیا۔ ملازمین نے اشتعال میں آ کر شرکائے جلوس پر لاٹھی چارج شروع کر دیا جس میں کچھ شریف لوگ مولانا محمد اشرف لیبارٹری والے اور مولانا فضل کریم اور فضل عظیم وغیرہ شامل تھے زخمی ہو گئے جن کو بھی ہسپتال بھجوایا گیا۔ یاد رہے کہ عام طور پر ایسے جلوسوں میں شریف لوگوں کو ہی مار پڑتی ہے کیونکہ شرپسند تو شرارت کر کے فوراً پیچھے کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور شریف لوگ جو خود اعتمادی کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں اُن کو مار پڑ جاتی ہے۔

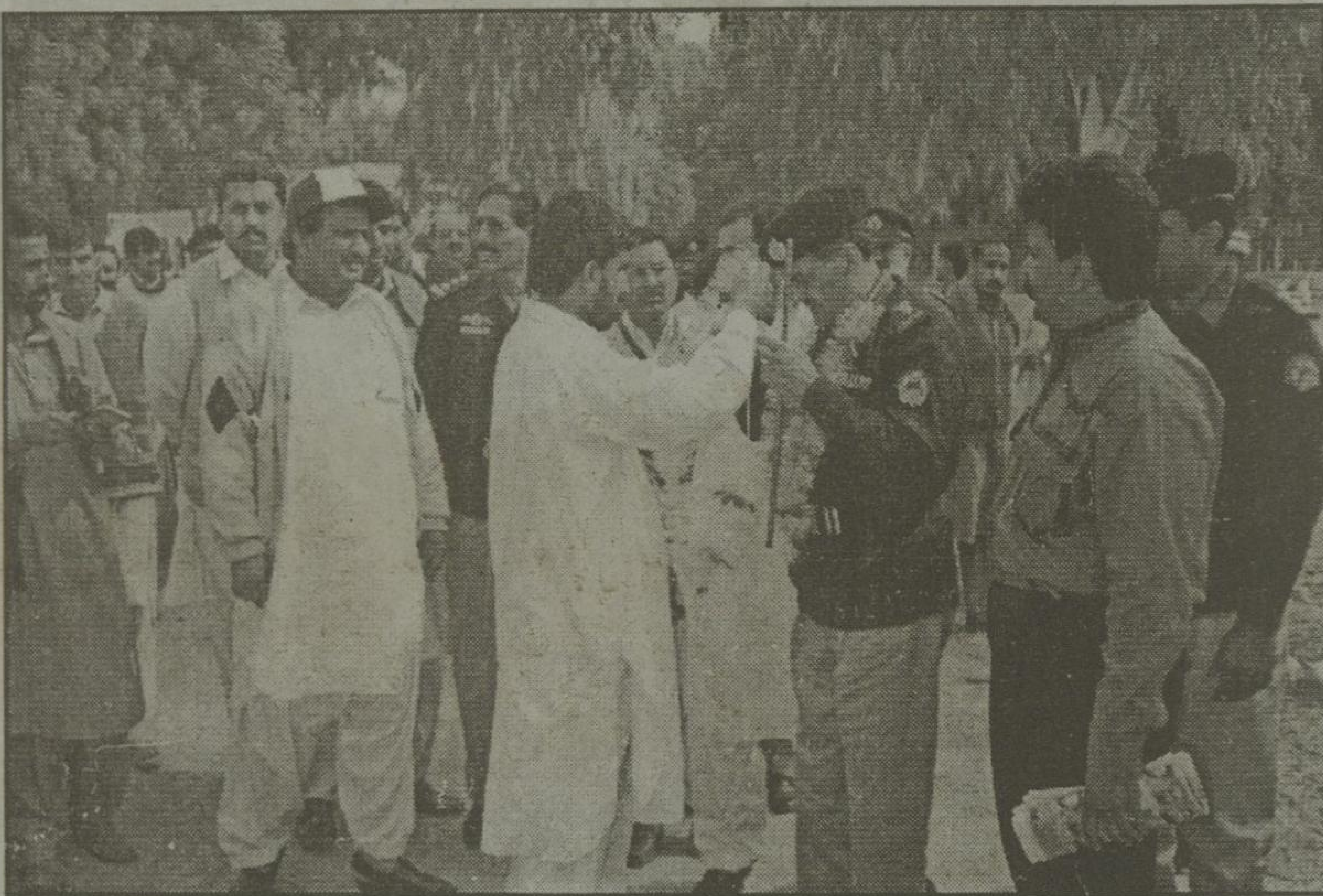
عام طور پر ایجنسیوں کے مثلاً سپیشل برانچ اور آئی بی کے لوگ جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں اُن کو بھی لاٹھی چارج کے دوران مار پڑ جاتی ہے۔اس میں کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد قومی اتحاد کے لیڈروں نے فیصلہ کیا کہ شرکائے جلوس میں سے جلوس کے اختتام پر چار اشخاص روزانہ گھنٹہ گھر میں اپنی گرفتاری پیش کریں گے۔

ایک روز شرکائے جلوس جھنگ بازار میں جامع مسجد میں اکٹھے ہوئے۔اُن میں سے چار اشخاص نے گھنٹہ گھر اپنی گرفتاری پیش کرنی تھی۔انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ مسجد کے گیٹ پر گرفتاری پیش کریں۔گھنٹہ گھر جانے کی اجازت نہیں ہے لیکن شرکائے جلوس بضد تھے کہ اُن میں سے چار اشخاص گھنٹہ گھر پہنچ کر گرفتاری دیں گے۔

مسجد کے گیٹ کے باہر پولیس فورس لگادی گئی۔اُن کا انچارج ایک ڈی ایس پی تھا۔ان کو ہدایت تھی کہ گرفتاری دینے والے اشخاص کو یہاں ہی روکنا ہے۔آگے گھنٹہ گھر کی طرف نہیں جانے دینا۔اس سے آگے چوک میں میری اور عزیز احمد خان مجسٹریٹ کی ڈیوٹی لگادی گئی۔ہمیں یہ ہدایت تھی کہ اگر گرفتاری دینے والے اشخاص مسجد کے گیٹ پر پولیس کا محاصرہ توڑ کر آگے آجائیں تو ہم نے اُن کو آگے سے روکنا ہے گھنٹہ گھر کی جانب ہرگز نہیں جانے دینا۔ہم نے چوک میں اپنی فورس لگادی۔فرنٹ لائن پر ملازمین کو Chain کی شکل میں کھڑا کردیا گیا۔ہم مکمل طور پر تیار تھے کہ اگر گرفتاری دینے والے اشخاص یہاں تک پہنچ گئے تو اُن کو کسی قیمت پر آگے گھنٹہ گھر کی طرف نہیں جانے دینا بلکہ اِدھر ہی گرفتار کرنا ہے۔ٹھیک گیارہ بجے دن اُن لوگوں نے مسجد سے نکلنا تھا۔ مقررہ وقت پر ہم سب الرٹ ہوگئے۔مسجد کے اندر سے نعرہ بازی شروع ہوگئی اور اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔اچانک ہم کیا دیکھتے ہیں کہ چار باریش جوان گلے میں گلاب کے پھولوں کے ہار پہنے اور ہاتھ میں تسبیحاں پکڑے مسجد کے گیٹ پر تعینات پولیس فورس کا محاصرہ توڑ کر ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ہم مزید ہوشیار ہوگئے۔آناً فاناً وہ ہمارے پاس پہنچ گئے۔میں فرنٹ لائن پر ملازمین کی مضبوط Chain بنا کر کھڑا تھا۔وہ چاروں جوان اللہ ہو، اللہ ہو کا وِرد کرتے ہوئے ہمارے سامنے آگئے اور اپنی چھاتیاں ہماری چھاتیوں پر مار کر ہمیں پیچھے دھکیلنا شروع کردیا اور ساتھ ہی زور زور سے اللہ ہو کا وِرد کر رہے تھے۔وہ نہ تو ہم سے ہاتھا پائی ہوئے اور نہ ہی انہوں نے کوئی اور حرکت کی۔صرف اپنی چھاتیاں ہماری چھاتیوں سے ٹکرا کر ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل کر

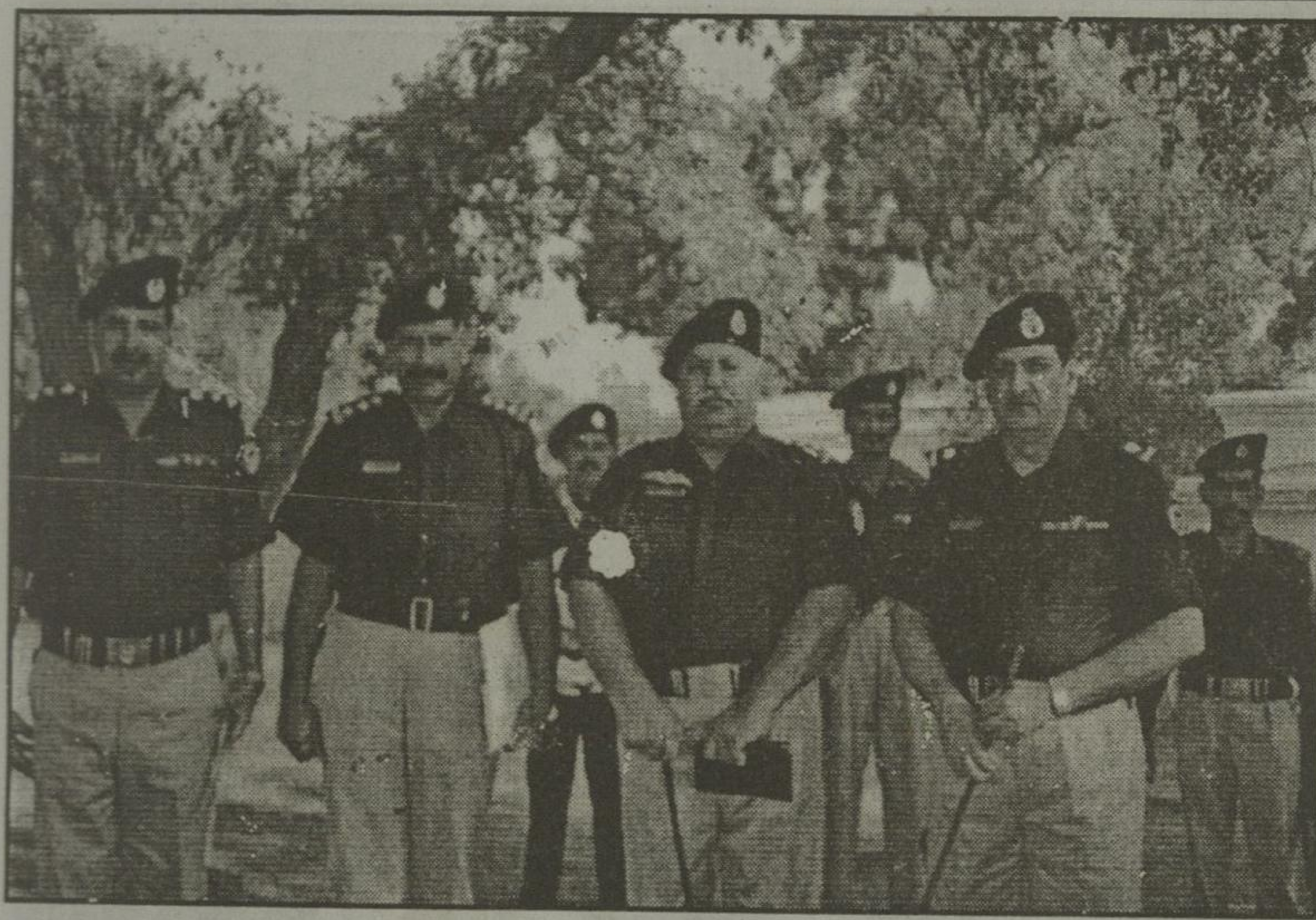
راستہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے کہ گھنٹہ گھر تک پہنچ جائیں کیونکہ اُن کا یہ فیصلہ تھا کہ گرفتاری گھنٹہ گھر میں ہی پہنچ کر دینی ہے۔ ایک معجزہ جو دیکھنے میں آیا کہ اللہ ہو کے وِرد سے وہ روحانی طور پر ہم پر آہستہ آہستہ غالب آتے گئے اور ہماری Chain ڈھیلی ہوتی گئی۔ آخرکار ہماری Chain ٹوٹ گئی اور وہ چاروں جوان دوڑتے ہوئے گھنٹہ گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں انہوں نے گرفتاری پیش کی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اُس روز کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ انتظامیہ اور شرکائے جلوس دونوں اپنی اپنی ضد پر آخر وقت تک ڈٹے رہے تھے۔ اس سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انتظامیہ کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ جس طرح وہ پہلے پرامن طور پر روزانہ گھنٹہ گھر گرفتاری پیش کر رہے تھے اس روز بھی اُنہیں ایسا کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے تھی۔ جو بھی مسئلہ مذاکرات کے ذریعہ خوش اسلوبی اور پرامن طریقہ سے حل ہو رہا ہو اس میں ضد کرنا مناسب نہیں ہوتا کیونکہ اس سے منفی اثرات پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔



ڈی جی خان کے شہری احمد خان چدھڑ کو ہار پہنا رہے ہیں



احمد خان چدھڑ ایک تقریب کے موقع پر



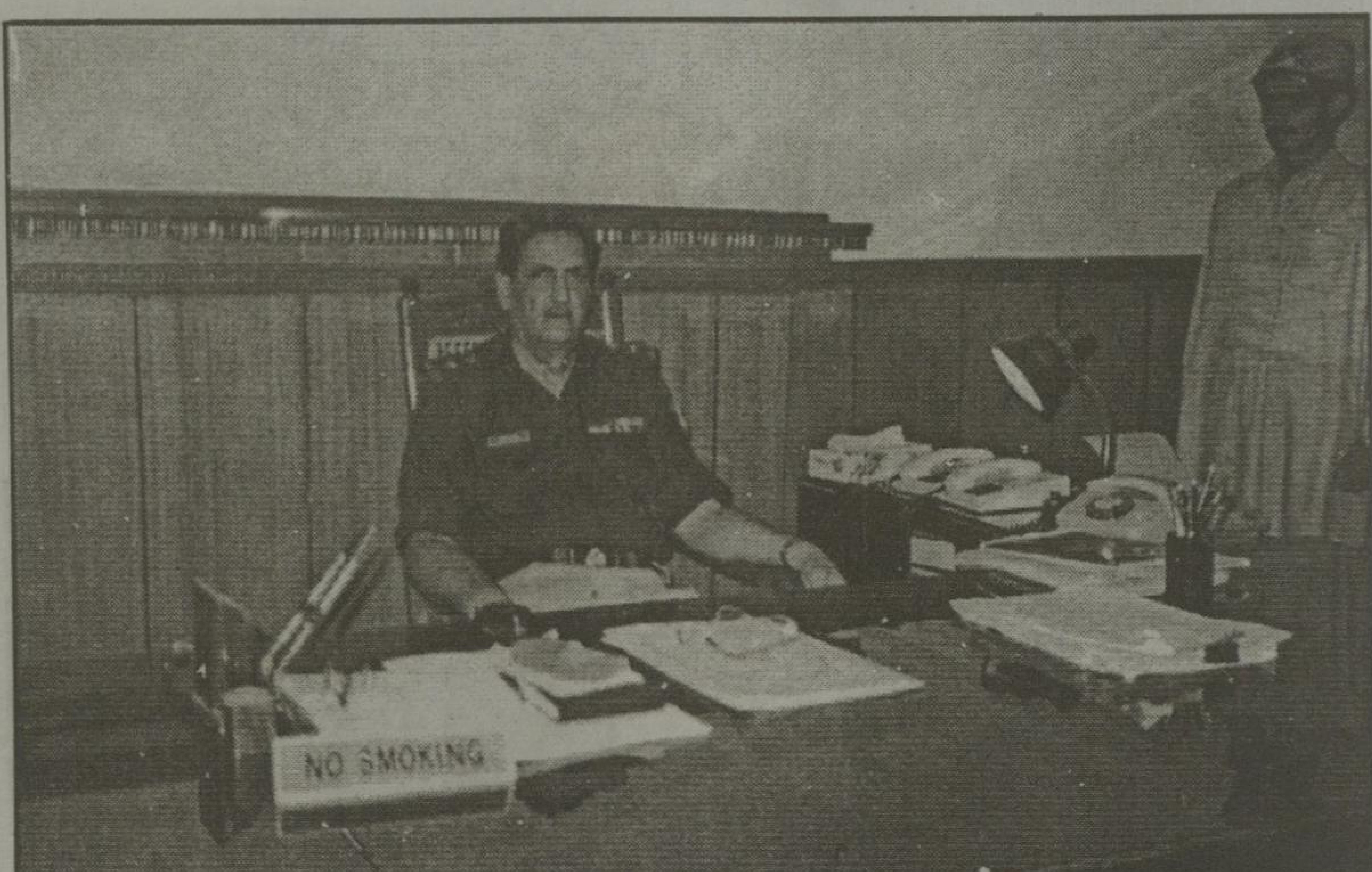
احمد خان چدھڑ اور دوسرے افسران رحیم یار خان میں



جناب چوہدری تنویر احمد ایس ایس پی لاہور احمد خان چدھڑ کے دفتر میں چوہدری حامد مختار گوندل اور عبدالرؤف ڈوگر بیٹھے ہیں



احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان پولیس لائن ڈیرہ غازی خان کی مسجد میں محفل میلاد میں۔ دائیں طرف جناب پرویز رحیم راجپوت صاحب ڈی آئی جی اور بائیں جناب بشیر احمد خان ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان بیٹھے ہیں



احمد خان چدھڑ SSP ڈی جی خان اپنے آفس میں



احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان چوہدری محمد شفیع ڈی آئی جی کے ہمراہ



ڈویژنل پبلک سکول ڈی جی خان کی ایک تقریب میں (1) احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان (2) محمود بٹ صاحب ڈپٹی کمشنر ڈی جی خان (3) پرنسپل ڈویژنل پبلک سکول ڈی جی خان



جناب احمد خان چدھڑ دیگر پولیس افسران کے ساتھ



جناب رانا مقبول احمد ایس ایس پی لاہور جناب احمد خان چدھڑ کو تعریفی سند دیتے ہوئے



جناب احمد خان چدھڑ ایس پی سی آئی اے جناب جاوید نور ایس ایس پی کے ہمراہ



چوہدری تنویر احمد ایس ایس پی لاہور سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں داخل ہو رہے ہیں
ان کے ہمراہ احمد خان چدھڑ اور مسعود عزیز ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ڈی ایس پی سی آئی اے کے تبادلہ
کے موقع پر جناب گل اصغر ایس پی سی آئی پھولوں کے ہار پہنا رہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ اپنے دفتر میں



جناب چوہدری تنویر احمد ایس ایس پی لاہور جناب احمد خان چدھڑ کے دفتر میں
چوہدری حامد مختار گوندل اور عبدلرؤف ڈوگر کے ساتھ بیٹھے ہیں۔



جناب احمد خان چدھڑ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس



جناب احمد خان چدھڑ دیگر پولیس افسران کے ساتھ



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان برآمد شدہ ناجائز اسلحے کا معائنہ کر رہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ڈیرہ غازی خان کی ایک تقریب میں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان ریٹائرمنٹ کے موقع پر
سید شوکت علی شاہ کمشنر بہاولپور بائیں طرف اور علوی صاحب کمشنر ڈیرہ غازی خان دائیں طرف



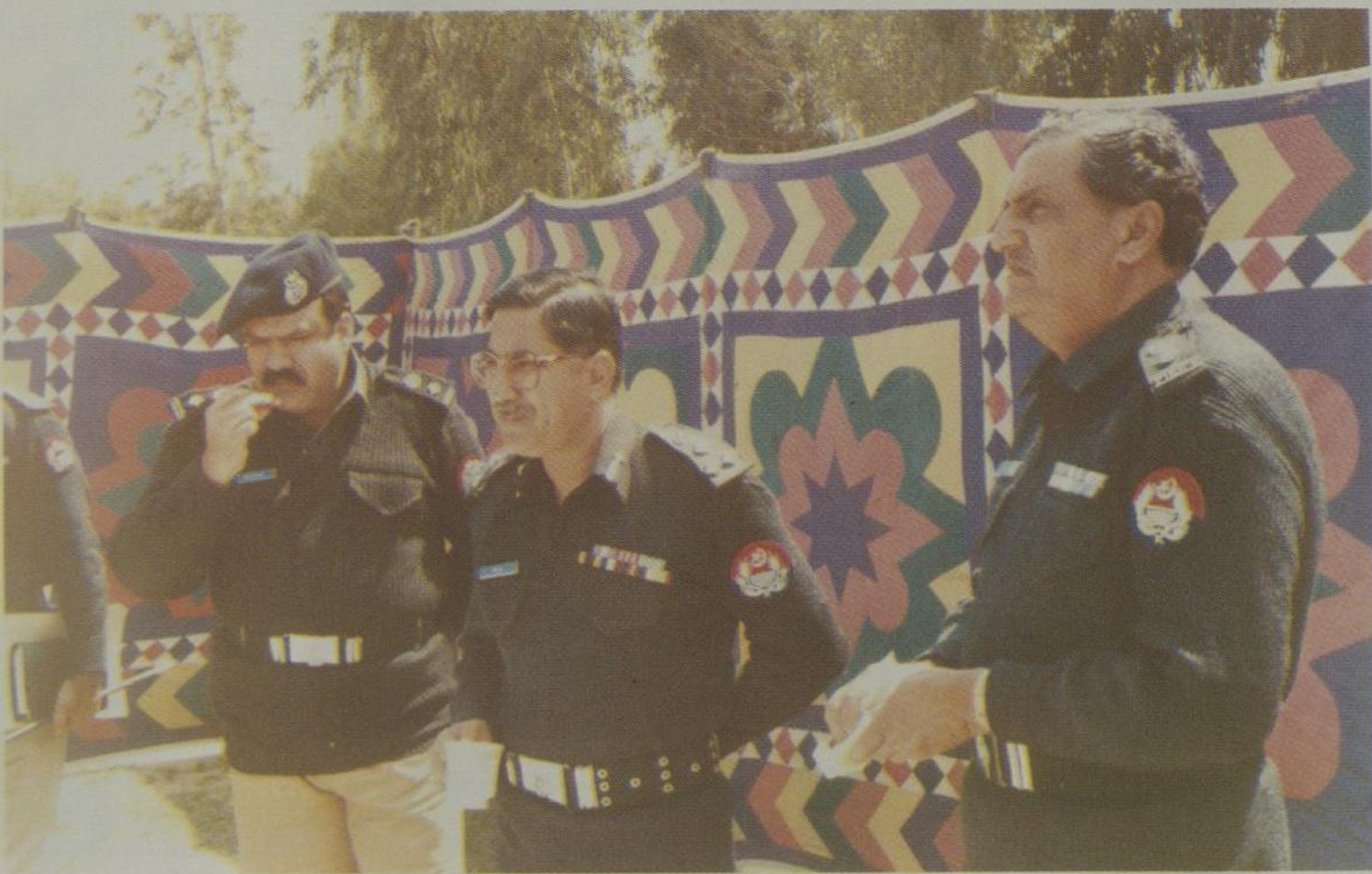
جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان اپنے دفتر میں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی.جی خان پریڈ کا معائنہ کررہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی جناب میاں محمد نواز شریف سابق وزیر اعظم پاکستان سے مصافحہ کررہے ہیں
درمیان میں ملک محمد اقبال ڈی آئی جی نظر آرہے ہیں



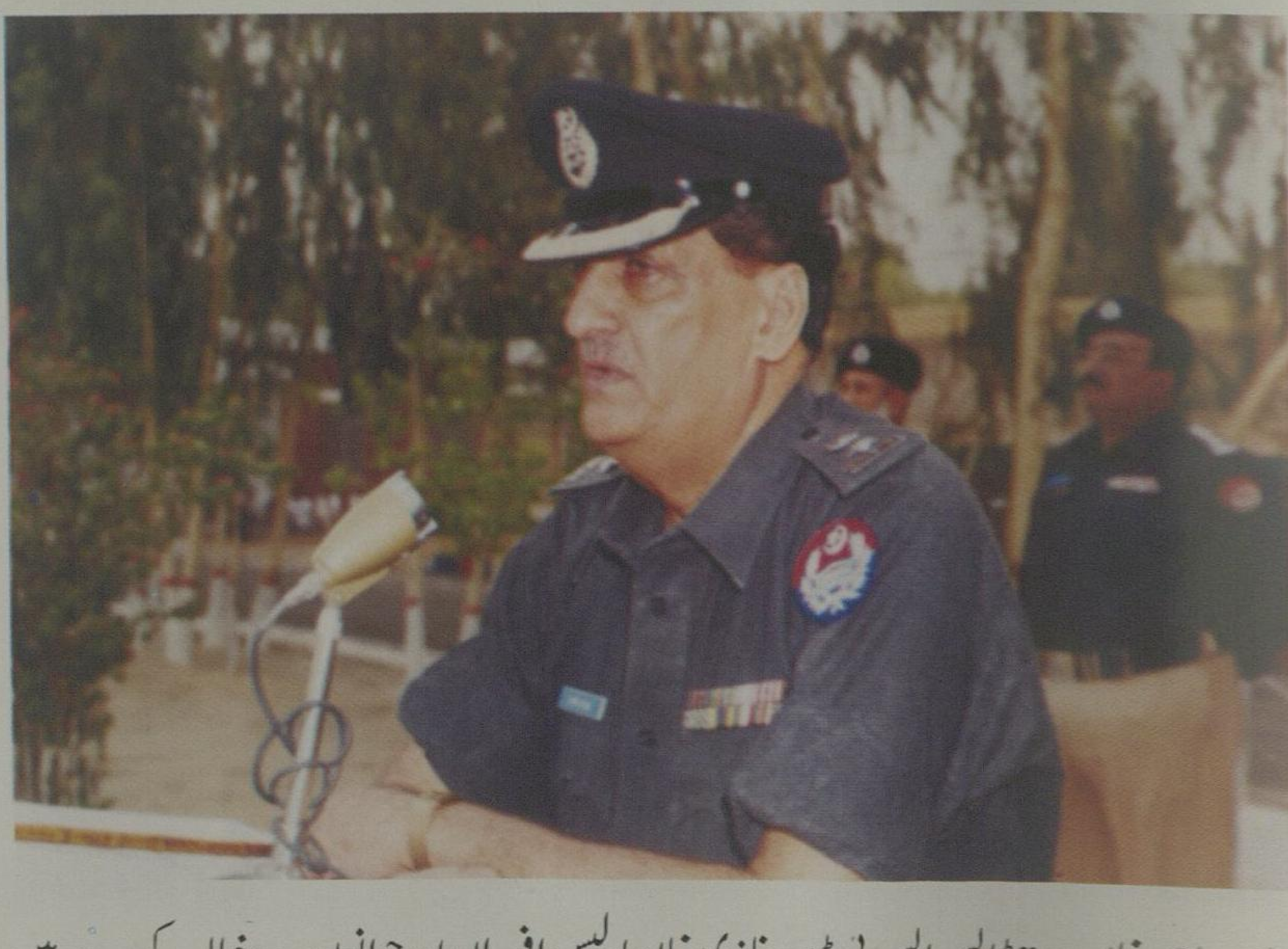
جناب احمد خان چدھڑ ایک تقریب میں ملک محمد اقبال ڈی آئی جی ڈیرہ غازی خان کے ساتھ



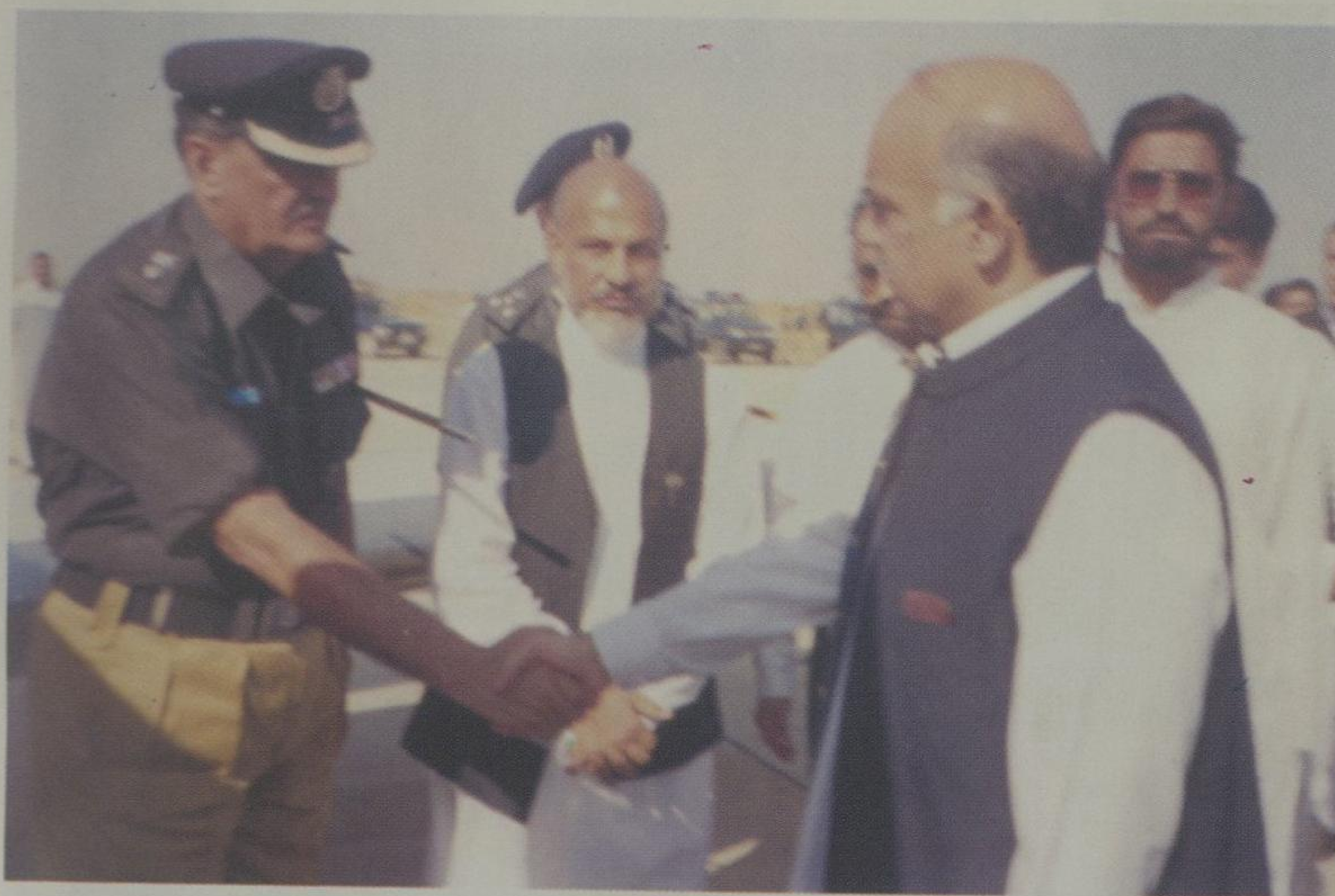
جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان ایک تقریب میں چوہدری محمد شفیع
ڈی آئی جی ڈیرہ غازی خان دائیں طرف اور راؤ امین ہاشم ایس ایس پی بائیں طرف



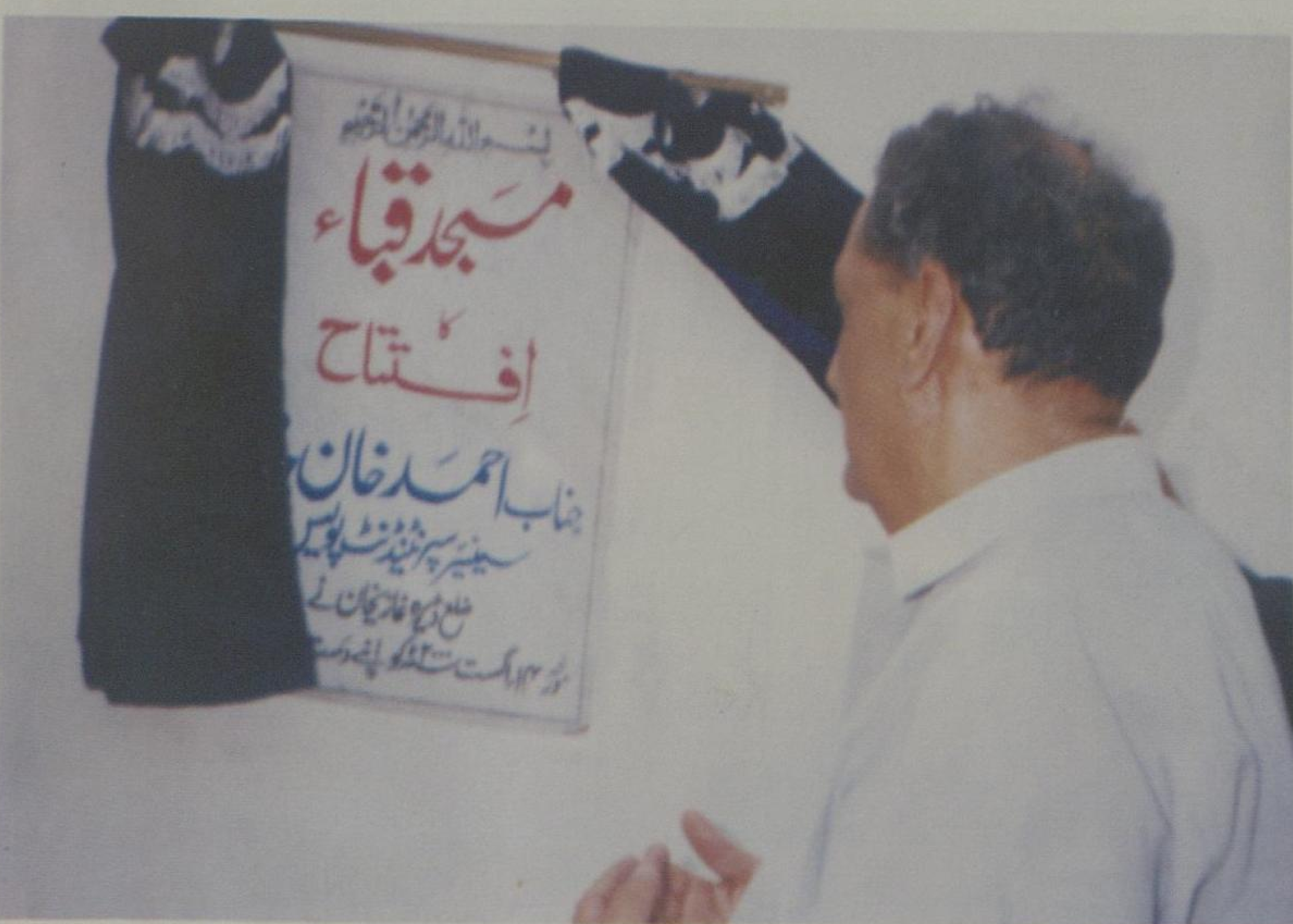
جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان جناب محمود بٹ ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان کے ساتھ بیٹھے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈیرہ غازی خان پولیس افسران اور جوانوں سے خطاب کرر ہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان، وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف سے
ہاتھ ملا رہے ہیں درمیان میں محمود بٹ ڈپٹی کمشنر ڈی جی خان کھڑے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ سخی سرور پولیس چیک پوسٹ پر مسجد تعمیر کرنے کا افتتاح کر رہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان کو مورخہ 13 اکتوبر 2000ء کو ریٹائرمنٹ کے موقع پر جناب پرویز رحیم راجپوت ڈی آئی جی شیلڈ دے رہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی جی خان کو سردار جمال خان لغاری درخواستیں پیش کر رہے ہیں ساتھ سردار جعفر خان لغاری بیٹھے ہیں۔



جناب احمد خان چدھڑ سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس



جناب احمد خان چدھڑ ایس ایس پی ڈی۔جی خان ریٹائرڈ کرنل سعید احمد ڈی آئی جی ڈی۔جی خان
کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں



جناب احمد خان چدھڑ ریٹائرمنٹ کے موقع پر



جناب احمد خان چدھڑ ریٹائرمنٹ کے بعد

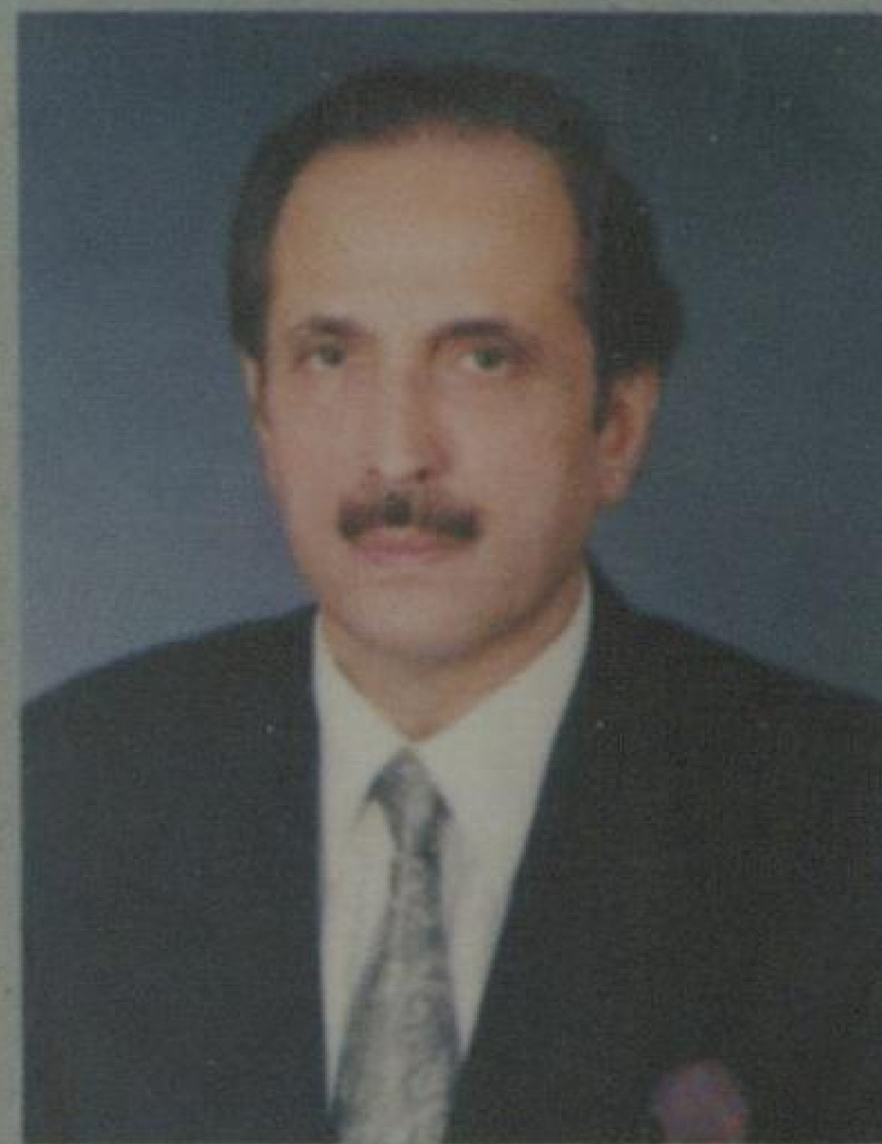
راجہ صاحب

عام فہم انداز میں بیان کر کے قاری کی دلچسپی کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔ چونکہ ہر کہانی سچائی پر مبنی واقعات پر مشتمل ہے اسی لئے مصنف نے اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر اس کی تفصیلات کو اچھی طرح کھنگالا ہے۔ یہ کتاب عام قاری کے لئے بالعموم اور پولیس افسران کے لئے بالخصوص رہنمائی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا باعث ہوگی۔ احمد خان چالیس سالہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں انہیں اپنے والد کی قربانی بھی دینا پڑی۔ لیکن ان کے پختہ عزم اور فرض شناسی میں کوئی لغزش آئی نہ ہی ان کے قدم ڈگمگائے۔ 84-1983 میں جب میں بطور ایس ایس پی گوجرانوالہ تعینات تھا، انہوں نے بطور سب ڈویژنل پولیس افسر کامونکی بے شمار اندھے، دقت پذیر اور الجھے ہوئے مقدمات کے ملزمان کا سراغ لگایا اور ہر خاص و عام سے اپنی پیشہ ورانہ مہارت، نیک نیتی اور محنت کی داد حاصل کی۔

''جرم نشان چھوڑتا ہے'' دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، اس میں ایک باہمت جوان کی کہانی بھی ہے جو کانسٹیبل سے ایس ایس پی کے عہدہ پر پہنچا اور بے شمار مقدمات اور ان کی تکنیکی باریک بینیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ تفتیشی افسران، پولیس کے تربیتی ادارے، صحافی حضرات، طالب علم اور عام قارئین بھی اس کتاب سے بھرپور استفادہ کرسکیں گے۔

ڈاکٹر سید اظہر حسن ندیم

ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ٹریننگ، پنجاب، لاہور



کچھ اس کتاب کے بارے میں

ایک مشہور مقولہ ہے کہ ٹریننگ مفید ہے لیکن تجربے کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب تجربہ بول رہا ہو تو تربیت کو لازم ہے کہ زانوئے تلمذ تہہ کرے اور ہمہ تن گوش ہو جائے۔ چوہدری احمد خان چدھڑ صاحب کی کتاب "جرم نشان چھوڑتا ہے" تجربے اور تربیت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کا شمار ان معدودے چند پولیس افسران میں ہوتا ہے جو محکمے کی شناخت بن گئے ہیں۔ جب میرا تبادلہ بطور ڈپٹی کمشنر ڈی جی خان ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ وہاں کا ایس ایس پی بڑا زیرک، معاملہ فہم، محنتی اور ایماندار آفیسر ہے۔ ہر چند کہ چوہدری صاحب کا نام سارے پنجاب میں مشہور تھا لیکن ذاتی طور پر میری ان سے شناسائی نہ تھی۔ جب میں ان سے ملا اور ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو ان کی شخصیت کے پرت ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ راوی نے ان کی کردار نگاری میں بخل سے کام لیا ہے۔

وطن عزیز میں تفتیش ایک مشکل عمل ہے۔ پولیس کے پاس نہ تو جدید تفتیشی آلات ہیں اور نہ وہ سائنٹفک ٹیکنیکس سے آگاہ ہے۔ روایتی طریقے بڑے صبر آزما، مشکل اور تکلیف دہ ہیں۔ تفتیش کا آغاز ہی گھپ اندھیروں سے ہوتا ہے۔ معاشرے کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ لوگ تعاون نہیں کرتے۔ چوہدری صاحب کا تفتیش کرنے کا اپنا طریقہ ہے جو بڑا موثر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ باڈی لینگویج کے ماہر ہیں۔ ملزم کی بات چیت، حرکات وسکنات، چہرے کے اتار چڑھاؤ اور تنفس کے زیر و بم سے اس کا ذہن پڑھنے اور واردات قلب جاننے اور اس طرح واقعات کی کڑیاں ملانے اور ان کی تہہ تک پہنچنے میں یدطولےٰ رکھتے ہیں۔ انہوں نے پولیس سروس کا آغاز بطور ایک کانسٹیبل کے کیا لیکن جلد ہی حکام بالا نے ان کے اندر چھپا ہوا چوہدری احمد خان دریافت کر لیا اور یہ ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ایس ایس پی کے عہدے تک جا پہنچے۔

کتاب کا مرکزی حصہ اُن جرائم کی دلچسپ، چونکا دینے والی روئیداد ہے جن کی تفتیش چوہدری صاحب نے کی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ بقول ان کے جرم اکثر زر، زن اور زمین کی تثلیث سے جنم لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرم و سزا کے موضوع پر آج تک اُردو زبان میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب ان میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ جہاں ایک عام قاری کے لئے اس میں دلچسپی اور ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والے کئی پہلو ہیں وہاں محکمہ کے اہلکاروں اور افسرا[ن کے] لئے بھی یہ ایک گائیڈ اور ریفرنس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک عمومی تاثر جو ذہن میں ابھرتا ہے و[ہ یہ ہے] کہ وردی کے اندر بھی ایک آدمی ہے جس کے سینے میں ایک عام انسان کا سا دل ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ قاری بھی مصنف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایک پل، ایک گھڑی کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہونا چ[اہتا]

شوکت علی شاہ

سیکرٹری انفارمیشن کلچر وامور نوجوانان لاہور